اثبات

کتابی سلسلہ

31

وہ جو تاریک راہوں میں مارے گئے

اپنے جیسے لوگوں سے انسیت کے بارے میں

مدیر

اشعر نجمی

ESBAAT
PUBLICATIONS
more than just books

Esbaat-31
by Ashar Najmi
Esbaat Publications, Thane, India
1st Edition : April 2021
Printer: Fatima Offset, Andheri, Mumbai

کتاب: اثبات:۳۱

مدیر: اشعر نجمی

اشاعت اول: اپریل ۲۰۲۱

سرورق: رشید میڈیا (مئو ناتھ بھنجن)

کتابت: منور کاتب (مئو)

سوشل میڈیا ایگزیکٹیو: رضوان الدین فاروقی

ESBAAT
PUBLICATIONS
more than just books

B-202, Universe Darshan, Pooja Nagar Road, Naya Nagar,
Mira Road (East), Dist. Thane - 401107, Maharashtra, India
Contact: +91 8169002417 Email: asharnajmi2020@gmail.com
www.asharnajmi.com

فہرست

فکشن

نظمیں

الگ ہونا غلط نہیں ہے (اداریہ)

اشعر نجمی

فرائڈ کا کہنا ہے کہ ''میں نے کسی بھی ایک مرد یا عورت کا تجزیہ نہیں کیا جس میں ہم جنسی میلان موجود نہ ہو۔'' کرافٹ، ڈاکٹر مال اور پروفیسر مانٹا گینرا کے خیال میں ہم جنسی میلان خلقی اور عضویاتی ہوتا ہے۔

سٹائی ناخ نے تحقیق سے ثابت کیا کہ خصیتین اور بیضہ انثی ہارمون پیدا کرتے ہیں جو مردانگی اور نسوانیت کے ذمے دار ہیں اور جسمانی و ذہنی توانائی پیدا کرتے ہیں۔ پچوٹری غدود کے ہارمون پر خصیتین اور بیضہ کی مغالبت پر منحصر ہے۔ ہر عورت کے جسم میں مردانہ ہارمون اور ہر مرد کے جسم میں زنانہ ہارمون موجود ہوتے ہیں۔ خواہ وہ کتنی ہی قلیل تعداد میں ہوں۔

ولہلم لٹیکل اور کلفورڈ ایلن کی تحقیق یہ ہے کہ ہم جنسیت خلقی نہیں ہوتی بلکہ نفسیاتی نظام میں خلل پیدا ہوجانے سے نمو پذیر ہوتی ہے۔

ہیویلاک ایلس نے کہا کہ ہم جنسیت کسی بھی نفسیاتی مرض کی علامت نہیں ہے۔

ہم جنس پرستی کوئی نفسیاتی مرض نہیں ہے بلکہ یہ ایک قدرتی تبدل ہے۔ ہاں، البتہ کچھ لوگ نفسیاتی مسائل کی وجہ سے ہم جنس پرستی کی طرف مائل ہوجاتے ہیں۔ میں یہاں بتاتا چلوں کہ ہم جنس پرستی کی تین وجوہات ہیں۔ پہلی وجہ عضویاتی ہے دوسری نفسیاتی اور تیسری سماجی۔ جو لوگ عضویاتی طور پر ہم جنس پرست ہوتے ہیں، ان کے جسم کی ساخت دوسروں سے قدرے

مختلف ہوتی ہے یعنی ایک لیسبئن کا 'بظر' واضح طور پر بڑھا ہوا ہوتا ہے اور اس میں مردانہ اوصاف پائے جاتے ہیں جب کہ 'گے' میں نسوانیت پائی جاتی ہے، حالاں کہ یہ قطعی ضروری نہیں اور نہ ہی یہ ضروری ہے کہ ایک 'گے' مفعول (Bottom) ہی ہو، وہ فاعل (Top) بھی ہوسکتا ہے اور دونوں یعنی Versatile بھی ہوسکتا ہے۔ بائی سیکشول الگ چیز ہے، وہ عورت اور مرد دونوں کی طرف ملتفت ہوتے ہیں۔

کچھ لوگ نفسیاتی وجوہات کی بنا پر بھی ہم جنسیت کی طرف مائل ہوتے ہیں یعنی اگر کسی لڑکی کے ساتھ بچپن میں بدفعلی ہوئی ہو یا اس کا اپنا باپ سخت رویہ رکھتا ہو اور اس کی ماں کو مارتا پیٹتا ہو تو وہ لڑکی لاشعوری طور پر تمام مردوں سے نفرت کرنے لگتی ہے اور اس وجہ سے وہ ہم جنسیت کو اپنا سکتی ہے، لیکن یہ سبب بھی لازمی نہیں ہے۔

اب بات کرتے ہیں کہ لوگ سماجی وجوہات کی بنا پر کیسے ہم جنس پرستی کو اپناتے ہیں؟ ہوتا کچھ یوں ہے کہ جیسے ہی بچے تھوڑے بڑے ہوتے ہیں، والدین بچوں کو منع کرتے ہیں کہ بیٹا اب آپ بڑی ہوگئی ہیں، اب آپ کو لڑکوں کے ساتھ نہیں کھیلنا۔ اسی طرح اور بہت سے کاموں سے منع کیا جاتا ہے۔ بچے یہ بات نوٹس کرتے ہیں کہ ہمیں ہماری جنس کے بچوں کے ساتھ سونے کھیلنے سے منع نہیں کیا جارہا، اس طرح ان کے ذہن میں یہ بات داخل ہوجاتی ہے کہ اپنی جنس کے ساتھ ہم کچھ بھی کرسکتے ہیں۔

جیسے ہی بچے بالغ ہوتے ہیں، ان میں عجیب طرح کی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ ان کے اندر ایک جنسی کشمکش شروع ہوجاتی ہے اور پھر وہ اپنی ہی جنس کے ساتھ مل کر اپنی جنسی خواہش کی تسکین کرتے ہیں چونکہ انھیں یہ نسبتاً محفوظ لگتا ہے۔ اس کے علاوہ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ فرد کو جنسی تسکین کے لیے مخالف جنس میسر نہیں آتی، تو وہ ہم جنسیت کو اپنا لیتا ہے۔

سمون دی بوا لکھتی ہیں کہ ''ہم جنسی عورتوں کا اختلاط 'بظر' کے مساحقے تک محدود ہوتا ہے۔ ایک نوجوان لڑکی مرد کے درشتی اور تند مزاجی سے خائف ہوکر اپنے آپ کو اپنی سے بڑی عمر کی عورت کے سپرد کردیتی ہے۔ مردانہ قسم کی عورت میں اسے اپنے والدین کی جھلک دکھائی دیتی ہے اس طرح نوجوان لڑکی حقیقی تجربے سے روگردانی کرکے عالم خیال بسا لیتی ہے۔ اس کے یہاں تخیل اور حقیقت آپس میں گڈمڈ ہوجاتے ہیں۔''

جونز اور ہیسنارڈ کا کہنا ہے کہ لیسبین دو طرح کی ہوتی ہیں پہلی 'مسکولائن لیسبئن' جو مردوں کی طرح کردار ادا کرتی ہیں، اور دوسری 'فیمینین' جو مردوں سے خوف زدہ ہوتی ہیں۔

'ہم جنسیت' کے تعلق سے ہمارے معاشرے میں کچھ غلط فہمیاں عام ہیں، ان پر بھی مختصراً نظر ڈال لینی چاہیے۔

(۱) اس بات کا اب تک کوئی ثبوت نہیں ہے کہ آپ 'ہم جنسیت' یا 'عام جنسیت' کے درمیان انتخاب خود کرتے ہیں۔ 'ہم جنسیت' کا تعلق صرف اس سے ہے کہ آپ جنسی طور پر کس طرف راغب ہیں اور اس کا تعین پیدائش کے وقت سے بھی ہو سکتا ہے۔

(۲) کچھ لوگ 'ہم جنسیت' کے علاج کی بات کرتے ہیں لیکن بنیادی بات تو یہ ہے کہ 'ہم جنسیت' کوئی مرض ہی نہیں ہے تو پھر اس کے 'علاج' کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ جنسی رجحان کے پس پشت کے اسباب کے تعلق سے ایک بھی ریسرچ سے یہ نتیجہ نہیں نکلا ہے کہ یہ کوئی مرض ہے۔ البتہ اس کے اسباب میں موروثی، حیاتیاتی اور ماحولیات کے امکان پر ضرور غور کیا جا تا رہا ہے۔

(۳) کچھ لوگوں نے دعویٰ کیا تھا کہ ہم جنسی جوڑے اچھے والدین نہیں ہو سکتے جب کہ کچھ برسوں پہلی کی گئی ریسرچ کی رپورٹ بتاتی ہے کہ یہ محض ایک پروپیگنڈا ہے، ایک ہم جنسی جوڑا بھی عام شادی شدہ جوڑوں کی طرح اچھا والدین بن سکتا ہے۔

(۴) یہ ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ 'بچہ بازی' (Pedophile) کا 'ہم جنسیت' سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ تحقیقی رپورٹ بتاتی ہے کہ بچوں کے ساتھ جنسی زیادتی کرنے ۹۰ فیصد اس کے گھر کے ممبر یا پھر اس کے قریبی لوگ ہوتے ہیں، خواہ وہ ہم جنسی ہوں یا عام جنسی۔

(۵) کچھ لوگوں کو غلط فہمی ہے کہ ہم جنس پرست لوگ وفادار نہیں ہوتے بلکہ سیماب صفت ہوتے ہیں۔ اس کا بھی کوئی پختہ ثبوت نہیں ہے۔ ایک ہم جنس پرست کو کسی ایک پارٹنر کے ساتھ پوری عمر گزارتے دیکھا گیا ہے اور کئی پارٹنرز کے ساتھ وفاداری بھی شیئر کرنے کی بھی مثال موجود ہے لیکن اصل سوال یہ ہے کہ وفاداری کا ہم جنسیت سے کیا تعلق؟ اس چیز کی سب سے زیادہ کمی تو عام جنسیت والوں میں پائی جاتی ہے۔

(۶) ایک یہ غلط فہمی ہمارے یہاں بہت عام ہے کہ 'ایڈز' جیسی موذی بیماری 'ہم جنسیت' کے سبب ہے۔ 'اس سادگی پر کون نہ مر جائے اے خدا۔' حقیقت یہ ہے کہ ایڈز کا سبب ایک وائرس ہے جو ایک سے دوسرے شخص میں سرایت کرتا ہے، مثلاً ایچ آئی وی سے متاثرہ شخص کا

خون اگر کسی گھریلو عورت یا چار سال کے بچے کو بھی بغیر اسکریننگ کے چڑھا دیا جائے تو وہ بھی ایڈز میں مبتلا ہو سکتے ہیں اور اس دنیا میں لاکھوں مرد، عورتیں اور بچے ہیں جو ہم جنس پرستی میں مبتلا ہوئے بغیر ایڈز میں مبتلا ہو گئے۔ ایڈز کسی کو بھی ہو سکتا ہے، اس کے لیے جنس کی قید نہیں ہے، اس کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ ہم جنس پرستوں کے مقابلے میں عام لوگ زیادہ ایڈز کے شکار ہیں۔

(۷) ایک بہت ہی عام سی اصطلاح ہے 'غیر فطری'، جس کا استعمال زیادہ تر اہل مذاہب کرتے ہیں یا پھر ان کے مقلدین۔ اگر ہم جنسیت غیر فطری ہوتی تو پھر انسانوں کے ساتھ ساتھ جانوروں میں یہ نہ ہوتی جب کہ حالیہ تحقیقات کے مطابق زراف اور پینگوئن وغیرہ جیسے دوسرے جانوروں میں بھی ہم جنسیت پائی جاتی ہے۔ گویا انسان اور جانوروں دونوں میں سیکس کا وجود صرف افزائش نسل کے لیے نہیں ہے۔

مختصر یہ کہ لیسبئین اور گے ابنارمل نہیں ہیں بلکہ اقلیت ہیں۔ یہ لوگ اکثریت سے صرف جنسیت کے لحاظ سے ہی مختلف ہیں باقی ہنر فن اور ہر کام میں اکثریت کی طرح ہی ہیں۔ الگ ہونے کا مطلب غلط نہیں ہوتا یا اقلیت میں ہونے کے سبب اسے حاشیے میں ڈال دینا ٹھیک اسی طرح کا رویہ ہے جس طرح جابر حکمران اپنی اقلیتوں کے ساتھ کرتے چلے آئے ہیں۔ اکثریت کی نفسیات میں یہ زعم رہتا ہے کہ وہ درست ہے، وہ برتر ہے، وہ عظیم ہے اور باقی سب غلط، ادنیٰ اور حقیر ہیں۔ ماضی میں بے شمار ایسے فلسفی شاعر اور مجسمہ ساز گزرے ہیں جو ہم جنس پرست تھے تو کیا وہ ابنارمل تھے؟ نہیں، وہ بس مختلف تھے جنسی اعتبار سے۔ افلاطون، ارسطو، سقراط، زینوفن اور لکنیس یہ سب ہم جنس پرست تھے۔ سیفو، میجلا اور فیلینس مشہور ہم جنس پرست عورتیں تھی۔ اور جو لوگ 'ہم جنسیت' کا وطن مغرب کو قرار دیتے ہیں، انھیں یہ شمارہ ایک بار ضرور پڑھ لینا چاہیے تا کہ انھیں علم ہو سکے کہ مشرق میں اس کی جڑیں کتنی گہری پیوست ہیں۔

ہمیں خود کو درست سمجھتے ہوئے ناصح بننے کی کوشش کم اور انھیں سمجھنے کی کوشش زیادہ کرنی چاہیے۔ اپنے بچوں کو اسپیس دیں، انھیں بولنے کا موقع دیں، انھیں سمجھنے کی کوشش کریں تا کہ وہ آنے والے مسائل سے بچ سکیں۔ ہم جنس پرستوں کو قبول کریں۔ میں نے بہت سے ہم جنس پرستوں کو خودکشی کرتے دیکھا ہے۔ انسانی جان ہر نظریے اور آپ کے نجی تحفظات سے زیادہ قیمتی ہے۔ لوگوں کو اتنا مجبور مت کریں کہ ان کے پاس سوائے خودکشی کے کوئی اور چارہ ہی نہ بچے۔

مضامین

ہم جنسیت کا تاریخی مطالعہ

خالد سہیل

ہوموسیکشویلٹی (Homosexuality) کی ترکیب یونانی لفظ 'Homo' سے مرکب ہے۔ جب دو انسان چاہے، وہ دو مرد ہوں یا دو عورتیں، آپس میں جنسی تعلقات قائم کرتے ہیں تو وہ 'ہوموسیکشول' تعلقات کہلاتے ہیں۔ روزمرہ کی بول چال میں ایسے لوگوں کے لیے 'گے' (Gay) کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ عورتوں کے لیے لیسبینزم (Lesbianism) کا لفظ بھی مقبول عام ہے۔ یہ لفظ یونانی شاعرہ سیپو (Sappo) کا عطا کردہ ہے جس نے سب سے پہلے جزیرہ لیسبوس (Lesbos) میں دو عورتوں کے باہمی جنسی تعلقات کے بارے میں لکھا تھا۔

وہ مرد اور عورتیں جنھیں آج ہم ہوموسیکشول، گے اور لیسبین کہہ کر پکارتے ہیں، ان کو شمالی امریکہ میں سترہویں، اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں درج ذیل ناموں سے پکارا جاتا تھا:

Sapphists, Tribades, Pederasts, Catamites, Sissies, Uraniads, Androgynes, Contrasexuals, Inverts, Perverts, Queers, Fairies, Faggots, Dykes, Lesbics, Pansies, Devients, Abnormals, Variants, Homophiles.

ہوموسیکشول کی ترکیب امریکی کتابوں میں سب سے پہلے نمودار ہوئی۔ 'نیویارک ٹائمز' میں لفظ ہوموسیکشول (Homosexual) سب سے پہلے ۱۹۲۶ء میں اور لفظ ہیٹروسیکشول (Hetrosexual) سب سے پہلے ۱۹۳۰ء میں استعمال ہوا تھا۔

جہاں تک الفاظ 'گے' اور 'لیسبین' کا تعلق ہے تو وہ آج بھی بعض حلقوں نے قبول نہیں کیا ہے۔ اگرچہ 'نیویارک ٹائمز' نے 'گے' (Gay) کا لفظ سب سے پہلے ۱۹۶۳ء میں استعمال کیا تھا لیکن 'ٹائمز' (Times) رسالے نے چند سال پہلے ہوموسیکشول کی بجائے 'گے' اور 'لیسبیئن' کے الفاظ کو استعمال کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

جب ہم شمالی امریکہ کی معاشرتی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ وہ انڈین قبائل جو یہاں ہزاروں برسوں سے بسے ہوئے تھے، ان میں دو مردوں اور دو عورتوں کے درمیان جنسی تعلقات کو اسی طرح قبول کیا جاتا تھا جیسے ایک مرد اور ایک عورت کے درمیان جنسی تعلقات کو۔ اس معاشرے میں ہم جنسی نہ تو گناہ سمجھی جاتی تھی نہ ہی کوئی جرم اور نہ ہی اسے غیر فطری سمجھا جاتا تھا۔ سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی میں یورپی فاتحین نے شمالی امریکہ آ کر جب اپنے لنگر ڈالے تو وہ اپنے ساتھ اپنی طرز معاشرت، اپنے نظریات وخیالات اور اعتقادات بھی لے کر آئے۔ جب انھوں نے اپنے گناہ وثواب کے پیمانوں پر قبائلی لوگوں کو پرکھنا شروع کیا تو وہ انسانی تعلقات جو معصوم اور فطری سمجھے جاتے تھے، غیر فطری اور غیر سماجی بن گئے۔

ہمیں اس تبدیلی کا احساس ہسپانوی اور فرانسیسی مورخین کی کتابوں کے مطالعے سے ہوتا ہے۔

کاربیزا ڈی واکا (Carbeza De Vaca) نے ۱۵۲۸-۳۶ء میں ان انڈین مردوں کے بارے میں لکھا ہے جنھوں نے ایک دوسرے سے شادی کر رکھی تھی۔

ٹارقیومیڈا (Torquemada) نے ۱۶۰۹ میں فلوریڈا میں ان مردوں کا ذکر کیا ہے جو عورتوں کا لباس پہنتے تھے اور دوسرے مردوں سے شادی کرتے تھے۔

انڈین قبائل کے یہ ہم جنس تعلقات صرف مردوں تک ہی محدود نہ تھے بلکہ عورتیں بھی اس میں برابر کی شریک تھیں۔ مورخین نے کئی عورتوں کا ذکر کیا ہے جو مردوں کا لباس پہنتی تھیں۔ پریجا (Pareja) نے ۱۶۱۳ء میں اپنی کتاب 'کنفشنل' (Confessional) میں عورتوں کے درمیان جنسی تعلقات کا ذکر کیا ہے۔

مارقویٹا (Marquetta) ۱۶۷۳-۷۷ء میں الینوئے (Illinois) میں ان مردوں کا ذکر کیا ہے جو وہ تمام کام کرتے تھے جو روایتی طور پر عورتیں کرتی ہیں۔

پینیسون (Pension) نے بھی کیناٹیکٹ (Connecticut) میں ۱۶۷۴ء میں

مردوں کی ایسی دوستیوں اور جنسی تعلقات کا ذکر کیا ہے جو تیس سال کی مدت پر پھیلی ہوئی تھیں۔

ہسپانوی اور فرانسیسی مورخین نے جہاں بھی ان واقعات کا ذکر کیا ہے، وہیں انھیں غیر فطری بھی قرار دیا ہے۔اسی لیے جب یورپی فاتحین نے شمالی امریکہ کی قبائلی زندگی پر اپنا مذہب اور قانون مسلط کیا تو ان لوگوں کو جو ہم جنسی تعلقات رکھتے تھے، یا تو گنہگار ثابت کیا یا مجرم۔اس طرح یہ یورپی نظریات اور اخلاقی معیار شمالی امریکہ کی قبائلی زندگی میں زہر بن کر پھیل گئے۔ یورپی حکام کا یہ خیال تھا کہ وہ ان جنگلیوں کو نیک اور مہذب بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

جب ہم ان یورپی رجحانات اور نظریات کا سنجیدگی سے مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ ان کے پیچھے مذہبی اعتقادات کا بڑا ہاتھ ہے۔عیسائیت نے یورپی اقوام کو یہ منوانے کی کوشش کی تھی کہ جنسی تعلقات کا مقصد افزائش نسل ہے، اس لیے انسانی جنسی تعلقات صرف شادی کی حدود میں جائز ہیں اور وہ بھی صرف بچے پیدا کرنے کے لیے۔اس لیے ہر وہ جنسی عمل جو شادی کی حدود سے باہر ہو اور جس کا مقصد خاندان کی وسعت یا بچے پیدا کرنا نہ ہو، وہ گناہ ہے۔

اس اصول کی بنیاد پر مشت زنی، مردوں کے مردوں سے جنسی تعلقات، مردوں کی عورتوں سے عقبی مباشرت (Anal Intercourse)، اور مردوں کی دہنی مباشرت (Oral Intercourse) اور عورتوں کے عورتوں سے جنسی تعلقات سب گناہ ٹھہرے۔عیسائیت نے اس بات پر ہی زور دیا تھا کہ جنسی تعلقات کا مقصد لذت حاصل کرنا ہرگز نہیں۔

جب بھی ہم عیسائی پادریوں کے بیانات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں دو تاریخی تحریروں کی بازگشت سنائی دیتی ہے:

> Go out and multiply.
>
> For this cause God gave them up unto vile affections: for even their women did change the natural use into that which is against nature; and like wise, also the men, leaving the natural use of the woman, burned in their lust one toward another, men with men working that which is unseemly and

receiving in themselves that recompense of their error which was meet.

(New Testament: St. Pauls Epistle to the Romans. 1:26-27 - King James Translation)

ہم جنسی تعلقات کو اس قدر بڑا گناہ قرار دیا گیا ہے کہ ۱۶۴۲ء میں پادری جان ریز (John Rayner) نے اس کی سزا موت تجویز کی۔

۱۶۴۶ء میں ولیم پلین (William Plaine) کو جب موت کی سزا دی گئی تو جان ونتھروپ (John Winthrop) نے فیصلہ سناتے ہوئے کہا کہ پلین نے شادی شدہ مرد ہونے کے باوجود ایسے گھناؤنے جرم کا ارتکاب کیا ہے جو افزائش نسل کے اصول کو پس پشت ڈالتا ہے۔

۱۶۷۴ء میں پادری ڈلیفورتھ نے اپنے مشہور وعظ (Cry of Sodom) میں امریکی عوام کو متنبہ کیا کہ اگر انھوں نے ہم جنسی رشتوں سے توبہ نہ کی تو پوری قوم پر عذاب نازل ہوگا۔

سولہویں اور سترہویں صدی میں جوں جوں مذہب اور سیاست کے دائرے علیحدہ ہونے لگے تو وہ جنسی تعلقات جو پہلے گناہ سمجھے جاتے تھے، وہ آہستہ آہستہ غیر قانونی جرم بننے لگے اور ان میں ایک ہم جنسی تعلقات بھی شامل تھے۔ ۱۵۳۳ء میں سب سے پہلے ہم جنسی کو غیر قانونی قرار دیا گیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ عمل جو مذہبی حلقوں میں Sodomy کے نام سے جانا جاتا تھا، کیوں کہ اس کا تعلق انجیل کے Sodom and Gumurrah کے گناہوں سے تھا، اسے قانونی حلقوں میں Buggery کا نام دیا گیا جس کا تعلق عوامی زبان سے تھا۔ اس فرق سے ملکی قوانین نے مذہبی قوانین سے نجات حاصل کی اور یہ قانون Pope اور King کے درمیان حد فاصل ہوا۔

انگلستان اور امریکہ دونوں ممالک میں ہم جنسی کے جرم کو بڑے جرائم میں شمار کیا جاتا تھا اور اس کی سزا موت تھی۔

شمالی امریکہ کی تاریخ میں بیسیوں نہیں، سیکڑوں ایسے واقعات ملتے ہیں جن میں لوگوں کو ہم جنسی تعلقات پر اذیت ناک سزائیں دی گئیں۔

دسمبر ۱۶۴۲ء میں الزبتھ جانسن کو میساچوسٹی (Massachusette) میں عدالت

نے کوڑوں کی سزا دی، کیوں کہ اس نے اپنی خادمہ سے جنسی تعلقات قائم کیے تھے۔

۱۷۳۴ء میں جارجیا میں ایک شخص کو ہم جنسی کے جرم میں تین سو کوڑوں کی سزا دی گئی۔

۱۶۴۶ء میں ولیم پلین کو ہم جنسی کے جرم میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

جہاں بعض ریاستوں میں ہم جنسی تعلقات گناہ، بعض ریاستوں میں جرم سمجھے جانے لگے تھے، وہیں بعض ریاستوں میں انھیں غیر فطری قرار دیا گیا تھا۔ (۱۶۸۳ء میں پنسلونیا کی حکومت نے اسے غیر فطری قرار دیا تھا۔)

جب ہم ان تاریخی حوالوں کا مطالعہ کرتے ہیں جن میں ہم جنسی تعلقات کو غیر فطری قرار دیا جا رہا ہے تو ان میں ہمیں یہ منطق نظر آتی ہے کہ جنسی ملاپ کا مقصد افزائش نسل ہے۔ چونکہ وہ دور کاشتکاری کا تھا، اس لیے اس دور کی تشبیہات اور استعارے بھی کسانوں کی زندگی کے قریب تھے۔ ان تحریروں میں مرد کی منی کو بیج، عورت کو کھیتی، بچوں کو فصل سے تشبیہہ دی گئی ہے۔ اس سوچ کے مطابق اگر مرد اپنی منی کو بچوں کی پیدائش کے لیے استعمال نہیں کرتا تو اسے غیر فطری اور گناہ قرار دیا جاتا ہے۔ اس دور میں انسانی تعلقات کے لیے زرعی اصطلاحات استعمال کی گئیں۔

چاہے ہم جنسی تعلقات کو گناہ سمجھا گیا ہو، غیر قانونی قرار دیا گیا ہو یا غیر فطری جانا گیا ہو، ان سب کا حل یا تو کوڑوں کی سزائیں تھیں یا سزائے موت۔

سیکڑوں سالوں کی اس اذیت ناک زندگی کے بعد شمالی امریکہ کا سماجی شعور اتنا بیدار ہوا کہ اسے قانونی طور پر قبول کر لیا گیا۔

نیو یارک میں ۱۷۹۶ء میں ہم جنسی تعلقات کے لیے موت کی سزا کو ختم کیا گیا اور جنوبی کیرولینا (South Carolina) میں ۱۸۷۳ء میں اس قانون کو بدلا گیا اور اس طرح اس تاریک دور کا ایک باب ختم ہوا۔

جب ہم ہوموسیکشویلٹی کے سماجی ارتقا کی کہانی میں انیسویں اور بیسویں صدی کے ابواب کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں واضح تبدیلی کا اندازہ ہوتا ہے۔ سولہویں سے ۱۸ ویں صدی تک کا زمانہ نظریات و اخلاقی تعصّبات کی جکڑ بندیوں میں قید تھا تو انیسویں اور بیسویں صدی طب، نفسیات اور ادبی اقدار کی علم بردار تھیں۔ سائنسی تحقیقات نے انسانی سوچ کے نئے دروازے کھول دیے ہیں اور علم و آگہی کی ایسی روشنی در آئی تھی کہ جہالت اور تعصب نے آہستہ آہستہ پچھلے دروازے سے نکل جانے کا فیصلہ کیا۔ لیکن یہ عمل کسی بھی ارتقائی عمل کی طرح بہت آہستہ آہستہ

وقوع پذیر ہوا اور آج بھی ہم جہاں ایک طرف سائنس اور بالغ نظری کا دامن پکڑے ہوئے ہیں تو دوسری طرف اپنے ماضی کے تعصّبات اور نظریات کو چھوڑتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ آج بھی جب ہم حقیقتوں کے آئینوں میں اپنی شکلیں دیکھتے ہیں تو ڈر جاتے ہیں اور اپنی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو فخر کرنے کی بجائے ہماری نگاہیں اور گردنیں شرم سے جھک جاتی ہیں۔

انیسویں صدی میں مغرب کے دانشوروں میں ہم جنسی تعلقات کے بارے میں ایک نئی بحث کا آغاز ہوا۔ اس بحث میں شامل ہونے والے ایک گروہ کا خیال تھا کہ ہم جنسی تعلقات کو گناہ یا جرم قرار دینا ناانصافی ہے۔ اسے ذہنی بیماری یا نفسیاتی کجی یا دماغی خلل قرار دینا چاہیے اور اس میں ملوث لوگوں کو سزا دینے کی بجائے ان کا علاج کرنا چاہیے، ان پر ظلم ڈھانے کے بجائے ان سے ہمدردانہ سلوک رکھنا چاہیے لیکن دوسرا گروہ اسے ذہنی بیماری بھی ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ مصر تھا کہ دو مردوں اور عورتوں کے درمیان تعلقات کو وہی مقام حاصل ہونا چاہیے جو ایک مرد اور ایک عورت کے تعلقات کو حاصل ہے۔ یہ بحث کافی طول کھینچ گئی اور بعض حلقوں میں آج تک جاری ہے۔

جب اس بحث کا آغاز ہوا تو ہم جنسی تعلقات کو بیماری اور Abnormal ثابت کرنے والوں میں Dr. Kierman اور Kraft-Ebbing کا نام سرفہرست تھا۔ ڈاکٹر کائرمین نے اپنے مضامین اور ابنگ نے اپنی کتاب 'Psychopathica Sexualis' میں 'Homosexualism' کو ذہنی کجی قرار دینے کی کوشش کی۔

ان دونوں کے مقابلے میں جرمنی کے ایک ڈاکٹر Dr. Benkert صف آرا تھا جس نے ۱۸۶۹ء میں سب سے پہلے جرمن لفظ 'Homosexualitat' استعمال کیا تھا۔ وہ خود بھی ہوموسیکشول تھا۔ اس نے Sodomy کے قانون کے خلاف احتجاج کی آواز بلند کی تھی اور اپنے قبیلے کے لوگوں کے قانونی حقوق کا بیڑا اٹھایا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ دو مردوں اور دو عورتوں کے ذاتی تعلقات میں مذہب اور عدالتوں کو دخل اندازی کی ضرورت نہیں ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ڈاکٹر بنکرٹ کا استعمال کردہ لفظ 'Homosexual' تیس سال کے بعد خود اس کے مخالفین نے قبول کر لیا تھا اور اس کے بعد یورپ اور امریکہ میں سارے ہم جنس لوگ ہوموسیکشول کہلانے لگے۔

انیسویں صدی کے آخر میں انگلستان کے مشہور ادیب آسکر وائلڈ (Oscar

(Wilde) پر ہم جنسی تعلقات کی بنیاد پر مقدمہ چلانے اور اسے سخت سزا ملنے نیز ہیولاک ایلس (Havelock Ellis) کی کتاب 'Sexual Inversion' پر پابندی لگانے کے واقعات سے مغربی دنیا میں خوف و ہراس کی لہر دوڑ گئی تھی۔

بیسویں صدی کے آغاز میں مردوں کے عورتوں کے لباس پہننے اور عورتوں کے مردوں کے لباس پہننے کے عمل نے بھی بہت سے ماہرین کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی اور کئی ڈاکٹروں اور ماہرین نفسیات نے اسی عمل کے لیے خاص نام بھی تجویز کیے تھے۔

جرمنی میں ۱۹۱۰ء میں ڈاکٹر ہرشفیلڈ (Hirschfield) نے اسے Die Transvestism کا نام دیا تھا، جب کہ امریکہ میں ڈاکٹر ایلس نے ۱۹۲۰ء میں D'Eonism کہہ کر پکارا تھا۔

بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں جہاں ڈاکٹروں اور ماہرین نفسیات صحت اور بیماری کے جھگڑوں میں الجھے ہوئے تھے، اس دوران ادیب، مفکر اور فن کار انسانی رشتوں کی معصومیت اور احترام کا ترانہ گا رہے تھے۔ ان کے نزدیک انسانی رشتوں اور جذبوں کا احترام ایک بنیادی قدر تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ جنسی تعلقات کو اعتبار ملے، چنانچہ انھوں نے انگریزی زبان کے الفاظ اور ان کے معانی کو بدلنے کی کوشش کی۔ وہ الفاظ کی طاقت سے واقف تھے، وہ جانتے تھے کہ زبان بدلنے سے لوگوں کے دل بدل جاتے ہیں۔

انگریزی کے ادیبوں نے 'Lover' کے لفظ کا مفہوم بدلا۔ کسی زمانے میں اس سے روحانی محبت مراد لی جاتی تھی، آہستہ آہستہ اس میں جنسی اور جسمانی جذبات بھی شامل کیے گئے اور پھر 'To make love to' جیسی اصطلاحات رائج کی گئیں جن سے جنسی تعلقات مراد لی جانے لگی۔ اسی طرح 'Sex' کا لفظ جس سے مراد مرد اور عورت کی جنس تھی، اس سے بھی اب مراد جنسی تعلقات لی جانے لگی۔ اس طرح جنس اور جنسی تعلقات پر جو انسانی زندگی کا حصہ ہیں، کھل کر باتیں ہونے لگیں۔

جہاں ایک طرف ادیب آزادئ فکر کے حصول کے لیے کوشاں تھے، تو دوسری طرف قوم کے مبلغین اور روایت پرست لوگ قوم کی تباہی کے لیے پریشان تھے، چنانچہ انھوں نے ادیبوں کی کتابوں پر پابندیاں عائد کرانے کی کوششیں کیں۔

اس دور میں جن کتابوں نے معاشرتی رویوں کو بدلا تھا، ان میں سے چند ایک کے نام

مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۹۲۸ء میں ریڈ کلف ہال (Radcluff Hall) کے مشہور ناول 'تنہائی کے کنویں' (The Well of Loneliness) پر پہلے انگلستان، پھر امریکہ میں پابندی عائد کردی گئی۔

ہال کی محبوبہ اونا ٹرنبریج (Una Trunbridge) نے اس ناول کا ترجمہ فرانسیسی میں کیا۔

ڈوروتھی بسی (Dorothy Bussy) نے اپنی سوانح 'اولیویا' (Oliyia) کے نام سے چھاپی جس میں عورتوں کے ہم جنسی تعلقات کو انسانی حقوق کو جنگ کے طور پر پیش کیا گیا۔

۱۹۳۹ء میں ڈایانا فریڈرکز (Diana Fredricks) نے اپنی سوانح 'ڈایانا' کے نام سے چھاپی۔

ما رینی (Ma Rainy) کا گیت 'Prove it on me blues' بہت مشہور ہوا۔

۱۹۴۲ء میں رابرٹ ڈنکن (Robert Duncan) کے مضمون 'Tha Homosexual in Society' نے اس تحریک کے معاشرتی پہلو کو ایک موڑ دیا۔

۱۹۴۶ء میں جوسنکلیر (Jo Sinclair) کے ناول 'Westland' اور ۱۹۴۹ء میں جیمز بالڈون جیسے معتبر ادیب کی کتاب 'Studies of a new morality' نے امریکی زندگی پر تنقیدی نگاہ ڈالی اور ہم جنسوں کی تحریک کو ایک نئی زندگی بخشی۔

بیسویں صدی کی پانچویں، چھٹی اور ساتویں دہائی میں سائنس نے ایک دفعہ پھر انگڑائی لی۔ ایک طرف طب اور نفسیات کی تحقیقات در پردہ ہو رہی تھی اور فرائڈ جیسے مفکروں کے خیالات غیر شعوری طور پر عوام وخواص کو متاثر کر رہے تھے۔ سائنسی تحقیق نے ایک نیا موڑ لیا۔

اس سلسلے میں کنزی (Kinsey) کی کتابوں:

'The Human Male' (1948)

'The Human Female' (1953)

ماسٹرز جانسن (Masters Johnson) کی کتاب 'Human Sexual Response (1966)' اور فوکو (Foucault) کی کتاب 'The History of

Sexuality (1978) نے جنسی انقلاب کو نئی بنیاد فراہم کیا۔ ان محققین نے سالہا سال کی تحقیق سے ثابت کیا کہ شمالی امریکہ کے لوگ صدیوں سے خود فریبی کا شکار رہے ہیں۔ انھوں نے اعداد و شمار سے ثابت کیا کہ انسانی تعلقات کو صرف ہوموسیکشول اور ہیٹروسیکشول گروہوں میں تقسیم کرنا حقیقتوں سے چشم پوشی ہے۔ انسانی رشتے بہت پیچیدہ اور گنجلک ہوتے ہیں اور ان کے بہت سے رنگ اور خوشبوئیں ہوتی ہیں۔ کنزی نے ثابت کیا کہ شمالی امریکہ کے مردوں اور عورتوں میں ۴۰ سے ۵۰ فیصد تک لوگ نوجوانی سے بڑھاپے تک کے ادوار میں کسی نہ کسی موڑ پر ہم جنسی تعلقات میں شریک ہوتے ہیں۔

اس دوران شمالی امریکہ کے ڈاکٹروں اور ماہرین نفسیات کے ایسے شواہد ملے جن کی بنا پر انھیں ہوموسیکشویلٹی کو ذہنی امراض کی فہرست سے خارج کرنے کے بارے میں سوچنا پڑا اور آخرکار امریکہ کے ماہرین نفسیات کے سالانہ اجلاس میں اس موضوع پر بحث ہوئی اور پھر ووٹنگ ہوئی (جب کہ کانفرنس کی عمارت کے باہر ہوموسیکشول احتجاج کر رہے تھے)، اس طرح ہزاروں ہوموسیکشویلٹی کو ذہنی امراض کی فہرست سے خارج کر دیا گیا۔ یوں امریکہ کے ماہرین نے مان لیا کہ ہوموسیکشول لوگوں کے مسائل ہٹروسیکشول لوگوں کے مسائل کی طرح ہیں۔

اسی دوران شمالی امریکہ میں کالوں، عورتوں اور دیگر اقلیتوں نے اپنے حقوق کی تحریک تیز کر دی تھی، چنانچہ ہوموسیکشول لوگوں نے بھی اپنے آپ کو اقلیت قرار دیا اور ہٹروسیکشولز کی اکثریت سے اپنے حقوق کا مطالبہ کیا۔ یہ جنگ آج بھی جاری ہے۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ اگرچہ یورپ نے شمالی امریکہ کے قبائل پر اپنے نظریات اور قوانین ٹھونسے تھے لیکن چار سو سال کے بعد یورپ ہوموسیکشولز کے انسانی حقوق کے حصول کی جنگ میں شمالی امریکہ سے چند قدم آگے ہی ہے۔ اسکنڈی نیوین ممالک (Scandanavian) میں ہوموسیکشولز کو وہ حقوق اور مراعات حاصل ہیں جو شمالی امریکہ میں حاصل نہیں۔ اگرچہ شمالی امریکہ کے بعض گرجوں نے ان کے حقوق کو تسلیم کیا ہے اور ان کی شادیاں بھی کی ہیں لیکن ان شادیوں کو قانونی حیثیت حاصل نہیں، اس لیے وہ جوڑے نہ شادی کا قانونی سرٹیفکیٹ حاصل کر سکتے ہیں، نہ انشورنس کے لیے درخواست دے سکتے ہیں، نہ امیگریشن حاصل کر سکتے ہیں۔ حتیٰ کہ جب کسی ہوموسیکشول کا بیس برس کا شریک حیات مر جاتا ہے تو اسے دفتر سے تین دن کی چھٹی بھی نہیں ملتی کہ وہ اپنے محبوب کی تجہیز و تکفین کا بندوبست کر سکے اور اس

جنازے میں شریک ہو سکے۔

مغرب کے اہالیان دل یہ امید رکھتے ہیں کہ ایک دن ہم دو مردوں اور دو عورتوں کے درمیان جسمانی، ذہنی اور روحانی رشتوں کو اتنا ہی قابل احترام سمجھیں گے جتنا کہ ہم ایک مرد اور ایک عورت کے رشتے کو سمجھتے ہیں، اور وہ دن اب زیادہ دور نہیں لگتا۔

لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے

ہم جنسیت کا سائنسی مطالعہ

خالد سہیل

جب ہم ہوموسیکشویلٹی کے تصور کو سمجھنے کے لیے سائنس کی دنیا میں داخل ہوتے ہیں تو بہت جلد Anatomy, Genetics, Physiology, Medicine, Pathology, Psychology اور Sexology کی بھول بھلیوں میں کھو جاتے ہیں اور اگر ہم اس مقام تک پہنچ جائیں جہاں ہماری ملاقات کسی ہوموسیکشول سے ہو تو ہمیں وہ ایسی دھند میں گھرے ملتے ہیں جہاں کوئی اپنے آپ کو Hermaphrodite کہتا ہے تو کوئی Transexual اور بعض کہتے ہیں کہ ہم صرف Transvestites ہیں۔ وہ ایسا ماحول ہے جہاں عوام تو کیا خواص بھی اپنی کم علمی سے متعارف ہوتے ہیں۔ سائنس کی دنیا میں ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ اگر ہم اپنے تعصّبات کو گھر چھوڑ کر نہ آئیں اور چیزوں کو نئے انداز سے دیکھنے کے لیے تیار نہ ہوں تو ہم زیادہ نہیں سیکھ سکتے۔ ہوموسیکشویلٹی کی بحث میں ہمیں احساس ہوتا ہے کہ 'سیکس' کا لفظ جسے ہم صرف مرد اور عورت یا جنسی مباشرت کے لیے استعمال کرتے تھے، اور بھی بہت سے مفاہیم لیے ہوئے ہے جو صرف طب اور نفسیات کی کتابوں میں نظر آتے ہیں۔ اسی لیے جب اس موضوع پر لوگ تبادلۂ خیال کر رہے ہوتے ہیں تو انھیں گھنٹوں گفتگو کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ وہ دو مختلف چیزوں کے بارے میں اظہار خیال کر رہے ہوتے ہیں۔

چونکہ ہمارا مقصد ہوموسیکشویلٹی کے تصور کو سائنسی نقطۂ نگاہ سے سمجھنا ہے، اس لیے ہم مختصراً ان تصورات کا جائزہ لیں گے جن کو سمجھنے کے بعد ہمارے لیے ہوموسیکشویلٹی کی تفہیم آسان

ہو جائے گی اور ہم غیر ضروری بحث میں الجھنے سے بچ جائیں گے۔

انسانی بچہ حمل سے بلوغت تک انسانی اور جنسی ارتقا کے جن مراحل سے گزرتا ہے، انھیں ہم افہام و تفہیم کے لیے پانچ مراحل میں تقسیم کر سکتے ہیں اور ان میں ہر مرحلہ اپنی جداگانہ خصوصیات کا حامل ہوتا ہے۔ ان میں سے ہر مرحلے کو سمجھنا انسان کی جنسی زندگی سے پوری طرح واقفیت کے لیے ضروری ہے۔

SEXUAL PERFORMANCE

↑

SEXUAL (GENDER) IDENTITY

↑

ANATOMIC SEX

↑

GENETIC SEX

Genetic Sex:

انسانی بچہ اپنی ماں کے Ovum اور باپ کے sperm کے ملاپ سے معرض وجود میں آتا ہے اور ان میں سے ہر ایک میں کروسومز choromosumes کے تئیس جوڑے ہوتے ہیں۔ ان تئیس میں سے بائیس جوڑے 'اوٹو سوم' (22 pairs of Autosome) کہلاتے ہیں جو انسان کی باقی خصوصیات کا فیصلہ کرتے ہیں اور ایک جوڑا جنسی کروموسوم (1 pair of sex choromosome) کہلاتا ہے جو یہ فیصلہ کرتا ہے کہ بچہ لڑکا ہوگا یا لڑکی۔

ماں کے ovum کے جنسی کرموزوم ہمیشہ 'xx' ہوتے ہیں لیکن باپ کے sperm میں آدھے جنسی کروموزوم 'x' ہوتے ہیں اور آدھے 'y'۔ اس لیے بچے کی پیدائش کے لیے ماں کی طرف سے تو ہمیشہ x کروموزوم ہی ملتا ہے لیکن باپ کی طرف سے کبھی x ملتا ہے اور کبھی y ۔ اگر باپ کی طرف سے x کروموزوم ہے تو بچہ لڑکی پیدا ہوتا ہے اور اگر باپ کی طرف سے y کروموزوم ہے تو بچہ لڑکا پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے یہ سمجھنا کہ بچے کی جنس کا فیصلہ ماں کرتی ہے، طبی طور پر درست نہیں ہے۔

بعض بیماریوں میں اس انتظام میں خلل پیدا ہوجاتا ہے اور انسانی بچہ ۴۶ کروموزوم کی بجائے یا تو ۴۵ کروموزومز سے معرض وجود میں آتا ہے یا ۴۷ سے۔ اگر بچے میں ۴۵ کروموزوم ہوں (xo) تو اسے ہم ٹرنر سنڈروم (Turners Syndrome) کہتے ہیں اور اگر ۴۷ کروموزوم ہوجائیں تو یا وہ xxx ہوتے ہیں اور بچہ 'سوپر فیمیل' (Super Female) کہلاتا ہے اور اگر xyy ہوں تو بچہ 'سوپر میل' (Super Male) یا 'Klineflter's syndrome' کہلاتا ہے۔ اگرچہ نام میں 'Super' کا لفظ آتا ہے لیکن ایسے بچوں کو بہت سے جسمانی اور ذہنی مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

ایک صحت مند بچے میں ۴۶ کروموزوم ہوتے ہیں، چاہے وہ لڑکا ہو یا لڑکی۔

:Anatomic Sex

ماں کے رحم میں انسانی بچے کی پرورش کا مطالعہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ انسانی بچہ بنیادی طور پر لڑکی ہوتا ہے لیکن اگر اس کے کروموزومز میں 'y' کروموزوم شامل ہے تو چھ ہفتوں کی پرورش کے بعد مردانہ غدودوں کا عمل دخل شروع ہوجاتا ہے اور انسانی بچے میں مردانہ جنسی اعضا کی پرورش شروع ہوجاتی ہے۔

اگر بچے میں xx کروموزوم ہیں تو اس کے جنسی اعضا میں ovaries اور uterus اور vagina شامل ہوں گے اور اگر بچے میں xy کروموزوم ہیں تو اس کے جنسی اعضا میں testicles اور penis شامل ہوں گے۔

وہ انسانی بچے جن میں جنسی اعضا کی پرورش میں کمی رہ جاتی ہے، ان میں نہ تو مردانہ جنسی اعضا پایۂ تکمیل تک پہنچتے ہیں اور نہ زنانہ جنسی اعضا۔ ایسے بچے پیدائش کے وقت پہچانے نہیں جاتے کہ وہ لڑکا ہیں یا لڑکی۔

ایسے بچے intersex یا hermaphorodite کہلاتے ہیں۔

ایسے بچے باقی ہر لحاظ سے صحت مند ہوتے ہیں لیکن ان کے جنسی اعضا کی تکمیل میں کمی رہ گئی ہوتی ہے، چنانچہ انھیں بڑے ہوکر بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بہت سے علاقوں میں ایسے لوگ ہیجڑے کہلاتے ہیں۔

:Sexual (Gender) Identity

اکثر محققین کا خیال ہے کہ انسانی بچے جب تین یا چار سال کی عمر تک پہنچتے ہیں تو انھیں یہ شعور پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ لڑکے ہیں یا لڑکی۔ یہ مرحلہ شناخت کا مرحلہ ہوتا ہے، اس لیے اسے identity کا نام دیا جاتا ہے۔

سائنس دانوں کی تحقیق نے اس حقیقت کی طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ انسانی بچے کی شناخت کا لازمی تعلق جنسی اعضا سے نہیں ہے، اس لیے وہ لفظ 'gender' کو سیکشول (sexual) پر ترجیح دیتے ہیں۔ سائنس داں ابھی اس عقدے کا حل تلاش نہیں کر سکے کہ یہ شناخت کا شعور کیسے پیدا ہوتا ہے۔

اگرچہ یہ بچے جن کے کروموزوم xx ہوتے ہیں اور جو زنانہ جنسی اعضا رکھتے ہیں، وہ اپنے آپ کو لڑکی سمجھتے ہیں اور وہ بچے جن کے کروموزوم xy ہوتے ہیں اور جو مردانہ جنسی اعضا رکھتے ہیں، وہ اپنے آپ کو لڑکا سمجھتے ہیں۔لیکن ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔

چنانچہ وہ انسانی بچے جن کے جنسی اعضا اور شناخت میں تضاد ہو، Transexual کہلاتے ہیں۔

وہ بچے جو دیکھنے میں لڑکا نظر آتے ہیں اور ان کے والدین اور رشتہ دار انھیں لڑکا سمجھتے ہیں، جب اپنے آپ کو لڑکی سمجھتے ہیں اور مصر ہوتے ہیں کہ ان کی ذات غلط جسم میں قید ہوگئی ہے تو وہ Male Transexual کہلاتے ہیں۔ وہ مصر ہوتے ہیں کہ وہ لڑکیوں کی طرح کپڑے پہنیں گے، لڑکیوں کی طرح زندگی گزاریں گے اور اگر ممکن ہوا تو اپنے جسم کو آپریشن کے ذریعہ عورت میں تبدیل کرالیں گے۔ ان کے مقابلے میں وہ بچے جو دیکھنے میں لڑکی نظر آتے ہیں اور سب لوگ انھیں لڑکی سمجھتے ہیں لیکن وہ مصر ہوتے ہیں کہ وہ لڑکا ہیں، ایسے لوگ Female Transexual کہلاتے ہیں۔ ایسے بچے لڑکوں کا لباس پہنتے ہیں، لڑکوں کی طرح زندگی گزارتے ہیں اور مصر ہوتے ہیں کہ ایک دن وہ جسمانی طور پر مرد میں تبدیل ہونے کی کوشش کریں گے۔

ایسے لوگ سائنس اور نفسیات کے لیے بڑا معمہ ہیں اور ہمیں اپنی کم علمی کا احساس دلاتے ہیں۔

Transvestite:

بعض لوگ Transexual اور Transvestite میں بہت زیادہ فرق نہیں کرسکتے، اگرچہ ان میں بہت زیادہ فرق ہے۔

ایک Transexual جنس مخالف کی شناخت رکھتا ہے۔ وہ یقین رکھتا ہے کہ وہ لڑکے جسم میں لڑکی یا لڑکی کے جسم میں لڑکا پیدا ہوا ہے اور وہ زندگی کے ہر پہلو کو اسی انداز میں گزارنا چاہتا ہے لیکن Transvestite یقین تو رکھتا ہے کہ وہ اسی جنس کا مرد ہے جس جنس کا اس کا جسم ہے لیکن وہ جنس مخالف کے کپڑے پہن کر ایک خاص قسم کی لذت محسوس کرتا ہے۔ بعض Transvestite صرف جوتے، دستانے یا کوئی اور چیز پہن کر خوش ہوتے ہیں لیکن بعض پوری کی پوری پوشاک پہن کر ایک خاص قسم کا تلذذ محسوس کرتے ہیں۔

Sexual Orientation:

انسانی بچے جب سن بلوغت تک پہنچتے ہیں تو وہ دوسرے انسانوں کو جنسی طور پر پُرکشش پاتے ہیں اور ان کے ساتھ جنسی تعلقات استوار کرنے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔

اکثر نوجوان جنس مخالف کے افراد کو (عورتیں مردوں کو اور مرد عورتوں کو) جنسی طور پر پُرکشش پاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو ہم ہیٹروسیکشول کہتے ہیں۔ لیکن کچھ ایسے لوگ بھی جو اپنے ہی جنس کے افراد کے ساتھ (مرد مردوں کے ساتھ اور عورت عورتوں کے ساتھ) جنسی تعلقات قائم کرتے ہیں، ایسے لوگوں کو ہم 'ہوموسیکشول' (Homosexual) کہتے ہیں اور یہی اس کتاب کا موضوع ہے۔ ان لوگوں کے بارے میں آگے چل کر گفتگو ہوگی۔ یہاں یہ بات واضح کرنا مقصود ہے کہ ہوموسیکشول لوگ Hermaphrodites اور Transvestites سے بہت مختلف ہوتے ہیں۔

Sexual Performance:

جب مرد اور عورتیں اپنا جنسی رفیق چن لیتے ہیں تو پھر ان کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ ان کے اتنے قریب آ جائیں کہ وہ جنسی مباشرت سے لطف اندوز ہوسکیں۔ ان جنسی تعلقات کے کئی پہلو ہوتے ہیں؛ رومانی بھی، لذت بھی اور افزائش نسل بھی۔ اکثر بالغ اور صحت مند لوگوں کے لیے

جنسی تعلقات قائم کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی لیکن وہ مرد جو مباشرت نہیں کر سکتے، Impotent کہلاتے ہیں۔ایسے لوگ جنسی خواہش رکھنے کے باوجود یا تو جنسی عمل شروع نہیں کر سکتے اوران کے جنسی اعضا میں وہ سختی پیدا نہیں ہوتی جو مباشرت کے لیے ضروری ہے اور اگر ان کے penis میں سختی پیدا ہوتی بھی ہے تو یا تو کم ہوتی ہے یا پھر جنسی عمل کی تکمیل تک قائم نہیں رہتی اور وہ عورتیں جو خواہش رکھنے کے باوجود جنسی لذت سے محروم رہتی ہیں اور جنسی معراج (Orgasm) تک نہیں پہنچ سکتیں، وہ Frigid کہلاتی ہیں۔

ڈاکٹروں اور ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ impotent مردوں اور frigid عورتوں کی اکثریت نفسیاتی تضادات کا شکار ہوتی ہے۔ایسے لوگ اکثر اوقات جسمانی طور پر صحت مند ہوتے ہیں۔

اگر ایسے لوگ نفسیاتی علاج کرائیں اور اپنے احساس گناہ یا کسی اور ذہنی تضاد کا، جس کے وہ شکار ہوں، حل تلاش کریں تو ان کی جنسی زندگی بہتر ہو جاتی ہے۔بعض دفعہ اس قسم کے علاج کے لیے دو محبوبوں کا (چاہے وہ دو مرد ہوں، دو عورتیں ہوں یا ایک مرد یا ایک عورت) علاج کرنا پڑتا ہے۔

یہاں یہ بات واضح کرنا اہم ہے کہ جنسی عمل کا کسی کے ہیٹروسیکشول یا ہوموسیکشول ہونے سے کوئی متعلق نہیں۔دونوں گروہوں کے لوگ جنسی تعلقات میں کامیاب بھی ہو سکتے ہیں اور ناکام بھی۔

مندرجہ بالا گفتگو کا مقصد یہ تھا کہ اس سے پہلے کہ ہم ہوموسیکشویلٹی پر اپنی توجہ پوری طرح مرکوز کریں، ہم ان کیفیات اور conditions کا مختصراً جائزہ لے لیں جن کو جانے بغیر ہوموسیکشویلٹی کی گفتگو واضح نہیں ہوگی۔

جب ہم بیسویں صدی میں ہوموسیکشویلٹی کے موضوع پر کی گئی تحقیق کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہماری نظر سب سے پہلے جرمنی کے پروفیسر ہرشفیلڈ (Hirschfeld) پر پڑتی ہے۔انھوں نے سب سے پہلے اس موضوع پر سنجیدگی سے سوچا اور اسے سائنسی نقطۂ نگاہ سے سمجھنے کی کوشش کی۔

چونکہ اس دور میں لوگوں سے بالمشافہ ملنا اور جنسی وہ بھی ہم جنسی جیسے نازک موضوع پر کھل کر بات کرنا بہت مشکل تھا، اس لیے انھوں نے ہزاروں لوگوں کو ایسے سوال نامے بھیجے جن

سے ان کی جنسی زندگی کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔

ہرشفیلڈ نے جب ۱۹۲۰ء میں اپنی تحقیق کے نتائج کے بارے میں مضامین لکھے تو انھوں نے بتایا کہ ان کے معاونین نے ۳۰۰۰ طلبا اور ۵۷۲۱ مزدوروں کو سوال نامے بھیجے تھے۔ ۹۴ فیصد لوگوں نے سوالوں کے جواب دیے اور ان جوابات کے تجزیے سے اندازہ ہوا کہ اس ملک کے ۹۴٫۳ فیصد لوگ ہیٹروسیکشول، ۲٫۳ فیصد لوگ ہوموسیکشول اور ۳٫۶ فیصد لوگ بائی سیکشول (Bisexual) زندگی گزار رہے تھے۔

اگرچہ ماہرین کا خیال ہے کہ ہرشفیلڈ کی ریسرچ سائنس اور تحقیق کے اعلیٰ معیاروں پر پوری نہیں اترتی لیکن اس دور میں اس منزل کی طرف پہلا قدم اٹھانا ہی مجاہدانہ عمل تھا۔

ہرشفیلڈ کے بعد انگلینڈ میں ہیولاک ایلس نے ۱۹۳۶ء میں اس موضوع پر تحقیق کی۔ اس نے ہرشفیلڈ کی تحقیق سے بھی استفادہ کیا۔ ایلس کا تجربہ یہ تھا کہ معاشرے میں ۵-۲ فیصد مرد اور ۱۰-۴ فیصد عورتیں ہوموسیکشول زندگی گزارتی ہیں۔

جوں جوں ہوموسیکشولیٹی کے بارے میں کھل کر بات ہونے لگی، توں توں یہ اندازہ ہونے لگا کہ ہوموسیکشول تعلقات کی تعداد زندگی کے مختلف مراحل میں مختلف ہوتی ہے۔ امریکہ میں جو تحقیقات ہوئیں، ان سے بہت سے گوشوں پر روشنی پڑی۔

ریمزی (Ramsey) نے ۱۹۴۳ء میں یہ ثابت کیا کہ نوجوانوں میں سے ۳۵ فیصد لوگ ہم جنسی تعلقات رکھتے ہیں۔

ہمیلٹن (Hamilton) نے ۱۹۲۹ء میں ثابت کیا کہ ۱۸ سال کی عمر کے بعد ۱۷ فیصد لوگ ہم جنسی تعلقات میں شرکت کرتے ہیں۔

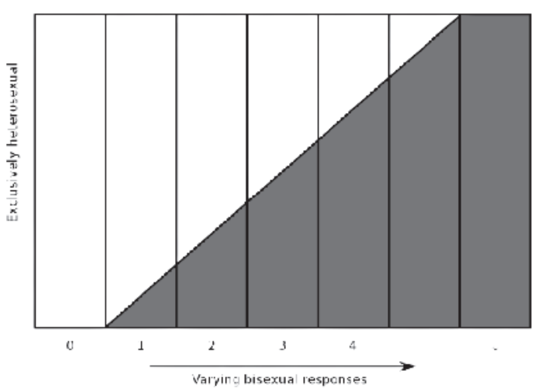
فنگر (Finger) نے ۱۹۴۷ء میں کالج کے طلبا میں تحقیق کی اور بتایا کہ ۲۷ فیصد نوجوان جنسی معراج (Orgasm) تک ہم جنسی تعلقات رکھتے ہیں۔

ان تحقیقات نے وہ بنیاد فراہم کیں جس پر کنزی نے تحقیق کی عمارت تعمیر کی۔ کنزی کی تحقیق وہ پہلا قدم تھا جس نے ہوموسیکشولیٹی جیسے موضوع کو کم علمی، جہالت اور تعصّبات کے تہہ خانوں سے نکال کر یونیورسٹیوں اور گھروں کے لیونگ رومز (living rooms) تک پہنچا دیا اور اس موضوع پر معروضی انداز میں گفتگو ہونے لگی۔ کنزی نے ماہرین کے ایک گروہ کے ساتھ مل کر ہزاروں لوگوں کے انٹرویو لیے اور ان کی جنسی زندگی کی تفصیلی ہسٹری لی۔ اس ہسٹری میں

تفاصیل پر کافی زور دیا گیا اور ہم جنسی زندگی کے آغاز، اظہار، محبوباؤں کا چناؤ، جسمانی عمل اور ردعمل، نفسیاتی ردعمل اور اختتام پر زور دیا گیا۔ اس تحقیق نے اس موضوع کے جسمانی، نفسیاتی اور معاشرتی پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ کنزی نے یہ ثابت کیا کہ جب تک ہم جنسی جیسے موضوع پر سائنسی اور حقیقت پسندانہ انداز سے گفتگو نہ کریں تھے، ہم تعصّبات اور توہمات کی تاریکیوں میں کھوئے رہیں گے۔

کنزی نے بنیادی طور پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ لوگوں کو صرف ہوموسیکشول اور ہیٹروسیکشول خانوں میں بند کر دینا حقیقت پسندانہ انداز نہیں۔ کنزی نے ایک spectrum کا تصور پیش کیا اور نتائج سے ثابت کیا کہ لوگوں میں جنسی میلانات اور رجحانات کی شدت بدلتی رہتی ہے اور مختلف قسم کے میلانات بیک وقت بھی موجود ہو سکتے ہیں۔

کنزی نے یہ بھی بتایا کہ جب اس نے شمالی امریکہ کے مختلف شہروں اور علاقوں کے نتائج کا تجزیہ کیا تو اس میں اسے کوئی زیادہ فرق نظر نہیں آیا۔ اس کا خیال تھا کہ چونکہ معاشرہ ابھی تک ہوموسیکشول طرز زندگی کو قبول نہیں کرتا، اس لیے ہوموسیکشول میلانات اور طرز زندگی گزارنے والے دیرپا تعلقات قائم نہیں کر سکتے اور عارضی رشتوں پر اکتفا کرتے ہیں اور انھیں بھی چھپا کر رکھتے ہیں تا کہ ان پر خاندان اور معاشرے کا عذاب نازل نہ ہو۔



کنزی نے لوگوں کے جنسی میلانات کو سمجھنے کے لیے انھیں سات گروہوں میں تقسیم کیا ہے تا کہ ان کو سمجھنے میں مدد مل سکے۔

گروہ نمبر زیرو:

Exclusively Hetrosexual No Homosexual

ایسے لوگ ذہنی اور جسمانی طور پر جنس مخالف کو ہی پُرکشش پاتے ہیں، اور انھی کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں نے زندگی میں کبھی بھی اپنی ہی جنس کے افراد سے جنسی لذت حاصل نہیں کی۔

گروہ نمبر ۱:

Predominantly Hetrosexual - Incidental Homosexual

ایسے لوگ بنیادطور پر ہیٹروسیکشول ہوتے ہیں لیکن زندگی میں ایک یا دو دفعہ اپنی ہی جنس کے لوگوں کی قربت سے جنسی لذت حاصل کر چکے ہوتے ہیں۔

گروہ نمبر ۲:

Predominantly Heterosexual - More than Incidently Homosexual

ایسے لوگ بنیادی طور پر ہیٹروسیکشول ہوتے ہیں لیکن اپنی جنس کے لوگوں کے ساتھ بھی وقتاً فوقتاً جنسی تعلقات رکھتے ہیں۔ ان لوگوں کے تعلقات جنس مخالف سے اپنی جنس کے لوگوں کی نسبت زیادہ قریبی اور متواتر ہوتے ہیں۔

گروہ نمبر ۳:

Homosexual Equally and Heterosexual

ایسے لوگ اپنی جنس اور جنس مخالف کو یکساں طور پر پُرکشش پاتے ہیں اور دونوں گروہوں سے جنسی تعلقات قائم کرتے ہیں۔

گروہ نمبر ۴:

Prodominantly Homosexual more than Incidently Hetrosexual

ایسے لوگوں کی زندگی کا مرکز اپنی جنس کے لوگ ہوتے ہیں لیکن وہ جنس مخالف سے ہی جنسی تعلقات رکھتے ہیں۔

گروہ نمبر ۵:

Predominantly Homosexual - Incidental Heterosexual

یہ لوگ بنیادی طور پر ہوموسیکشول ہوتے ہیں لیکن زندگی میں ایک یا دو دفعہ جنس مخالف کے افراد کے ساتھ بھی جنسی تعلقات قائم کر چکے ہوتے ہیں۔

گروہ نمبر ٦:

Exclusively Homosexual

ایسے لوگ کلی طور پر ہوموسیکشول ہوتے ہیں۔ ان کی تمام زندگی اپنی ہی جنس کے لوگوں کے ساتھ جنسی تعلقات میں گزرتی ہے۔ وہ جنس مخالف کے افراد کو نہ تو پُرکشش پاتے ہیں اور نہ ہی ان سے جنسی تعلقات قائم کرتے ہیں۔

کنزی اور اس کی رفقا نے جب اپنے انٹرویوز اور مشاہدات کا تجزیہ کیا تو مندرجہ ذیل نتائج پر پہنچے جو ان کی کتاب میں شامل ہیں۔

گروہ ٦ میں شامل ۸ فیصد لوگ ایسے تھے جنھوں نے تین سال یا زیادہ عرصہ ہم جنسی تعلقات میں گزارا تھا۔ ۴ فیصد ایسے تھے جو کلی طور پر ہوموسیکشول زندگی گزار رہے تھے۔

گروہ ۵ + ٦ کی تعداد ۱۰ فیصد تھی۔

گروہ ۴ + ۵ + ٦ کی تعداد ۱۳ فیصد تھی۔

گروہ ۳+ ۴+ ۵+ ۶ کی تعداد ۱۸ فیصد تھی۔
گروہ ۲+ ۳+ ۴+ ۵+ ۶ کی تعداد ۲۵ فیصد تھی۔
گروہ ۱+ ۲+ ۳+ ۴+ ۵+ ۶ کی تعداد ۳۰ فیصد تھی۔

تحقیق نے بتایا کہ شمالی امریکہ میں عوام میں سے ۳۷ فیصد لوگ ایسے تھے جنھوں نے زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر ایک دفعہ اپنی ہی جنس کے افراد کے ساتھ جنسی معراج (orgasm) تک پہنچے تھے۔

کنزی اپنے تجزیے کے آخر میں کہتا ہے کہ وہ قوم جس کے تقریباً ۴۰ فیصد لوگ ہم جنسی تعلقات اختیار کر چکے ہیں، انھیں کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ اس کے خلاف جبر وتشدد اور ظلم کریں۔ اس کا کہنا ہے کہ ہمیں کسی پر انگلی اٹھانے سے پہلے اپنے گریبان میں خود جھانکنا چاہیے۔ ہم کسی اور کو مجرم یا گنہگار قرار دینے سے پہلے حقیقت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنا چاہیے۔ کنزی کا خیال ہے کہ ہم منافقت کی زندگی گزارتے ہیں۔ المیہ یہ ہے کہ بعض لوگوں کی زندگی منظر عام پر آجاتی ہے، اس لیے وہ معتوب ہوتے ہیں جب کہ اکثر لوگ وہی کام چھپ چھپ کر کرتے ہیں، اس لیے منافقت کا نقاب اوڑھے رہتے ہیں۔

کنزی نے ہوموسیکشول لوگوں کے لیے ہمدردانہ رویہ اختیار کرنے کی تجویز پیش کی ہے۔

جب میں کنزی کی کتاب پڑھ رہا تھا تو مجھے یہ شعر یاد آرہا تھا:

مارو مجھے پتھر کہ ہوں آلودۂ عصیاں
لیکن وہ کرے پہل نہیں جو کہ گنہگار

ہم جنسیت کا نفسیاتی مطالعہ

خالد سہیل

جب ہم ہوموسیکشویلیٹی کا نفسیاتی مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ اس موضوع کے بہت سے پہلو اور پرت ہیں؛ انفرادی بھی، معاشرتی بھی، داخلی بھی، خارجی بھی، شعوری بھی، لاشعوری بھی اور ہر پہلو کا مطالعہ ہمیں اپنی کم علمی کا احساس دلاتا ہے۔

جب ہم ماہرین سے یہ پوچھتے ہیں کہ ان کی نگاہ میں ہوموسیکشویلیٹی کیا ہے تو ہمیں دو گروہ ملتے ہیں۔ پہلا گروہ اس کے صرف جنسی پہلو کی طرف اپنی توجہ مرکوز کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ہوموسیکشویلیٹی ایک ہی جنس کے دو افراد کے درمیان جنسی تعلقات کا نام ہے، جب کہ دوسرا گروہ جنس کے ساتھ ساتھ دو انسانوں کے درمیان ذہنی اور جذباتی ہم آہنگی پر بھی زور دیتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہوموسیکشول انسان جنس مخالف کی بجائے اپنی ہی جنس کے لوگوں کو شریک حیات بنانا چاہتے ہیں اور ان کے دکھوں اور سکھوں میں شریک ہونا چاہتے ہیں۔ ان کی نگاہوں میں ہوموسیکشول طرز زندگی کو صرف جنس تک محدود کر دینا ناانصافی ہے۔

مغرب میں اس وقت دونوں گروہوں کے ماننے والے کافی تعداد میں موجود ہیں۔ ان گروہوں کے نقطۂ نظر کا اندازہ اس پیراگراف سے لگایا جا سکتا ہے۔

My concept of Lesbian and Gay as defined by an essential eroticism differs from definations offered in recent years by a

number of Lesbian feminists. For example, historian blanche cook defined 'Lesbians' as 'women' who love women, who choose women to nurture and support and to form a living environment in which to work creativity and independently.

وجوہات:

جب ہم ماہرین سے یہ سوال پوچھتے ہیں کہ آخر ہوموسیکشول، ہوموسیکشول کیوں ہیں، تو وہ کہتے ہیں کہ ہم آج تک اس سوال کا جواب نہیں دے سکے کہ ہیٹروسیکشول، ہیٹروسیکشول کیوں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ابھی ہم جنسی رجحانات کو پوری طرح سمجھ نہیں پائے، اس لیے مختلف محققین کی آرا بہت مختلف ہیں اور وہ اس طرزِ زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔

میں اس موقع پر چند ماہرین کی آرا پیش کرتا ہوں۔

(الف) حیاتیاتی وجوہات:

بعض ماہرین کا خیال ہے کہ ہوموسیکشویلیٹی کا تعلق جینز (genes) سے ہے اور بعض لوگ پیدائشی طور پر ہوموسیکشول ہوتے ہیں۔ اس خیال کی حمایت میں وہ تحقیقات پیش کی جاتی ہیں جن میں جڑواں بھائیوں اور بہنوں کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ کیلمین (Kellman) نے یہ ثابت کیا کہ یکساں جڑواں بچوں (Uniovular Twins) میں سے اگر ایک بچہ ہوموسیکشول ہے تو دوسرے بچے کے بھی ہوموسیکشول ہونے کے ۱۰۰ فیصد امکانات ہیں۔ دیگر ماہرین کا خیال ہے کہ وہ تحقیق سائنس کے اعلیٰ معیار پر پوری نہیں اترتی اور دیگر محققین نے ان مشاہدات کو قبول نہیں کیا ہے۔

محققین کا دوسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ حمل کے ابتدائی مراحل پر بعض ہارمونز (Harmones) بچے کو اس طرح متاثر کرتے ہیں کہ اس کی جنسی ترجیح اپنی ہی جنس کے انسانوں کے لیے ہوتی ہے۔ دیگر محققین اس رائے سے اتفاق نہیں کرتے۔

(ب) خاندانی وجوہات:

بعض محققین نے خاندانی ماحول اور عوامل پر توجہ مرکوز کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ وہ لڑکے جو بڑے ہو کر ہم جنس بنتے ہیں، وہ اپنی ماؤں کے بہت قریب ہوتے ہیں اور اپنے باپوں سے بہت دور؛ ان کی جذباتی اور جنسی شناخت (identification) باپ کی بجائے ماں سے ہوتی ہے، اس لیے نہ صرف ان کی عادات ماؤں کی طرح ہوتی ہیں بلکہ وہ اپنی ماؤں کی طرح مردوں سے محبت کرتے ہیں اور ان کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کرتے ہیں۔

دیگر محققین کا خیال ہے کہ ہوموسیکشویلیٹی میں خاندانی عوامل اہم ہو سکتے ہیں لیکن ان پر حد سے زیادہ توجہ مرکوز کرنا دانش مندی نہیں۔ ان کے خیال میں ہوموسیکشویلیٹی کا ارتقا بہت پیچیدہ اور گنجلک عمل ہے۔ انھیں یہ بھی اعتراض ہے کہ ایسی تحقیق بہت کم لوگوں کی زندگیوں کے مشاہدات پر منحصر تھی۔ انھیں یہ بھی شک ہے کہ اگر ہم ہیٹروسیکشول لوگوں کے خاندانوں کا سنجیدگی سے مطالعہ کریں تو ہمیں شاید وہاں بھی ایسے ہی عوامل کارفرما نظر آئیں۔

(ج) نفسیاتی وجوہات:

جن ماہرین نے ہوموسیکشویلیٹی کے نفسیاتی وجوہات پر غور کیا ہے، ان میں سے بعض کہتے ہیں کہ بچے تین سے پانچ سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے جنس مخالف کے والدین میں دلچسپی لینے لگتے ہیں اور اسی دلچسپی میں لاشعوری طور پر ایک جنسی رنگ بھی ہوتا ہے، اسی لیے بیٹے کہتے ہیں کہ ہم بڑے ہو کر اپنی ماؤں سے شادی کریں گے اور بیٹیاں کہتی ہیں کہ وہ بڑی ہو کر باپوں سے شادیاں کریں گی۔ فرائڈ نے اپنے ایڈیپس کمپلکس (Oedipus Complex) کی بحث میں اس موضوع پر زور دیا ہے۔ اس لیے اگر بچوں کی ذہنی پرورش میں کچھ کمی رہ جائے تو ان کی بلوغت کی زندگی متاثر ہوتی ہے۔

فرائڈ کا خیال تھا کہ ہوموسیکشویلیٹی جنسی ارتقا کی پہلی سیڑھی ہے اور ہیٹروسیکشویلیٹی دوسری۔ اس لیے وہ سمجھتا تھا کہ جو لوگ ہوموسیکشول ہیں، وہ جنسی اعتبار سے بالغ نہیں ہوتے لیکن وہ اسے بیماری نہیں سمجھتا تھا۔

ماہرین نفسیات میں ابھی تک اس موضوع پر اتفاق رائے نہیں ہوا۔

(د)متوازن سوچ:

وہ ماہرین جو کسی ایک مکتبۂ فکر سے تعلق رکھتے، وہ کہتے ہیں کہ ہمیں جذبات کی رو میں بہہ کر کسی ایک نقطۂ نظر کو قبول نہیں کرنا چاہیے بلکہ ایک متوازن نقطۂ نظر رکھنا چاہیے۔ ایسا نقطۂ نظر جو حیاتیاتی، خاندانی، معاشرتی اور نفسیاتی عوامل کو اہمیت تو دے لیکن خواہ مخواہ ایک کو دوسرے پر فوقیت نہ دے۔ ان کا خیال ہے کہ ابھی تک جو تحقیق ہوئی ہے، اس نے ہمیں جوابوں کے بجائے سوال زیادہ دیے ہیں اور اب بھی ہم کم علمی کی تاریک راہوں میں بھٹک رہے ہیں۔

(ڈ)طرز زندگی:

بعض ماہرین نے ہوموسیکشول لوگوں کے طرز زندگی کی تحقیق کی ہے اور یہ جاننے کی کوشش کی ہے کہ ان کا طرز حیات ہیٹروسیکشول لوگوں سے کس طرح مختلف ہوتا ہے۔

ایک اہم ریسرچ میں ۶۸۶ ہوموسیکشول مردوں کے طرز حیات کا مطالعہ کیا گیا اور جب ان کے نتائج کا تجزیہ کیا گیا تو یہ پتہ چلا کہ ان میں سے:

۱۷ء۵ فیصد closed couples تھے۔ ان لوگوں نے ایک ہی محبوب کے ساتھ زندگی گزارنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ وہ جنسی وفاداری کو اہمیت دیتے تھے۔

۱۴ء۹ فیصد open couples تھے۔ انھوں نے اپنے محبوبوں سے جنسی وفاداری کو اہمیت نہیں دی۔ انھیں اپنے محبوب کے علاوہ دوسرے انسانوں سے رومانوی تعلقات قائم کرنے پر کوئی اعتراض نہ تھا۔

۱۲ء۵ فیصد Dysfunctional تھے جن کی زندگی سنجیدہ نفسیاتی مسائل کا شکار تھی۔

۱۶ فیصد Asexual تھے جن کی جنسی تعلقات میں زیادہ دلچسپی نہ تھی۔

ان کے علاوہ باقی لوگوں کو کسی گروہ میں ڈالنا مشکل تھا۔

دیگر محققین کا خیال ہے کہ چونکہ معاشرتی طور پر ابھی بھی ہوموسیکشول اپنے تعلقات کو صیغۂ راز میں رکھنے پر مجبور ہیں اور لوگوں کے منفی ردعمل سے خائف رہتے ہیں، اس لیے ان کے تعلقات در پردہ ہوتے ہیں، یعنی ماہرین کا خیال ہے کہ ہوموسیکشول لوگوں کے محبوب بہت زیادہ ہوتے ہیں اور وہ اپنے محبوبوں سے عارضی تعلقات قائم کرتے ہیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ایڈز (Aids) کی بیماری کے عام ہونے نے ہوموسیکشول لوگوں میں جنسی روابط کی تعداد کو کم کر دیا ہے لیکن اس سلسلے میں کوئی سنجیدہ تحقیق سامنے نہیں آئی۔

تشخیص:

جب ماہرین نفسیات ان لوگوں کا مطالعہ کرتے ہیں جو ہم جنسی تعلقات قائم کر چکے ہوتے ہیں تو مندرجہ ذیل چیزوں کو ذہن میں رکھتے ہیں:

(۱) کیا یہ تعلق عارضی ہے یا اس شخص کا طرز زندگی ہے۔

(۲) کیا یہ تعلق صرف بلوغت سے پہلے کی زندگی میں موجود تھے یا بلوغت کے بعد بھی قائم رہے۔

(۳) کیا ان تعلقات میں مجبوری کا عنصر شامل تھا۔ وہ لوگ جنھیں جنس مخالف کے افراد نہیں ملتے جیسے جیل کی فضا میں، تو وہ بعض دفعہ ہم جنسی تعلقات قائم کر لیتے ہیں۔

(۴) بعض لوگ نظریاتی طور پر ہم جنسی کی زندگی گزارنے کا فیصلہ کر لیتے ہیں، ان میں وہ فیمنسٹ (Feminist) شامل ہیں جو مردوں سے تمام تر قربت کے رشتے منقطع کر چکی ہیں اور صرف عورتوں سے جذباتی اور جنسی تعلقات قائم کرنے کا فیصلہ کیے ہوئے ہیں۔

(۵) بعض لوگ کسی اور ذہنی مرض مثلاً Schizophrenia کا شکار ہوتے ہیں اور ہم جنسی تعلقات صرف اسی مرض کا عارضہ ہوتے ہیں۔

(٦) بعض ماہرین کا خیال ہے کہ ہوموسیکشولیلیٹی کی تشخیص میں تصورات (Fantasies) کو بھی اتنی اہمیت دینی چاہیے جتنی کہ ہم اعمال behaviours کو دیتے ہیں۔

مثال کے طور پر ایک اسکول کے غسل خانے میں دو کم سن لڑکے آپس میں عقبی مباشرت کرتے پکڑے گئے۔ اسکول کے پرنسپل نے انھیں ہم جنسی کے الزام میں سزا دی اور پھر انھیں ماہر نفسیات کے پاس بھیج دیا۔ ماہر نفسیات کے انٹرویو کے دوران لڑکوں نے بتایا کہ وہ مباشرت کے دوران یہ تصور کر رہے تھے کہ وہ کسی لڑکی سے مباشرت کر رہے ہیں۔ ماہر نفسیات نے تشخیص کی کہ وہ لڑکے بنیادی طور پر ہوموسیکشول نہیں تھے لیکن چونکہ انھیں لڑکی کا قرب میسر نہیں تھا، اس

لیے وہ ایسے جنسی افعال کے مرتکب ہوتے ہیں جو ہوموسیکشول تھے۔

ماہرین کا خیال ہے کہ ہوموسیکشول لوگ اپنی تصوراتی زندگی (Fantasy Life) میں اپنی ہی جنس کی قربت کو جنس مخالف کی قربت پر ترجیح دیتے ہیں اور اس سے لذت حاصل کرتے ہیں۔

مغرب میں ماہرین نفسیات کا رویہ پچھلی دو دہائیوں میں بہت بدلا ہے۔ ایک طویل عرصے تک ماہر نفسیات ہوموسیکشویلیٹی کو ایک ذہنی مرض سمجھتے تھے لیکن جب سے ہوموسیکشول لوگوں کا دباؤ بڑھا ہے، American Psychiatric Association (APA) نے اسے امراض کی فہرست سے خارج کر دیا ہے۔ اکثر ماہر نفسیات نے اسے ایک طرز زندگی کے طور پر قبول کر لیا ہے۔

اب صرف وہ ہوموسیکشول زیر علاج ہوتے ہیں جو خود ماہر نفسیات سے رجوع کریں اور کسی داخلی یا خارجی تضاد کا شکار ہوں اور اس کے لیے علاج یا مدد کے خواہاں ہوں۔

اس لیے وہ لوگ جو ڈاکٹروں کے زیر علاج ہیں، ان کی تعداد کم ہوتی جا رہی ہے اور معاشرہ انھیں صحت مند لوگوں کی طرح قبول کرتا جا رہا ہے۔

بہت سے ماہرین کا خیال ہے کہ ہوموسیکشول لوگوں کے مسائل اور تضادات میں بھی ان کے خاندانوں، دوستوں، رفقا کار اور عوام کا بہت حصہ ہے۔ ان کا خیال ہے کہ جوں جوں معاشرہ انھیں احترام کی نگاہ سے دیکھے گا، ان کی نفسیاتی الجھنوں میں کمی ہوتی جائے گی۔

ہم جنسیت

علی عباس جلال پوری

ہم جنسیت (۱) یعنی مرد کی مرد سے اور عورت کی عورت سے جنسی محبت کا کھوج قدیم ترین اقوام میں بھی ملتا ہے، البتہ اس کے آغاز کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض مورخین کی رائے میں اس کی ابتدا مصر قدیم سے ہوئی جہاں دیوی ماتا آئسس کے معبد میں ہیجڑے پجاری رہتے تھے جن سے زائرین تمتع کرتے تھے۔ مصر قدیم کی ایک تحریر سے جو ساڑھے چار ہزار برس کی پرانی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں امرد پرستی کا عام روج تھا۔ مصر سے یہ علت جزیرہ کریٹ اور فنیقیہ (کنعان، فلسطین، آج کل لبنان اس میں شامل تھا) میں پھیل گئی۔ سدوم [لفظ سدومیت] (۲) اسی سے یادگار ہے] اور گمورہ (عامرہ بہ معنی 'آباد') میں امردوں کے قحبہ خانے موجود تھے جن کی سرپرستی کو امرا لازمۂ نجابت سمجھتے تھے۔ عہد نامہ قدیم کے باب پیدائش میں لکھا ہے کہ جب دو فرشتے سدوم کو آگ اور گندھک برسا کر تباہ کرنے کو آئے تو جناب لوط کے گھر ٹھہرے جہاں سدومیوں نے انھیں گھیر لیا اور شور مچانے لگے کہ اے لوط! انھیں باہر بھیجو۔ فرشتوں نے انھیں اندھا کر دیا اور اس طرح اپنے آپ کو بچایا۔ فنیقی جہاز ران تجارت کے سلسلے میں دور دراز کے بحری سفروں پر جاتے تھے اور غیر اقوام کے بچوں کو خرید کر یا بھگا کر لے آتے تھے۔ انھیں آختہ کر کے امرا کی حرم سراؤں یا مندروں میں رکھا جاتا تھا جہاں یاتری اپنی سدومی ہوس کی تسکین کرتے تھے۔ فنیقیوں نے شمالی افریقہ کے ساحل پر کارتھیج کا شہر بسایا تو وہاں بھی امرد پرستی رواج پا گئی۔ سدوم کی طرح یونان کا شہر کورنتھ سدومیت کا بہت بڑا مرکز تھا۔ بابل میں عشتار کے معبد میں

ہیجڑے پجاری رہتے تھے جنھیں کدیش (مقدس) کہا جاتا تھا۔ ان کا پروہت اکودرم کہلاتا تھا۔ چین قدیم اور جاپان میں امردوں کے قحبہ خانے موجود تھے۔ فنیقیوں کی طرح جاپانیوں کا بھی خیال تھا کہ سدومی دلیر اور شجاع ہوتے ہیں۔ اہل یونان نے امرد پرستی کو قومی اور تعلیمی ادارہ بنالیا اور ہم جنسیت ان کے معاشرے، مذہب، فلسفہ، اخلاق، قانون اور شعر و ادب میں نفوذ کر گئی۔ لائی کرگس اور سولن نے اپنے اپنے ضابطۂ قوانین میں سدومیت کو مباح کر دیا لیکن ایک شرط عائد کی کہ صرف آزاد لڑکوں سے اظہار عشق کیا جائے، غلام ہم جنسی محبت کے اہل نہیں ہوتے۔

ہومر نے کہا ہے، ''سبزہ آغاز نوجوان دنیا کی حسین ترین مخلوق ہے۔''

قدمائے یونان امردوں کے حسن و جمال کے شیدائی تھی اور خوش رو نوجوانوں سے عشق کرتے تھے۔ وہ نوخیزوں کی آنکھوں، سنہرے بالوں اور گلگوں رخساروں کی تعریف میں رطب اللساں ہیں۔ ارسطو کہتا ہے، ''عشاق اپنے محبوب لڑکوں کے حسن و جمال کا نظارہ صرف ان کی آنکھوں میں کرتے ہیں کہ انھی میں لڑکوں کے محاسن کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔''

سقراط ایک حسین لڑکے آٹولیکس کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے، ''جس طرح اندھیری رات میں آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں پر سب لوگوں کی نگاہیں جم کر رہ جاتی ہیں، اسی طرح آٹولیکس کے چہرے کی طرف تمام لوگوں کی نگاہیں اٹھ جاتی ہیں۔''

افلاطون نے جب حسین جسم میں حسین روح کی تلاش کی تھی تو اس سے اس کی مراد حسین لڑکے ہی کی روح تھی۔ یونانیوں کے خیال میں عشق وہ جذب و کشش ہے جو حسن و جمال کی طرف مائل کرے اور حسن و جمال لڑکوں ہی میں ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ حسین لڑکوں کے مجسمے ترشوا کر اپنے معبدوں میں رکھتے تھے۔ اعلیٰ طبقے کے لوگ امردوں کے قحبہ خانوں میں جانا اپنی کسر شان سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم جنسی عشق کا معاوضہ طلب کرنا یا ادا کرنا مردان فرومایہ کا شیوہ ہے۔ یونان کے دیوتا بھی ہم جنسی تھے۔ خداوند خدا زیس کا گینی میڈ سے، اپالو کا ہیاسنتھ سے اور ہرکولیز کا ہائی لیز سے معاشقہ مشہور ہے۔ ارسطو 'جمہوریہ' میں لکھتا ہے کہ جزیرۂ کریٹ میں لڑکوں سے عشق کرنا نہ صرف جائز تھا بلکہ مملکت بھی اس کی حوصلہ افزائی کرتی تھی تاکہ آبادی میں اضافے کو روکا جا سکے۔ معلوم ہوا کہ مالتھس کا نظریہ کوئی نئی چیز نہیں ہے۔

یونان قدیم کے فلاسفہ نے ہم جنسی عشق کی تعریف و توصیف میں منطقی دلائل دیے ہیں اور شاعروں نے اس کی کشش کے گیت گائے ہیں۔ سقراط سمپوزیم کے مکالمے میں کہتا ہے کہ عشق

حصول دوام کی آرزو کا نام ہے جو عورتوں کو حاملہ کرتا ہے اور حسین لڑکوں کی عقل و خرد کو جِلا دیتا ہے۔ عشق افلاطونی سے بالعموم مرد عورت کی پاکیزہ محبت مراد لی جاتی ہے لیکن یہ درست نہیں ہے۔ اس کا مطلب ہے مرد کی مرد سے سچی اور پُرجوش محبت۔ اہل یونان کا خیال تھا کہ نوجوانوں کی باہمی محبت ان میں عزم و حوصلہ، شجاعت و شہامت اور دوسرے اخلاقی محاسن پیدا کرتی ہے۔ چنانچہ ہم جنسیت یونانیوں کی تعلیم و تربیت کا جزو لازم بن گئی۔ اسپارٹا میں نوخیز لڑکوں کو اپنی عمر سے بڑے نوجوانوں سے وابستہ کر دیا جاتا تھا جو ان کی تربیت کے ذمے دار ہوتے تھے۔ دونوں میں پُرجوش محبت کا ہونا لازم تھا۔ بڑی عمر کے نوجوانوں کو 'مصلح' اور چھوٹی عمر کے لڑکے کو 'سامع' کہتے تھے۔ جب کسی 'سامع' سے میدان جنگ میں بزدلی کا اظہار ہوتا تھا تو 'مصلح' کو سزا دی جاتی تھی کہ تم نے اس کی مناسب تربیت کیوں نہیں کی۔ یونانی ریاست تھیبیا کا دستۂ مقدس اس ادارے کی معروف مثال ہے۔ یہ دستہ ایپاسائنا واس نے مرتب کیا تھا۔ پلوٹارک لکھتا ہے:

> یونان قدیم کی ریاست تھیبیا کا دستۂ مقدس شجاعت و بسالت کے لیے مشہور تھا۔ اسے ان نوجوانوں سے ترتیب دیا گیا تھا جو ایک دوسرے سے دلی محبت کرتے تھے اور اپنے محبوب کے دوش بدوش لڑ کر جان دینا اپنے لیے باعث فخر خیال کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ دستہ ہر لڑائی میں فتح یاب ہوتا رہا۔ جنگ قیرونیہ میں، جس میں فلپ شاہ مقدونیہ نے یونانی ریاستوں کی متحدہ فوج کو شکست فاش دی تھی، یہ دستہ بھی شریک تھا۔ اس دستے کے 'رفقا' اس پامردی سے جم کر لڑے کہ شکست کے بعد اس کا ایک سپاہی بھی زندہ گرفتار نہ کیا جا سکا۔ فتح کے بعد شاہ فلپ میدان جنگ کا چکر لگاتا ہوا اس جگہ پہنچا جہاں اس دستے کے نوجوان کے خون آغشتہ لاشے پڑے تھے۔ اس نے دیکھا کہ تمام مقتولین نے سینے میں زخم کھائے تھے اور ہر ایک کی نعش اپنے رفیق کی نعش کے پاس پڑی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔

یونان قدیم کی غنائی شاعری فارسی غزل کی طرح خالصتاً ہم جنسی عشق پر مبنی ہے۔ اس میں امردوں سے اظہار عشق کیا گیا ہے۔ ایک شاعر اسٹرٹیون کہتا ہے، ''شدید گرمی میں ایک حسین پھول کمھلا کر رہ جاتا ہے، اسی طرح خط کا ایک بال لڑکے کے حسن کو تباہ کر دیتا ہے۔''

ابی کس حسین لڑکوں کی آنکھوں کو ستاروں سے تشبیہ دیتا ہے جو اندھیری رات میں چمک

رہے ہوں۔ ایک یونانی شاعر کہتا ہے،''میرے پیارے تری آنکھیں تو بہروں سے بھی باتیں کرتی ہیں۔''

فلوسٹریٹس اپنے محبوب لڑکے کو مخاطب کر کے گویا ہوتا ہے،''میں نے تمھیں گلاب کے پھولوں کا ایک گلدستہ بھیجا ہے، اس لیے نہیں کہ تم ان سے لطف اٹھاؤ بلکہ اس لیے کہ تمھارے ہاتھ میں وہ تروتازہ رہیں گے۔''(۳)

''یہ پھول تمھارے لیے زیب و زینت کا باعث نہیں ہوں گے بلکہ تم ان کی زیبائش کا موجب بنو گے۔''(۴)

''تم نے مجھے ملامت کی ہے کہ میں تمھیں گلاب کے پھول نہیں بھیجتا۔ تمھیں ان کی ضرورت بھی کیا ہے، تمھارے اپنے رخساروں پر گلاب کے پھول کھلے ہوئے ہیں۔''(۵)

شاعر لکم تیس نے ایک شخص ہسپیاس کا ذکر کیا ہے جو اپنے محبوب اندی مین کی خوب صورت آنکھوں میں جھانکنے کا ایسا مشتاق تھا کہ اسے سونے نہیں دیتا تھا۔ یوری پیڈیز اپنے ایک المیے میں کہتا ہے،''نوخیز لڑکے مردوں کے لیے تسکین خاطر اور تفریح طبع کا باعث ہوتے ہیں۔''

شاعر اناکریون شاہ پالی کریٹس کے ایک حسین غلام سمرویس پر فریفتہ ہو گیا اور اس کی زلف پیچاں کی تعریف میں نظم کہی۔ بادشاہ نے جھلا کر سمرویس کے بال کٹوا دیے۔ دیوتا ایراس کے تہوار پر لڑکوں کی محبت کے گیتوں کا مقابلہ ہوتا تھا اور منتخب گیتوں پر انعامات دیے جاتے تھے۔ عاشق کو 'بھیڑیا' اور محبوب کو 'میمنہ' کہتے تھے۔ جس شریف زادے کا کوئی عاشق نہ ہوتا، وہ اسے اپنے لیے باعث ننگ و عار سمجھتا تھا۔ زینوفن کے بقول مرد اور امرد کے تعلق کو ازدواجی نوع کا خیال کرتے تھے۔ عورتیں امردوں سے جلتی تھیں۔ ایک عورت نے طنزیہ کہا،''مجھے ایسے مرد کی ضرورت نہیں ہے جسے بذات خود ایک مرد کی ضرورت ہو۔'' لوکین نے اپنے ایک رسالے میں عورت کی محبت پر امرد کی محبت کو ترجیح دی ہے۔ افلاطون نے اپنے مکالمے 'فیدرس' میں ہم جنسی عشق کی تعریف پُر جوش انداز میں کی ہے۔ یونانی زبان میں ہم جنسی عشق کے بارے میں کئی اصلاحات پائی جاتی ہیں، مثلاً نوخیزوں کا عاشق'، 'خوب صورت لڑکوں کا عاشق'، 'نوخیز لڑکوں کو تاڑنے والا'، 'لڑکوں کو آنکھ سے اشارے کرنے والا'، 'سنہری زلفوں والے لڑکے سے پیار کرنے والا' وغیرہ۔ جو امرد عورتوں کی طرح بناؤ سنگھار کرتے ہیں اور زنانہ ادائیں دکھاتے تھے، انھیں کینڈس کہتے تھے۔ گھٹیا قسم کے لونڈوں کو ہیٹیرا کہا جاتا تھا اور انھیں نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا

تھا کیوں کہ وہ خرچی وصول کرتے تھے جسے باذوق یونانی آدابِ عشق کے منافی خیال کرتے تھے۔ پیشہ ور امردوں کے قحبہ خانوں پر محصول عائد کیا جاتا تھا۔ ہیویلاک ایلس لکھتا ہے کہ قدمائے یونان کے خیال میں سچی محبت صرف مرد ہی مرد سے کر سکتا ہے، عورت سے عشق کرنے کو وہ جنوں خیال کرتے تھے۔ عورت ان کے یہاں بچے جاننے کے لیے تھی اور بس۔ ہر خاندانی شخص اعلانیہ ایک نوخیز محبوب رکھتا تھا اور اس بات پر فخر کرتا تھا۔ ڈیماس تھینز کے پاس ایک حسین امرد تھا جس پر اس کی بیوی لڑائی جھگڑا کیا کرتی تھی۔ زینوفون کو ایک لڑکے کلتیاس سے عشق تھا۔ ارسطو، ہر میاس پر فدا تھا، زینو رواقی عورتوں کی کشش سے بے نیاز تھا اور صرف امردوں سے پیار کرتا تھا۔ مشہور موسیقار عارفیوس خوب صورت لڑکوں کا شیدائی تھا۔ بعض اوقات حسین امردوں سے باقاعدہ شادیاں رچائی جاتی تھیں جن کی رسوم دھوم دھام سے مناتے تھے۔ تھیوکریتس! اس ہمہ گیر شوق پر طنز کرتے ہوئے کہتا ہے: ''نوجوان دلفس عشق میں مبتلا ہے، میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ کسی عورت پر عاشق ہوا ہے یا کسی مرد پر فدا ہے۔''

لکنیس ہم جنسی عشق کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے، ''عورتوں سے سبھی شادیاں کرتے ہیں، لڑکوں سے عشق کرنا صرف دانشوروں کا شیوہ ہے کیوں کہ عورت میں نیکی کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔''

افلاطون سمپوزیم میں کہتا ہے، ''وہی نوجوان جو ہم جنسی عشق کا تجربہ رکھتے ہوں، اچھے سیاست دان بن سکتے ہیں۔''

عورتوں کی ہم جنسی محبت کی روایت بھی یونانِ قدیم سے یادگار ہے۔ جزیرۂ لزباس کی مشہور و معروف سیفو سے اس کا آغاز ہوا تھا۔ اس کے وطن کی رعایت سے عورتوں کی ہم جنسی محبت کا نام 'لزبائی عشق' (۱) پڑ گیا۔ سیفو نے نوجوان لڑکیوں کو ادب و شعر اور رقص و موسیقی کی تعلیم دلانے کے لیے ایک مدرسہ قائم کیا۔ وہ اپنی طالبات کو 'رفیقہ' کہا کرتی تھی اور ان سے اظہارِ عشق کیا کرتی تھی۔ گورگو، نومیس، انڈرومیڈا، اناگورا، کلیسی اور اتیس اس کی محبوب لڑکیاں تھیں۔ اتیس پر تو وہ جان و دل سے فدا تھی۔ سوئے اتفاق سے اتیس ایک نوجوان سے محبت کرنے لگی۔ سیفو نے اپنے سوزِ دروں، آشفتہ خاطری اور یاس و حرماں کا اظہار اس نظم میں کیا ہے۔

وہ شخص دیوتاؤں کا مثیل ہے جو تیرے قریب بیٹھا تیری نقرئی سریلی آواز کو سنتا ہے اور پیار کی ہنسی ہنستا ہے۔

یہ دیکھ دیکھ کر میرا جی حیران ولرزاں ہوا ہے، کیوں کہ جب کبھی میں تمھارے
قریب بیٹھوں میری زبان گنگ ہوجاتی ہے اور مجھ پر سکتہ طاری ہوجاتا ہے۔
میرے رگ و پے میں آگ کے شعلے بھڑک اٹھتے ہیں، میری نگاہیں خیرہ
ہوجاتی ہیں اور یوں لگتا ہے جیسے سمندر کی موجوں کی آواز میرے کانوں میں آ
رہی ہے۔
مجھے پسینے چھوٹ جاتے ہیں اور میرے دست و پا کپکپانے لگتے ہیں، میرا
چہرے کا رنگ خزاں زدہ گھاس کی مانند پیلا پڑ جاتا ہے۔
مجھ پر سکرات کا عالم طاری ہوجاتا ہے اور میں وارفتگی کی رو میں بے اختیار
بہہ جاتی ہوں۔

ایک اور شعر پارے میں وہ عشق کے 'تلخ شیریں عذاب' کا ذکر کرتی ہے۔ افلاطون کہا کرتا تھا کہ ''ادب وفن کی نو دیبیاں مانی گئی ہیں۔ میرے خیال میں سیفو دسویں دیبی تھی۔''

سیفو کے علاوہ میجلا اور فیلینس مشہور ہم جنسی عورتیں تھیں جولز بائی اختلاط کرتی تھیں۔ یونانیوں کی طرح رومیوں کے یہاں بھی ہم جنسی عشق اور سدومیت کا عام رواج تھا۔ سلاطین وامرا سب اس رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ سدومیوں کی اپنی دیوی تھی جسے کاسٹینا کہتے تھے اور اس کی پوجا ذوق وشوق سے کرتے تھے۔ رومہ کے امرد، عورتوں کی زلفیں بڑھاتے تھے اور ہارسنگھار کرتے تھے۔ امردوں کے ساتھ شادیاں بھی رچائی جاتی تھیں۔ قیصر روم نیرو کی ملکہ پوپیا مرگئی تو اس نے ایک لڑکے اسپورس سے نکاح کرلیا کیوں کہ اس کی شکل وصورت پوپیا سے ملتی جلتی تھی۔ قیصر ہیلیو گابوس ایک نوجوان ہاروکلیز پر مرتا تھا۔ اس نے ہاروکلیز سے باقاعدہ شادی رچائی اور زوجہ کی طرح اس کی خدمت کیا کرتا تھا۔ کالی گولا کا محبوب امرد منسٹر تھا جو سیاہ وسفید کا مالک بن گیا تھا۔ رومہ کے حماموں میں خوش رولڑکے ملازم رکھے جاتے تھے جو یونانی ذوق کی تسکین کرتے تھے۔ رومہ کے شاہی خاندان میں اگریپنا اور لیویا لزبائی اختلاط کے لیے بدنام تھیں۔ سدومیوں کو کنیدی اور زنانوں کو پتھیسی کہتے تھے۔ شریف زادے نامور شہریوں سے برملا سدومی تعلق رکھتے تھے۔ جولیس سیزر اپنے لڑکپن میں بتھنیا کے بادشاہ نکومیدس کا محبوب رہ چکا تھا۔ اس کا جانشین آگستس سیزر بھی نوخیزی کے ایام میں کئی لوگوں کا محبوب رہ چکا تھا۔ لاطینی شاعر مارشل نے اپنی عشقیہ نظموں میں لڑکوں ہی سے اظہار محبت کیا ہے اور اپنے محبوب کے معطر بوسوں کا ذکر کیا ہے۔

رومتہ الکبریٰ کے زوال اور عیسائیت کے فروغ کے ساتھ جنسی قدریں بھی متاثر ہوئیں۔

مجوسیت، یہودیت اور اسلام میں ہم جنسی اختلاط اور سدومیت کی سخت ممانعت کی گئی ہے۔عہد نامہ قدیم میں لکھا ہے،''تو مرد کے ساتھ صحبت نہ کرنا جیسے عورت سے کرتا ہے۔ یہ نہایت مکروہ کام ہے۔'' (احبار) قسطنطین نے سدومیت کی سزا موت قرار دی اور حکم دیا کہ سدومیوں کو سولی پر گاڑنے سے پہلے سخت عذاب دیا جائے۔ یہ شق یورپی اقوام کے ضابطۂ فوجداری میں شامل کر لی گئی۔آلڈس ہکسلے نے لکھا ہے کہ لندن کے میوزیم کی دیوار پر ایک تحریر آویزاں ہے جس میں دو آدمیوں کے مقدمے کی تفصیل درج ہے جنھوں نے ۱۸۳۰ء میں سدومیت کا ارتکاب کیا تھا۔ انھیں سزا کا حکم سناتے وقت منصف نے لکھا کہ سدومیت کے اس ارتکاب نے ان اشخاص کے ساتھ سارے ملک کی سلامتی کو معرض خطر میں ڈال دیا ہے کیوں کہ سدوم کا شہر اسی گناہ کی پاداش میں تباہ کیا گیا تھا۔فیصلہ میں یہ بھی لکھا گیا کہ ان مجرموں کو دوسرے قاتلوں کے ساتھ سولی پر نہ گاڑا جائے مبادا ان کے قرب سے 'معصوم قاتل' ملوث ہو جائیں۔

ہندوؤں میں ہم جنسی اختلاط ممنوع تھا۔منوسمرتی میں عورتوں کے ہم جنسی اختلاط کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

> اگر کوئی کنواری کسی دوسری کنواری کو آلودہ کرے تو اسے دوسو پانسی جرمانہ کیا جائے اور دس بید مارے جائیں۔اگر کوئی عورت کسی کنواری کو خراب کرے تو اس کا سر مونڈ دیا جائے یا اس کی دو انگلیاں کاٹ دی جائیں اور اسے گدھے پر بٹھا کر سارے شہر میں پھرایا جائے۔

مجوسیوں کی شریعت میں سدومی کی سزا موت تھی۔'اوستا' میں سدومیت کو سنگین جرم قرار دیا گیا کیوں کہ اس سے افزائش نسل پر بُرا اثر پڑتا ہے۔مذہب کے زوال کے ساتھ مذہبی اخلاق سے بھی روگردانی کی گئی اور مرور زمانہ سے یورپ اور دنیائے اسلام میں بھی ہم جنسیت رواج پا گئی۔دسویں صدی عیسوی میں نارمن حملہ آوروں نے سدومیت کو دور دور تک پھیلا دیا۔لوئی چہار دہم کے عہد حکومت میں ورسائی کے دربار میں ہم جنسی عشاق نے ایک خفیہ انجمن قائم کی جس میں ڈیوک گراموں، شہزادہ کانٹی اور مارکی دبیراں جیسے رؤسا شامل تھے۔انجمن کے ارکان نے عہد کر رکھا تھا کہ وہ زندگی بھر عورت کے قریب نہیں پھٹکیں گے۔وہ اپنے لباس کے نیچے سونے کی صلیب پہنتے تھے جس میں ایک مرد کے ایک عورت کو پامال کرنے کا نقش کندہ تھا۔اسے سدومیوں

کی انجمن کہنے لگے۔ لوئی نے سختی سے اس کا استیصال کر دیا۔ والٹیر نے فریڈرک اعظم شاہ پرشیا کے دربار کی سدومی فضا کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اس سے یورپ بھر کی عورتوں میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی۔ فریڈرک اعظم نوخیز کیڈٹوں سے جی بہلاتا تھا۔ اس کے عہد سے سدومیت جرمن فوج کی ایک محکم روایت بن گئی اور اسے لازمۂ جواں مردی سمجھا جانے لگا۔

ایڈورڈ دوم شاہ انگلستان سدومی تھا اور اپنے لونڈے پائرس گیوسٹن پر جان چھڑکتا تھا۔ رچرڈ شیر ول اپنے یونانی ذوق کے لیے بدنام تھا۔ جیمز اول اسٹوارٹ امرد پرست تھا اور اپنے محبوب جارج ولیئرز سے والہانہ عشق کرتا تھا۔ اس نے جارج ولیئرز کو ڈیوک بنا دیا اور وہ ملک کی سیاسیات پر حاوی ہو گیا۔ روم میں ہر سال پوپ کے حکم سے سیکڑوں لڑکوں کو آختہ کیا جاتا تھا تاکہ بڑے ہو کر بھی ان کی آواز کی دلکشی برقرار رہے اور وہ مذہبی سنگیت منڈلیوں میں گا سکیں۔ پادری انھیں حرص و ہوس کا نشانہ بناتے تھے۔ ان ہیجڑوں کے باعث روم سدومیت کا مرکز بن گیا۔ کسانووا نے اپنی خودنوشت سوانح حیات میں لکھا ہے کہ کارڈینل بورجیس کا محبوب ہیجڑا اتنا حسین و جمیل تھا کہ لوگ دور دور سے اسے دیکھنے کے لیے آتے تھے۔ راہبوں اور راہبات کے اقامت خانے سدومیت اور لزبائی اختلاط کے لیے رسوائے دہر تھے۔ روسو کے اعترافات میں ان کی امرد پرستی کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ روسو نوخیزی کے عالم میں تحصیل علم کے لیے ایک خانقاہ میں داخل ہوا۔ وہاں اس پر جو گزری، اسی کی زبانی سنیے:

> ان دو بدقماشوں میں سے جو مور کہلاتے تھے، ایک مجھ پر عاشق ہو گیا۔ وہ بڑے اشتیاق سے مجھ سے باتیں کرتا اور میری چھوٹی موٹی ضروریات پوری کرنے پر ہمیشہ مستعد رہتا۔ وہ مجھے اپنے کھانے سے حصہ بھی دیتا تھا۔ وہ اس ذوق وشوق سے میرا منہ چوما کرتا کہ مجھے گھن آتی تھی۔ مجھے اس کے بدوضع چہرے سے جس پر کسی زخم کا گہرا نشان تھا اور جس پر پیار کی بجائے خشمناکی کا گمان گزرتا تھا، خوف محسوس ہوتا لیکن میں چپ چاپ اس کے بوسوں کو برداشت کر لیتا تھا اور اپنے آپ سے کہتا کہ آخر وہ مجھ سے پیار کرتا ہے، اسے دھتکار دینا نامناسب ہوگا۔ شدہ شدہ وہ دست درازی پر اُتر آیا۔ وہ بعض اوقات ایسی عجیب وغریب خواہشات کا اظہار کرتا کہ مجھے شبہ ہونے لگتا کہ وہ پاگل ہے۔ ایک رات کو اس نے میرے ساتھ سونے کی خواہش ظاہر کی لیکن

میں نے انکار کر دیا اور عذر کیا کہ میرا بستر بہت چھوٹا ہے۔ اس نے اصرار کیا کہ میں اس کے بستر پر چلوں لیکن میں نے پھر انکار کر دیا کیوں کہ اس کے کپڑے گندے تھے اور ان سے تمبا کو کی غلیظ بد بو آتی تھی۔ اگلی صبح کو جب ہم ملے تو اس نے مجھ سے پھر بوس و کنار کا آغاز کیا اور اس انداز سے کیا کہ میں ڈر گیا...

روسو نے خانقاہ کے منتظم سے اس کی شکایت کی تو وہ فرمانے لگے، ''واہ! یہ بھی کوئی بات ہے۔ اوائل عمر میں ایسے کئی واقعات خود مجھ پر گزر چکے ہیں، میں ذاتی تجربے کی بنا پر کہتا ہوں کہ یہ تجربہ چنداں ناخوشگوار بھی نہیں ہوتا۔ تم خانقاہ کو خواہ مخواہ بدنام کرنا چاہتے ہو۔'' یہ سن کر روسو سناٹے میں آ گیا اور اسی روز خانقاہ سے بھاگ گیا۔ روسو کے معاصر دیدیرو نے اپنے ناول 'راہبہ کی سرگزشت' میں لزبائی عشق کا استادانہ نقشہ کھینچا ہے۔

قدیم چین میں والدین اپنے خوردسال بیٹوں کو قحط کے ایام میں بیچ دیتے تھے۔ جب وہ بڑے ہو جاتے تو انھیں بسا اوقات امردوں کے قحبہ خانوں میں رکھا جاتا تھا۔ جاپان میں یونان کی طرح امرد پرستی کو لازمۂ شجاعت سمجھا جاتا تھا اور سمورائی سردار خوب صورت نوخیزوں کو اپنی مصاحبت میں رکھتے تھے جہاں وہ آداب مردانگی سیکھتے تھے اور سرداروں کی سدومی ہوس کی تسکین بھی کرتے تھے۔ رچرڈ برٹن نے ہم جنسیت کو ایک خطہ قرار دیا ہے جو ایک طرف فرانس، اسپین، اطالیہ، یونان، مراکو، مصر، ایشیائے کوچک، عراق، افغانستان، کشمیر، پنجاب، چین اور جاپان تک پھیلا ہوا ہے اور دوسری طرف جزائر غرب الہند اور امریکہ پر محیط ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس خطے میں ہم جنسیت قدیم ایام سے پنپتی رہی ہے۔ برٹن نے صرف دو اقوام کو ہم جنسیت اور سدومیت سے مبرا قرار دیا ہے، عرب اور حبشی، باقی سب اقوام اس میں ملوث رہی ہیں۔

یونان کے بعد ایران کو ہم جنسیت کا سب سے بڑا مرکز سمجھا جاتا ہے۔ ہیروڈوٹس کے خیال میں ہم جنسیت یونان ہی سے ایران میں پھیلی تھی۔ یہ بات قرین قیاس ہے کیوں کہ مجوسیت میں اسے نہایت قبیح فعل اور سنگین جرم سمجھا جاتا ہے۔ ساسانیوں کے عہد حکومت میں ہم جنسیت ایرانی معاشرے کا ایک اہم ادارہ بن گئی تھی۔ خسرو پرویز کے دربار میں نوخیز خوبرو غلام قیمتی لباس پہنے، زلفیں بڑھائے، سروں پر سونے کے تاج سجائے موجود رہتے تھے۔ ساقی گری کا کام بھی خوش شمائل، ہیجڑوں کے سپرد تھا۔ بنی بویہ کے اقتدار کے ساتھ ہم جنسی عشق فارسی شاعری میں نفوذ کر گیا۔ معتضد دیلمی امرد پرست تھا۔ ایک دفعہ ایک جنگ کے دوران میں اس کا ایک محبوب غلام

دشمنوں نے گرفتار کرلیا۔ معتضد نے مارے غم کے کپڑے پھاڑ ڈالے، کھانا پینا چھوڑ دیا اور کئی روز محل سے باہر نہ نکلا۔ یہی حالات شاہان صفوی کی تھی۔ شاہ عباس کبیر کے دربار میں حسین امرد زرق برق کپڑے پہنے موجود رہتے تھے۔ تصوف کی تحریک کا آغاز تصفیۂ اخلاق سے ہوا تھا لیکن سیاسی اور اخلاقی تنزل کے ساتھ ہی وہ بھی زوال پذیر ہوگئی۔ غلط کار صوفیوں نے امردوں سے برملا عشق کرنا شروع کر دیا۔ مولانا روم نے اپنی مثنوی میں ان ریاکار صوفیوں کا پردہ بڑی بے رحمی سے چاک کیا ہے۔ صوفیوں میں عشق ہم جنسی وبا کی صورت اختیار کر گیا، حتیٰ کہ سدومیت کو علت المشائخ کہنے لگے۔ فارسی غزل کا محبوب امرد ہی ہے۔ تسا بچہ، مُغ بچہ، ترک بچہ، خط و دستار کے الفاظ اس بات پر دلالت کرتے ہیں۔ شعرا امردوں سے عشق کرتے تھے اور اس بات پر فخر کرتے تھے۔ مستشرق براؤن ایران گیا تو اس نے دیکھا کہ لوگ بے محابا خوش گل لڑکوں سے اظہار عشق کرتے ہیں۔ وہ لکھتا ہے:

> رات کے کھانے کے بعد نوخیز لڑکے رقص و سرود سے مہمانوں کی تفریح کا سامان کرتے ہیں۔ جب کوئی لڑکا حسین ہونے کے ساتھ خوش گلو بھی ہو تو سامعین پر وجد و حال کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ مجھے ایک محفل میں شرکت کرنے کا اتفاق ہوا جہاں سامعین گانے والے لڑکے کی آواز اور اس کے حسن و جمال سے ایسے متاثر ہوئے کہ بے اختیار اٹھ کھڑے ہوئے، ہاتھ میں ہاتھ ملا کر اس کے گرد حلقہ بنالیا اور لگے مستانہ وار ناچنے۔ وہ ناچتے جاتے اور آواز ملا کر نعرہ لگاتے، ''بارک اللہ کچلو! بارک اللہ کچلو۔'' (ننھے خدا تمھیں برکت دے۔)

ایرانی تہذیب وہ تمدن کے اثرات دنیائے اسلام پر بڑے گہرے اور دور رس ہوئے۔ ان اثرات کا کھوج عہد عہد بنوعباس، ترکوں کے معاشرے، مصر کے بنو فاطمہ اور ممالیک اور ہندوستان کے غلام اور مغل بادشاہوں کی زندگیوں میں لگایا جا سکتا ہے۔ ایرانی طرز معاشرت اور فنون لطیفہ کے ساتھ ساتھ ہم جنسی میلان بھی ہر کہیں رواج پا گیا۔ بنوعباس کے عہد کا تمدن ایرانی ہی تھا۔ ہارون اور جعفر برمکی کی محبت کا ذکر تاریخوں میں محفوظ ہے۔ ہارون ایک لمحہ کے لیے بھی جعفر کو اپنی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتا تھا۔ اس نے ایک ایسا فرغل بنوا رکھا تھا جس کے دو گریبان تھے، اسے پہن کر وہ ایک جان دو قالب بن جاتے تھے۔ ہارون کا بڑا بیٹا امین صبح و

شام امردوں میں گھرا رہتا تھا۔ اس نے اپنے محبوب غلاموں کی جماعتوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ سفید لباس پہننے والوں کو 'ٹڈے' کہتا تھا اور سیاہ پوشوں کو 'کوے' کہا کرتا تھا۔ یہ عادت چھڑانے کے لیے اس کی ماں زبیدہ نے حسین وجمیل کنیزیں مردانہ لباس پہنا کر اس کے پاس بھیجیں۔ انھیں غلامیہ کہتے تھے۔ امین اپنے ایک غلام کوثر پر جان چھڑکتا تھا۔ خانہ جنگی کے دوران میں جب ماموں کے سپہ سالار طاہر بن حسین کی فوج بغداد میں گھس آئی اور امین کی سپاہ شکست کھا کر تتر بتر ہوگئی تو ایک شخص دوڑتا ہوا امین کے پاس پہنچا جو اس وقت دریا کے کنارے بیٹھا اپنے محبوب کوثر کے ساتھ مچھلیاں پکڑ رہا تھا۔ اسے شکست کی خبر دی گئی تو وہ بدمزہ ہو کر کہنے لگا، ''خدا تمھیں غارت کرے۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ دیکھتے نہیں کہ کوثر نے دو مچھلیاں پکڑ لی ہیں اور میرے ہاتھ ایک بھی نہیں لگی۔''

خلیفہ الحاکم فاطمی کا معاشقہ خواجہ سراعین کے ساتھ مشہور ہے۔ سلاطین اور امرا کے حرم سراؤں میں لزبائی عشق کا رواج عام تھا۔ ایک شخص قدرتاً سیکڑوں لونڈیوں سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتا، اس لیے کنیزیں ایک دوسری سے لزبائی اختلاط کر کے اپنی محرومی کا مداوا کر لیتی تھیں۔ طبری لکھتا ہے کہ ایک دن ہادی عباسی اپنے ندیموں کی صحبت میں بیٹھا تھا کہ ایک غلام باریاب ہوا اور اس نے جھک کر خلیفہ کے کان میں کچھ کہا۔ ہادی نے حاضرین سے کہا، تم بیٹھو میں ابھی آتا ہوں اور اٹھ کر چلا گیا۔ وہ کافی دیر کے بعد واپس لوٹا۔ اس کا رنگ فق تھا اور سانس پھولی ہوئی تھی۔ وہ مسند سے لگ کر بیٹھ گیا اور ایک ساعت چپ چاپ بیٹھا رہا۔ حاضرین حیران و ششدر تھے اور بُت بنے بیٹھے تھے۔ اتنے میں ایک غلام آیا۔ وہ ایک طشت اٹھائے ہوئے تھا جو رومال سے ڈھکا تھا۔ ہادی نے غلام کو حکم دیا کہ رومال ہٹا دے۔ یہ دیکھ کر سب دہشت زدہ رہ گئے کہ طشت میں دو حسین کنیزوں کے کٹے ہوئے سر رکھے تھے اور ان سے عطر اور لہو کی ملی جلی بُو آ رہی تھی۔ ہادی نے اپنے ندیموں سے کہا، جانتے ہو! ان کا قصور کیا تھا؟ انھوں نے لاعلمی کا اظہار کیا تو ہادی کہنے لگا، ''مجھے علم تھا کہ یہ کنیزیں ایک دوسرے سے عشق کرتی ہیں۔ میں نے ان پر مخبر لگا دیے کہ جب یہ محو اختلاط ہوں تو مجھے خبر کر دی جائے۔ آج میں نے انھیں عین ناگفتہ بہ حالت میں پکڑ لیا اور اپنے ہاتھ سے دونوں کا سر قلم کر دیا۔'' یہ کہہ کر بدستور ہنسی مذاق کی باتیں کرنے لگا۔

مرور زمانہ سے مسلمان میں امرد پرستی اس قدر عام ہوگئی کہ غیر مذاہب کے لوگ اسے اسلام کا جزو سمجھنے لگے۔ البیرونی کے بقول کابل کے ہندو راجا نے اسلام قبول کیا تو یہ شرط لگائی کہ

وہ نہ گائے کا گوشت کھائے گا اور نہ لونڈوں سے عشق بازی کرے گا۔ سلطان محمود غزنوی کا معاشقہ اپنے غلام ایاز سے مشہور ہے۔ سلطان کے بارے میں خوند میر لکھتا ہے:

سلطان محمود غزنوی کو مشتری چہرہ غلاموں سے عشق تھا۔ فضل بن احمد بھی اس شوق میں اپنے آقا کا مقلد تھا۔ مثل مشہور ہے کہ غلام اپنے آقا کی پیروی کرتا ہے۔ اسے کسی نے بتایا کہ ترکستان میں ایک نہایت حسین غلام ہے۔ اس زہرہ جبیں کو حاصل کرنے کے لیے فضل بن احمد نے اپنا ایک کارندہ وہاں بھیجا اور اسے تاکید کی کہ وہ غلام کو عورتوں کی طرح محمل میں چھپا کر لائے۔ ایک مخبر نے سلطان کو یہ بات بتادی۔ سلطان نے وزیر سے کہا کہ وہ اس سیم اندام کو حضور میں پیش کرے۔ وزیر لیت و لعل کرتا رہا۔ اگرچہ اسے یقین تھا کہ سلطان اس کی جان و مال پر قدرت رکھتا ہے۔ ایک سلطان نے اپنے وزیر سے کہا آج رات ہم تمھارے گھر آئیں گے۔ وزیر نے اسے اپنی عزت افزائی سمجھ کر سلطان کی ضیافت کا اہتمام کیا۔ جب وہ غلام حور شمائل سلطان کے حضور میں آیا تو سلطان نے خشمگیں ہو کر وزیر کو سخت سست کہا اور اسی وقت حکم دیا کہ وزیر کا مال و متاع ضبط کر لیا جائے۔ اس کے چند روز بعد سلطان عازم ہند ہوا اور اس کی غیر حاضری میں دشمنوں نے اسے شکنجے میں کس کر عذاب دے دے کر مار ڈالا۔

عماد الدین اصفہانی 'تاریخ سلجوقیہ' میں لکھتا ہے، ''سلطان سنجر کی عادت تھی کہ جو غلام پسند آجاتا تھا، اسے خرید کر اس سے عشق کرتا تھا اور اس کی عام شہرت ہو جاتی تھی اور جان و مال اس پر صرف کرتا تھا۔'' تزک بابری کے مطالعے سے ہم جنسیت کے عام رواج کا علم ہوتا ہے۔ بابر اپنے ایک عزیز سلطان محمود مرزا کے بارے میں لکھتا ہے۔

سلطان محمود مرزا کے عادات و خصائل کے بارے میں یہ کہوں گا کہ وہ پابند صوم و صلوٰۃ تھا لیکن اس کے ساتھ فسق و فجور اور تشدد میں بھی انتہا کو پہنچا ہوا تھا لیکن اس کے ساتھ فسق و فجور اور تشدد میں بھی انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ وہ ہر وقت نشے میں دھت رہتا۔ اس نے کئی لونڈے رکھے ہوئے تھے۔ اس کی مملکت میں جہاں کوئی نوخیز اور حسین لونڈا دکھائی دیتا، وہ اسے قابو میں لانے کی ہر ممکن

کوشش کرتا تھا۔ اس کے سرداروں کے بیٹے، حتیٰ کہ اس کے رضاعی بھائی اور رضاعی بھائیوں کے بیٹے بھی اس سے محفوظ نہیں تھے۔

ہمایوں بھی حسین نوجوانوں میں کشش محسوس کرتا تھا۔ آزاد لکھتے ہیں:

شاہ ابوالمعالی بڑے حسین اور طرح دار تھے۔ ایک دفعہ ایک رئیس علی شیر بیگ کو قتل کر دیا۔ ماخوذ ہو کر دربار میں پیش ہوئے۔ ہمایوں بادشاہ عالم حسن و جمال میں محو ہو گئے اور معاف کر دیا۔

اکبر ایرانی ذوق سے مبرا تھا لیکن اس کے امرا ترک اور اُزبک ہم جنسی معاشقے کرتے تھے۔ ایک سردار شاہ قلی ایک خوب صورت نوجوان مقبول خان پر عاشق ہو گیا۔ اکبر نے منع کیا تو اس نے سب کچھ لٹا دیا اور جوگی بن کر جنگل کی راہ لی۔ خان زمان ایک نوخیز شاہم بیگ پر مرتا تھا۔ شاہم بیگ کا جی خان زبان کی داشتہ آرام جان پر آ گیا۔ خان زمان نے یہ طوائف شاہم خان کو بخش دی۔ شاہم بیگ ایک لڑائی میں مارا گیا تو خان زمان نے اس کے سوگ میں ماتمی لباس پہنا۔ جہانگیر نے ایک سدومی واقعہ نویس اور اس کے محبوب کو عبرت ناک سزا دی تھی۔ آزاد کے الفاظ میں ''بادشاہی واقعہ نویس ایک لڑکے کو لے کر بھاگ گیا کہ نہایت صاحب جمال تھا اور جہانگیر بھی دربار میں دیکھ کر خوش ہوا کرتا تھا۔ حکم دیا، پکڑ لاؤ۔ وہ کئی منزل سے پکڑ لائے۔ اپنے سامنے دنوں کی زندہ کھال اتروا دی۔''

ترکوں اور ازبکوں کی طرح افغان امرا و سلاطین بھی ایرانی ذوق رکھتے تھے۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے سلیم شاہ سوری اور دولت خان کے معاشقے کا حال لکھا ہے۔ وہ کہتا ہے:

مرض کی بے قراری میں بھی یہ حال تھا کہ جب تک اس کے حواس ٹھکانے رہے، اپنے معشوق دولت خان کو سامنے بٹھائے رکھتا تھا اور اس کی صورت دیکھا کرتا تھا۔ جب کبھی غش سے چونکتا یہی کہتا، دولت خان کہاں ہے، ضعف کی وجہ سے کروٹ لینا مشکل تھا لیکن اپنے محبوب کی یہ دلدہی تھی کہ اگر دولت خان دوسری طرف آ بیٹھتا تھا تو اسے یہ گوارا نہ تھا کہ اسے اپنے سامنے آنے کی زحمت دے بلکہ لوگوں سے کہتا تھا کہ میرا منھ اس کی طرف پھیر دو۔ ایک دن دولت خان موجود نہ تھا۔ پوچھا، ''وہ کہاں ہے؟'' لوگوں نے کہا کسی سے ملنے گیا ہے۔ سلیم شاہ سمجھا مجھے مرتا ہوا دیکھ کر اوروں سے پہلو جوڑ لیا ہے۔ اتنے

میں دولت خان حاضر ہو گیا۔ اس کو دیکھ کر جان میں جان آئی اور سلیم شاہ نے یہ شعر پڑھا:

قدر من گر نہ شناسی کہ جانم بوفا
باش تا صحبت یاران دگر دریابی

سلطان محمد عادل سوری عرف عدلی ایک بھگت لڑکے پر جو نہایت خوب صورت اور نازک اندام تھا، فریفتہ ہو گیا۔ اسے مجاہد خان کا خطاب دیا اور دس ہزاری کا منصب عطا کیا۔ یہ لڑکا اس قدر نازک مزاج تھا کہ ایک دفعہ اجادن کے میدان میں چوگان کھیل کر لوٹا تو راستے میں غازی خان سور کے ڈیرے پر ٹھہر گیا اور کہا مجھے بھوک لگی ہے۔ غازی خان نے کہا آجاؤ، ماحضر تیار ہے لیکن جب کھانا سامنے آیا تو قلیہ کی مہک ہی سے اسے غش آنے لگا اور وہ وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔ مبارک شاہ خلجی اور خسرو خان کا عشق تاریخ ہند کا ایک عبرت ناک باب ہے۔ خسرو خان ابتدا میں ایک ہندو غلام تھا جس پر سلطان فریفتہ ہو گیا۔ خسرو خان نے اپنے خاندان کے چند لوگوں سے مل کر سلطان کو قتل کرنے اور تخت و تاج پر قبضہ کر لینے کی سازش کی۔ درباریوں نے بادشاہ کو اس کے ارادوں سے مطلع کیا لیکن خسرو خان نے خلوت میں نسوانی اداؤں اور عشوؤں سے رو رو کر اپنی صفائی پیش کی۔ سلطان تو پہلے ہی اس کا شیدائی تھا، فرشتہ کے الفاظ میں:

بادشاہ را از گریہ دل بہ درد آمد، او را در کنار گرفت و بوسہ بر رخسارش دادہ گفت خاطر جمع دار کہ یک موئے سر ترا بہتر از بادشاہی خود می دانم چہ جائے آنکہ در خاطر تو دغدغۂ بدگویاں باشد۔

خسرو خان نے اسی شب مبارک شاہ کا سر تن سے جدا کر دیا، اس کے بچوں کو تہ تیغ کیا اور اس کی بیگمات کو گھر میں ڈال لیا۔ سکھ بھی سدومی ذوق سے بہرۂ وافر رکھتے تھے۔ رنجیت سنگھ کا معاشقہ گلاب سنگھ سے مشہور ہے۔ گلاب سنگھ اس کا محبوب لونڈا تھا۔ یہ گلاب سنگھ وہی ہے جس کے ہاتھ انگریزوں نے اونے پونے کشمیر بیچ دیا تھا۔

ہسپانیہ میں بھی ہم جنسیت کے آثار ملتے ہیں۔ جوزی نے عشق ہم جنسی کا ایک واقعہ بیان کیا ہے جو درج ذیل ہے۔

ہسپانیہ کا نحوی ابن کلیب (متوفی ۱۰۳۵ء) اور اسلم جو ایک قاضی کا خوب صورت بیٹا تھا، اکٹھے پڑھتے تھے۔ ابن کلیب اس پر فریفتہ ہو گیا اور اس کے

حسن و جمال کی تعریف اور اپنی شیفتگی کا احوال اپنی نظموں میں بیان کرنے لگا۔ شدہ شدہ ان نظموں کا دور دور چرچا ہو گیا اور گویے محفلوں میں انھیں گانے لگے۔ احمد بن کلیب نے اپنی کتاب 'الفصیح' بھی اسلم کے نام پر معنون کی۔ اسلم کو شرم محسوس ہوئی اور اس سے ملنا چھوڑ دیا۔ غم فراق میں ابن کلیب کی حالت دگرگوں ہو گئی۔ وہ پہروں اسلم کے مکان کے دروازے کے سامنے اِدھر اُدھر ٹہلتا رہتا کہ کہیں آتے جاتے اسے اپنے محبوب کا دیدار میسر آئے لیکن اسلم کترانے لگا۔ ناچار ایک دن ابن کلیب ایک بدو کے بھیس میں انڈے مرغیاں بیچنے کے بہانے اسلم کے دروازے پر آیا۔ اسلم باہر نکلا تو ابن کلیب نے اس کا ہاتھ چوما اور ظاہر یہ کیا کہ وہ اس کا مزارع ہے جو اس کے لیے تحفے لایا ہے۔ دوران گفتگو اسلم نے اسے پہچان لیا اور شکایت کی کہ تمھاری وجہ سے میں کسی کو منھ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔ ابن کلیب شکستہ دل لوٹ گیا اور قضا کار گھر جاتے ہی بیمار پڑ گیا۔ مرض نے طول پکڑا تو اس نے اپنے ایک دوست سے التجا کی کہ جس طرح ممکن ہو سکے، وہ ایک بار اسلم کو اس کے پاس لے آئے۔ دوست اسلم کے پاس گیا اور منت سماجت کر کے اسے اپنے ساتھ جانے پر آمادہ کر لیا۔ ابھی وہ راستے ہی میں تھا کہ اسلم شرما کر ٹھہر گیا اور کہا بخدا اس سے آگے میں جاؤں گا، تم مجھے مجبور نہ کرو۔ ابن کلیب کے دوست نے کہا، بس اب کچھ زیادہ دور نہیں جانا ہوگا، مکان بالکل قریب ہے۔ اسلم نہ مانا اور واپس مڑا۔ دوست نے اس کا دامن پکڑ لیا مگر وہ چھڑا کر بھاگ گیا۔ ناچار وہ اکیلا ابن کلیب کے پاس پہنچا۔ ابن کلیب نے اپنا ایک غلام راستے میں کھڑا کر رکھا تھا جس نے اسے اسلم کی آمد کی خوش خبری دے رکھی تھی اور وہ ہمہ تن انتظار میں بیٹھا تھا۔ جب اس کا دوست اکیلا واپس لوٹا اور ساری روئداد کہہ سنائی تو ابن کلیب کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا اور اس پر ہذیان کے آثار ظاہر ہو گئے۔ اس کا دوست باہر نکلا۔ ابھی وہ گلی ہی میں تھا کہ ابن کلیب کے متعلقین کے نالہ و بکا کی آوازیں آنے لگیں اور وہ سمجھ گیا کہ ابن کلیب واصل بحق ہوا۔

مصری قدیم زمانے سے ہر نوع کی جنسی بے راہ روی کے لیے بدنام رہے ہیں۔ اسلام

کی اشاعت نے بھی ان کی جنسی عادات کو چنداں متاثر نہیں کیا۔ رچرڈ برٹن لکھتا ہے کہ نیدرلینڈ کے کونسل جنرل موسیو دارائے نیر نے ایک دن سعید پاشا سے کہا کہ مصر میں سدومیت پھیلی ہوئی ہے، حالاں کہ یہ نہایت مذموم فعل ہے۔ سعید پاشا نے جواب دیا، ''موسیو! آپ کی رائے محض قیاسی ہے۔ اس موضوع پر اظہار رائے سے پہلے بہتر ہوگا کہ آپ اس کا دونوں طرح کا تجربہ کرلیں۔'' یہ لطیفہ ایک مدت تک ڈپلومیٹ حلقوں میں چکر لگاتا رہا۔ چارلس نیپئر نے سندھ کو فتح کیا تو اسے بتایا گیا کہ کراچی میں امردوں کے قحبہ خانے ہیں جن کی سرپرستی برملا کی جاتی ہے۔ اس بات کی تحقیق کے لیے رچرڈ برٹن کو مامور کیا گیا جو سندھی زبان جانتا تھا۔ اس نے بھیس بدل کر اپنا نام مرزا عبداللہ بوشہری رکھا اور مرزا محمد حسین شیرازی کو ساتھ لے کر ان قحبہ خانوں کا کھوج لگایا۔ رچرڈ برٹن کے بقول قبائلی علاقے اور افغانستان سے جو قافلے ہندوستان کو آتے تھے، ان میں نوخیز امردوں کو زنانہ لباس پہنا کر قافلے والے اپنے ساتھ لاتے تھے۔ انھیں 'کوچی سفری' کہتے تھے۔ یاد رہے کہ عالم جنسیات میں ہم جنسی عشق اور سدومیت پر تحقیق علمی کی اولیت رچرڈ برٹن ہی کو دی جاتی ہے۔ اس نے ہم جنسیت کی توجیہہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ میلان ان اقوام میں پایا جاتا ہے جن کے معاشرے میں مردوں اور عورتوں کو میل جول کی آزادی نہیں ہوتی، نیز فوجیوں کی لشکر گاہوں، اسکولوں اور کالجوں کی اقامت گاہوں، جیلوں اور سمندری جہازوں میں سدومیت عام ہوتی ہے کیوں کہ ان میں صنف مخالف سے اختلاط کے مواقع کم ملتے ہیں۔ یہ بات ایک حد تک درست ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ فی زمانہ ہمہ گیر جنسی آزادی کے باوجود مغربی ممالک میں ہر کہیں ہم جنسیت اور سدومیت کا رواج عام ہو رہا ہے۔ امریکہ میں ہم جنسی گوشۂ تاریکی سے باہر نکل آئے ہیں اور کھلم کھلا اپنے ذوق کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کے کلب الگ ہیں؛ علاحدہ ناچ گھر اور شراب خانے ہیں جہاں صرف ہم جنسی اکٹھے ہو سکتے ہیں۔ ان کے خاص کھیل کے میدان ہیں، تھیٹر ہیں، موسیقی کی محفلیں ہیں، ہوسٹل ہیں، رسالے ہیں اور اخبار ہیں۔ وہ علانیہ ہم جنسیت سے اپنی وابستگی کا اظہار کرتے ہیں۔ امرد تنگ پتلونوں اور ڈھیلے ڈھالے سویٹروں سے پہچانے جاتے ہیں۔ وہ کولہے مٹکا مٹکا کر راستہ چلتے ہیں۔ سدومی چمڑے کی جیکٹ پہنتے ہیں۔ صرف سان فرانسسکو میں ہم جنسوں کے تیس شراب خانے ہیں جہاں اغیار بار نہیں پا سکتے۔ امرد کو 'ملکہ' کہتے ہیں۔ یہ نوجوان غازے اور لپ اسٹک کا استعمال کرتے ہیں اور شوخ رنگوں کا لباس پہنتے ہیں۔ ٹینس کے جوتوں سے بھی پہچانے جاتے ہیں۔ ہم جنسی پارکوں میں اور سڑکوں کے کنارے اپنے

ہم مشرب سرپرستوں کے انتظار میں کھڑے ہوتے ہیں اور اپنے خاص اشاروں سے ایک دوسرے کو اپنی جانب ملتفت کرتے ہیں۔ اضلاع متحدہ امریکہ میں پچاس تنظیمیں ہم جنسوں کی قائم ہیں جن کے اراکین ایک دوسرے کو ملاقات کا وقت دیتے ہیں اور اس وقت ملک بھر میں چھبیس لاک مرد اور چودہ لاکھ عورتیں ہم جنسی اور لزبائی ہیں۔ (واضح رہے کہ یہ اعداد و شمار برسوں پہلے کے ہیں جب مصنف نے یہ مضمون تحریر کیا تھا، جواب کئی گنا بڑھ چکے ہیں۔ مدیر) سان فرانسسکو، نیویارک، لاس اینجلس، سینٹ لوئی وغیرہ بڑے بڑے شہروں میں ہم جنسوں کے شبانہ رقص ہوتے ہیں جن میں امرد زنانہ لباس پہن کر شریک ہوتے ہیں۔ ہم جنسوں کے اپنے ناٹک گھر ہیں جہاں عشق ہم جنسی کے موضوع پر کھیل دکھائے جاتے ہیں۔ بعض اوقات ایک چاہنے والا اپنے محبوب امرد اور ایک شیدائی عورت اپنی دوگانہ کے ساتھ مل کر رہتے ہیں، گویا ان کا تعلق ازدواجی ہے۔ حال ہی میں ایک خبر شائع ہوئی ہے کہ آسٹن (ٹیکساس) میں اسٹیٹ اٹارنی کرافورڈ مارٹن نے دو مردوں کی باہمی شادی کو خلاف قانون قرار دے دیا۔ یہ دونوں پہلے امریکی باشندے ہیں جنھوں نے آپس میں باقاعدہ شادی کی ہے۔ ولیم ارٹ کی عمر ۳۰ سال ہے اور انٹونیو مولیانا کی عمر ۳۳ سال ہے۔ ان دونوں نے ۱۵ اکتوبر کو ہوسٹن کے گرجا میں باقاعدہ شادی کی تھی۔ ایسے بے شمار ہم جنسی اور لزبائی جوڑے ہیں جو گرجا کے توسط کے بغیر ازدواجی زندگی گزار رہے ہیں۔ امریکہ میں ہم جنسیت اس قدر عام ہوگئی ہے کہ ارباب حکومت متوحش ہو گئے ہیں اور ملک بھر میں ہم جنسیت کی دہشت طاری ہے۔ ہم جنسیت اور سدومیت جدید تمدن کا ایک اہم مسئلہ بن گئی ہے۔ ۲۸ جون ۱۹۷۰ء کو دس ہزار ہم جنسوں نے نیویارک میں جلوس نکالا اور مطالبہ کیا کہ ہم جنسوں کو ملازمتوں میں مناسب حصہ دلایا جائے اور انھیں برسرعام ایک دوسرے سے پیار کرنے اور شادی رچانے کا حق دیا جائے۔

عورت کی آزادی سے مغرب میں ایک خاموش نفسیاتی انقلاب آرہا ہے۔ مردوں میں زنانہ پن پیدا ہو رہا ہے اور عورتوں میں مردانہ خصوصیات ابھر رہی ہیں۔ نتیجتاً مغربی فضا ہم جنسی میلان کے پنپنے کے لیے زیادہ سازگار ہوگئی ہے۔ جیمز میک پارٹ یسنڈ لکھتا ہے، ''ہمارے بے شمار مردوں عورتوں کا ہم جنسیت میں پناہ لینا ہمارے مستقبل کے لیے خطرے کا نشان بن گیا ہے۔''

مغرب کے قحبہ خانوں میں ہم جنسی میلان اور لزبائی شوق کی تشفی کے سامان کیے جاتے ہیں۔ ان میں امرد اور دوگانہ رکھی جاتی ہیں جن کی خدمات حاصل کرنے کے لیے ہزاروں ڈالر

خرچ کیے جاتے ہیں۔ نیویارک، پیرس، ٹوکیو وغیرہ کے قحبہ خانوں میں لزبائی اختلاط کے مناظر دکھانے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ کنسے کے بعد کی تحقیق نے ثابت کر دیا ہے کہ لزبائی عورتوں کی تعداد امریکہ میں ہم جنسی مردوں سے کہیں زیادہ ہے اور لزبائی عورتیں آزادیٔ نسواں کی تحریک کی پُر جوش علم بردار بن گئی ہیں۔ ایک خاتون بار برا لُو لکھتی ہے:

> لزبائی وہ عورتیں ہوتی ہیں جو مرد کی مالی اور جذباتی محتاجی کے بغیر گزر بسر کر سکتی ہیں اور انتہا درجے کی خود مختار ہوتی ہیں۔ وہ یہ بات منوانے کے لیے دن رات بر سر پیکار ہیں کہ عورتیں بھی صحیح معنوں میں انسان ہیں اور مردوں کے محض ضمیمے ہی نہیں ہیں۔ وہ قدیم جنسی اور جذباتی روایات کو یکسر ترک کرنے کی دعوت دیتی ہیں۔ لزبائی عورتوں کو اپنے جنسی میلان کے باعث زیادہ نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور انھیں سزا کی مستوجب سمجھا جاتا ہے، اس لیے یہ امر باعث حیرت نہیں ہے کہ لزبائی عورتیں آزادیٔ نسواں کی تحریک میں پیش پیش ہیں اور اس کی قیادت کر رہی ہیں۔ اگر آزادیٔ نسواں کا مطلب مرد کی غلامی کا جوا اتار پھینکنا ہے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ لزبائیوں نے یہ جوا اپنی گردنوں سے اتار پھینکا ہے۔

انتہا پسند لزبائی عورتیں مرد کی غلامی سے نجات پانے کے لیے نکاح نہیں کرتیں بلکہ اپنی اپنی دوگانہ سے مل کر رہتی ہیں۔ امریکہ کے طول و عرض میں 'بلائٹس کی بیٹیاں' کی تنظیمیں قائم کی گئی ہیں جو عورتوں کے حقوق کے لیے کشمکش کر رہی ہیں۔ وہ بناؤ سنگھار، نئے فیشن کے ملبوسات اور آرائش و زیبائش سے نفرت کرتی ہیں، پتلون پہنتی ہیں اور سگار پیتی ہیں۔ وہ مردوں کی طرح جملہ علوم و فنون میں امتیاز حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ ہم مرد کے لیے گڑیا بن کر نہیں رہیں گی بلکہ اسی کی طرح مستقل اور کامل شخصیت کی تعمیر کریں گی۔ ان کے خیال میں:

> لزبائی عورتیں اوائل عمر سے خود مختاری کی زندگی گزارنا چاہتی ہیں، اس لیے انھیں قدم قدم پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لزبائی عورتیں کامل شخصیت کی آرزومند ہیں اور مردوں کی ہر قسم کی محتاجی سے نجات پانا چاہتی ہیں۔ وہ اس نسوانی رول کو ترک کر دینے پر اصرار کرتی ہیں جس کے باعث عورت اب تک مرد کی غلامی میں گزر بسر کرتی رہی ہے۔

وہ لزبائی شادیوں کے حق میں دلائل دیتی ہیں اور کلیسا سے ہم جنسی شادی کے حق کو تسلیم کروانے کے لیے کشمکش کر رہی ہیں۔ انھیں بچے پیدا کرنے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ کیرولین برڈ نے بلائٹس کی بیٹیوں کے ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے کہا: ''مستقبل میں تولید کا تصرف ٹوٹ جائے گا اور معاشرۂ انسانی میں کئی قسم کے اسالیبِ حیات نمو پذیر ہوں گے۔''

امریکہ کے علمائے عمرانیات و نفسیات کے خیال میں ہم جنسیت اور لزبائی عشق کی ملک گیر اشاعت ایک معاشرتی مرض کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ ان کے خیال میں امریکی مرد آزاد عورت سے خوف زدہ ہیں اور روز بہ روز زیادہ سے زیادہ تعداد میں، ہم جنسیت سے رجوع لا رہے ہیں۔ معاشرے پر عورت حاوی ہوتی جا رہی ہے۔

آخر میں یہ دیکھنا ہے کہ ہم جنسیت اور لزبائی عشق کے اسباب کیا ہیں؟ اربابِ نظر نے تین اسباب سے بحث کی ہے؛ عضویاتی، نفسیاتی، معاشرتی۔

کرافٹ ایبنگ، ڈاکٹر مال اور پروفیسر مانٹا گیزا کے خیال میں ہم جنسی میلان خلقی اور عضویاتی ہوتا ہے۔ بلاخ نے بھی اس رائے کی تائید کی ہے۔ اس کے خیال میں بعض حالات میں جنین کے جنسی نظام میں ایسی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں کہ ہم جنسی میلان بچے کی سرشت میں نفوذ کر جاتا ہے۔ اس نظریے کے حامی ہارمون (یونانی زبان میں اس کا معنی ہے 'حرکت دینا') سے بھی دلیل لاتے ہیں۔ پہلے پہل اسٹائی ناخ نے ثابت کیا کہ خصیتین اور بیضۂ انثیٰ ہارمون پیدا کرتے ہیں جو مردانگی اور نسوانیت کے ذمے دار ہیں اور جسمانی اور ذہنی توانائی پیدا کرتے ہیں۔ پچوٹری غدود کے ہارمون پر خصیتین اور بیضہ کی فعالیت منحصر ہے۔ ہر عورت کے جسم میں مردانہ ہارمون اور ہر مرد کے جسم میں زنانہ ہارمون موجود ہوتے ہیں، خواہ وہ کتنی ہی قلیل تعداد میں ہوں۔ بعض حالات میں یہ خفتہ ہارمون زیادہ فعال ہو جاتے ہیں اور لڑکا لڑکی بن جاتا ہے یا لڑکی لڑکا بن جاتی ہے۔ لزبائی عورتوں کا جنسی نظام عام عورتوں سے مختلف ہوتا ہے اور ان کے مردانہ عناصر عام عورتوں سے زیادہ نمایاں ہو جاتے ہیں۔ ان عورتوں کا قد لمبا تڑنگا، ٹانگیں اور باہیں دبلی پتلی، کہنیاں اور گھٹنے ابھرے ہوئے، اوپر کے ہونٹ پر بال ہوتے ہیں، آواز کرخت ہوتی ہے۔ وہ مرد سے نفرت کرتی ہیں اور ان کا بظر نمایاں طور پر بڑھا ہوا ہوتا ہے۔ امردوں کے جسم کے زاویے گول اور گدرائے ہوئے ہوتے ہیں، چہرہ تر و تازہ ہوتا ہے، داڑھی مونچھوں کے بال کم ہوتے ہیں، کولھے بھاری بھرکم، کندھے گول اور سینہ بھرا بھرا ہوتا ہے۔ ان کی آواز باریک ہوتی ہے۔

جنین کے جنسی نظام میں خلل آ جانے سے بعض اوقات بچے میں مردانہ زنانہ دونوں قسم کے آلات تناسل موجود ہوتے ہیں۔ نارمل مرد اور نارمل عورت کے ہارمون میں ایک خاص تناسب و توازن موجود ہوتا ہے۔

ہم جنسیت کا سب سے موثر دفاع ایک جرمن عالم کارل ہائنرخ الرخس نے کیا تھا۔ الرخس ۱۸۲۵ء میں پیدا ہوا۔ وہ خود پیدائشی ہم جنسی تھا اور ہم جنسیت کو فطری اور قانونی فعلیت منوانے کے لیے عمر بھر جدوجہد کرتا رہا۔ اس موضوع پر اس نے کئی کتابیں تالیف کیں۔ وہ نارمل آدمی کو 'ڈیوننگ' اور ابنارمل کو 'ارننگ' کہتا ہے۔ موخر الذکر میں جو لوگ زنخے مردوں سے عشق کرتے ہیں، انھیں وہ 'مین لنگ' اور امردوں کو 'ویب لنگ' کے نام دیتا ہے۔ اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہم جنسی میلان خلقی ہوتا ہے اور ہم جنسی عورتیں مرد ذہنی، ذوقی، روحانی اور اخلاقی لحاظ سے نہ صرف نارمل آدمیوں کے ہم پلہ ہوتے ہیں بلکہ ان پر برتری بھی رکھتے ہیں۔ ان میں ذہانت، خلوص اور انسانی ہمدردی کے جذبات نمایاں طور پر موجود ہوتے ہیں اور وہ عام طور سے موسیقی اور شاعری کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ وہ خوشی اور غم سے شدید تاثر لیتے ہیں اور دوسروں کی بہ نسبت زیادہ مخلص اور پیار کرنے والے ہوتے ہیں۔ الرخس اور اس کے ہم نواؤں کی کوششوں سے فی زمانہ ہم جنسوں سے نفرت کرنے کے بجائے ان کے مسائل کو ہمدردی سے سمجھنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

معاشرتی سبب وہی ہے جسے رچرڈ برٹن نے ہم جنسیت کا واحد سبب قرار دیا تھا اور جس کا ذکر گزشتہ اوراق میں ہو چکا ہے۔ اس کے خیال میں جہاں کہیں مردوں کو عورتوں کی صحبت میسر نہ آسکے اور عورتیں مردوں سے الگ تھلگ رہیں، وہاں ہم جنسی میلان اور لزبائی عشق کو پنپنے کے مواقع مل جاتے ہیں۔ کاسپر کے الفاظ میں یہ 'اکتسابی ہم جنسیت' ہوتی ہے اور اس کی تہہ میں مجبوری کارفرما ہے جیسے کہ ایک فاقہ زدہ شخص نامرغوب شے بھی کھا لیتا ہے۔ چنانچہ صنف مخالف کی صحبت کے میسر آنے پر اس نوع کا ہم جنسی میلان بھی ختم ہو جاتا ہے۔

ہم جنسیت کے نفسیاتی سبب سے بحث کرتے ہوئے بعض علمائے تحلیل نفسی کہتے ہیں کہ ہر شخص فطری طور پر دوجنسی ہے۔ دوجنسیت کا انکشاف سب سے پہلے فیلس نے کیا تھا جس سے فرائڈ نے استفادہ کیا۔ اس کی رو سے ہر مرد کے نفس میں نسوانی اور ہر عورت میں مردانہ میلان موجود ہوتا ہے۔ بعض حالات میں ان مردانہ اور زنانہ عناصر کا توازن خلل پذیر ہو جاتا ہے جس

سے مرد میں نسوانیت اور عورت میں مردانگی ابھر آتی ہے۔ جن بچوں کی پرورش نامساعد حالات میں ہو، ان کا نفسیاتی توازن درہم برہم ہو جاتا ہے۔

فرائڈ کہتا ہے: ''میں نے کسی بھی ایک مرد یا عورت کا تجزیہ نہیں کیا جس میں ہم جنسی میلان موجود نہ ہو۔''

وہ کہتا ہے کہ ہم جنسی میلان کو دبا دیا جائے تو تشویش کی الجھن لاحق ہو جاتی ہے۔ ولہلم اسٹیکل اور کلفورڈ ایلن کی تحقیق یہ ہے کہ ہم جنسیت خلقی نہیں ہوتی بلکہ نفسیاتی نظام میں خلل پیدا ہو جانے سے نمود پذیر ہوتی ہے۔ ہیویلاک ایلس نے کہا کہ ہم جنسیت کسی بھی نفسیاتی مرض کی علامت نہیں ہے۔ اس کے خیال میں کسی ہم جنسی کو ابنارمل کہنا زیادتی ہوگی۔ بعض مرد عورت سے مایوس ہو کر یا احساس کمتری کے تحت ہم جنسی بن جاتے ہیں۔ انھیں اس بات کا اندیشہ ہوتا ہے کہ وہ عورت کی جنسی تشفی نہیں کر سکیں گے۔ بعض نوجوان لڑکیاں مرد کے خوف سے ہم جنسیت سے رجوع لاتی ہیں۔ سمون دی بوا کہتی ہے:

> ہم جنسی عورتوں کا اختلاط بظر کے مساحقے تک محدود ہوتا ہے۔ ایک نوجوان لڑکی مرد کی درشتی اور تند مزاجی سے خائف ہو کر اپنے آپ کو اپنی سے بڑی عمر کی عورت کے سپرد کر دیتی ہے۔ مردانہ قسم کی عورت میں اسے اپنے والدین کی جھلک دکھائی دیتی ہے، اس طرح نوجوان لڑکی حقیقی تجربے سے روگردانی کر کے عالم خیال بسا لیتی ہے۔ اس کے یہاں تخیل اور حقیقت آپس گڈمڈ ہو جاتے ہیں۔

ایڈلر اور اس کے مقلدین کا نظریہ یہ ہے کہ اپنی کمتری کے احساس کی تلافی کے لیے بعض ہم جنس احساس برتری میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور جعلی فن کار اور لا ابالی قلندر بن بیٹھتے ہیں۔ اپنی اس نوع کی زندگی کے جواز میں وہ دلیل یہ دیتے ہیں کہ دنیا کے عظیم شاعر اور فن کار سبھی ہم جنسی ہی تھے۔

مغرب ہم جنسیت کو خلل ذہن کی علامت یا کج روی نہیں سمجھا جاتا نہ ایک ہم جنسی یا لزبائی کو مریض کہا جاتا ہے۔ یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ معاشرے کی نفرت اور تعدی ہم جنسوں کو شدید احساس گناہ میں مبتلا کر دیتی ہے جو انھیں ذہنی لحاظ سے ابنارمل بنا دیتا ہے۔ اگر معاشرہ ہم جنسوں کو رد کرے، ان سے نفرت نہ کرے تو وہ اپنے آپ کو صحت مند خیال کرنے لگیں گے۔ قانون کا

خوف بھی ہم جنسوں میں احساس جرم پیدا کر دیتا ہے۔ علمائے جنسیات کے خیال میں ہم جنسوں کو بھرپور، بامسرت زندگی گزارنے کے مواقع بہم پہنچانے کے لیے ضروری ہے کہ معاشرے کے تعصّبات کو دور کیا جائے اور قوانین میں مناسب ترمیم کر لی جائے۔ اطالیہ، فرانس اور برطانیہ میں ہم جنسی اختلاط کو قانوناً مباح کر دیا گیا ہے، بشرطیکہ فریقین کی رضامندی مشمول ہو۔

ہم جنسیت جرم نہیں

وجاہت مسعود

بھارتی سپریم کورٹ نے اپنا ۲۰۱۳ء کا فیصلہ واپس لیتے ہوئے ہم جنس پرستی کو جرائم کی فہرست سے نکال دیا ہے اور کہا ہے کہ ''جنسی رجحان کی بنیاد پر کسی قسم کا تعصب برتنا بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہے''۔ سپریم کورٹ نے کہا ہے کہ آئین ایک زندہ دستاویز ہے اور ناانصافی سے بچنے اور تفاوت سے جان چھڑانے کے لیے اس کی عملی تفہیم کی جانی ہوگی۔ سماجی اخلاقیات کو بنیاد بنا کر کسی ایک بھی فرد کے بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزی نہیں کی جاسکتی ہے۔ برطانوی راج کے دور کے سیکشن ۳۷۷ کے تحت ہم جنسی پرستی کو 'غیر فطری' قرار دے کر اس پر دس سال قید کی سزا دی جاتی تھی۔ عوامی جمہوریہ چین نے ۱۹۹۷ء میں ہم جنس پرستی کو جرائم کی فہرست سے خارج کر دیا تھا۔ انڈیا کے سپریم کورٹ کے اس فیصلے کے بعد ایشیائی باشندوں کی اکثریت کے لیے ہم جنس پرستی ایک جرم نہیں رہی۔ تاہم بھارت سمیت براعظم ایشیا میں ہم جنس پرستوں کے خلاف مار پیٹ، جنسی حملے، بلیک میلنگ، بدمعاشی اور استحصال کے واقعات عام ہیں۔

۲ جولائی ۲۰۰۹ء کو ہندوستان میں دہلی ہائی کورٹ نے ایک اہم قانونی مقدمے ناز فاؤنڈیشن بنام دہلی سرکار میں فیصلے سناتے ہوئے ہم جنسوں کے درمیان تعلقات کو جائز قرار دے دیا تھا۔ بھارتی عدالت کے اس فیصلے سے ہندوستان کے لاکھوں ہم جنس پرستوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی تاہم ملک کی تقریباً تمام مذہبی تنظیموں نے اس فیصلے کی شدید مخالفت کی اور اس معاملے کو سپریم کورٹ میں چیلنج کیا۔ بھارتی سپریم کورٹ نے ۱۱ دسمبر ۲۰۱۳ء کو دہلی ہائی کورٹ کے فیصلے کو

معطل کرتے ہوئے یہ معاملہ پارلیمنٹ کے سپرد کر دیا تھا۔ اس فیصلے کے خلاف نظر ثانی کی درخواست پر کارروائی کرتے ہوئے بھارتی سپریم کورٹ نے ۲ فروری ۲۰۱۶ء کو قانون تعزیرات ہند کی دفعہ ۳۷۷ پر تفصیلی سماعت کے لیے چیف جسٹس دیپک مسرا کی سربراہی میں ایک پانچ رکنی بنچ قائم کر دیا۔ اس بنچ نے ۶ ستمبر ۲۰۱۸ء کو دفعہ ۳۷۷ کو کالعدم قرار دیتے ہوئے بھارت میں ہم جنسیت کو جرائم کی فہرست سے خارج کر دیا ہے۔

رواں سال کے آغاز میں عدالت نے کہا کہ عوام کا کوئی حلقہ یا کچھ لوگ صرف اس وجہ سے خوف میں زندگی نہیں گزار سکتے کہ وہ اپنی پسند کے مطابق رہنا چاہتے ہیں۔ نہ ان کی پسند قانون کی حدود کو پار سکتی ہے اور نہ قانون، آئین کی شق ۲۱ کے تحت انھیں حاصل اختیارات کو سلب کر سکتا ہے۔ قبل ازیں گذشتہ برس اگست میں بھی سپریم کورٹ نے 'پرائیویسی' کے سوال پر فیصلہ دیا تھا کہ 'سیکس کے معاملے میں پسند ناپسند لوگوں کا نجی معاملہ ہے...'

بھارتی حکومت کا ردعمل کسی قدر محتاط ہے۔ عدالت نے اپنے فیصلے میں کہا ہے کہ قانون تعزیرات ہند کی دفعہ ۳۷۷، جس کے تحت ہم جنسوں کے درمیان جنسی فعل ایک قابل سزا جرم ہے، آئین کے منافی ہے۔ عدالت نے اپنے فیصلے میں لکھا ہے کہ دفعہ ۳۷۷ سے فرد کی انفرادی آزادی مجروح ہوتی ہے جو کہ ہر شخص کا بنیادی حق ہے، چنانچہ دو بالغ ہم جنسوں میں اپنی مرضی سے جنسی تعلق جرم نہیں ہے۔ البتہ عدالت نے زبردستی جنسی فعل یا ۱۸ برس سے کم عمر بچوں سے جنسی فعل پر دفعہ ۳۷۷ کے اطلاق کو برقرار رکھا ہے۔

قانون تعزیرات ہند کی دفعہ ۳۷۷ ایک سو اٹھاون برس پرانا ایک قانون ہے جس کے تحت صرف مرد اور عورت کے درمیان روایتی جنسی تعلق ہی کو جائز جنسی فعل مانا گیا ہے، جب کہ دیگر تمام طریقوں کو نہ صرف غیر فطری قرار دیا گیا ہے بلکہ انھیں غیر قانونی اور قابل سزا فعل کے زمرے میں رکھا گیا ہے۔ ہم جنسیت کی پرچارک اور حقوق انسانی کی تنظیمیں ایک عرصے سے حکومت سے یہ مطالبہ کر رہی تھیں کہ وہ دفعہ ۳۷۷ کو ختم کر دے۔ ان کی دلیل تھی کہ ہم جنسیت سماج کی ایک حقیقت ہے اور اسے بدلتے ہوئے علمی، تمدنی اور ثقافتی حالات میں قانونی طور پر قبول کیا جانا چاہیے۔

جنوبی ایشیا میں بھارت پہلا ملک ہے جہاں ہم جنسیت کو مجرمانہ فعل کی بجائے معمول کی انسانی سرگرمی قرار دیا گیا ہے۔ البتہ چین ۱۹۹۷ء میں ہی اس معاملے پر قانون سازی کر چکا ہے۔

اس سے خطے میں سری لنکا، نیپال، بنگلہ دیش اور پاکستان میں قانون، سماجی رویوں اور اجتماعی مکالمے پر گہرے اثرات مرتب ہوں گے۔ بھارتی سپریم کورٹ کے فیصلے کے خالص قانونی نتائج کے علاوہ یہ بات بھی اہم ہے کہ عدالت نے اپنے فیصلے میں جن اقدار، قانونی نظائر اور معاشرتی نصب العین سے استخراج کیا ہے، وہ جنوبی ایشیا میں ایک نئے سماجی منظر کے رونما ہونے کا اشارہ دیتے ہیں۔ عدالت نے ۱۹۴۶ء میں آل انڈیا کانگرس کی طرف سے قرارداد مقاصد پیش کیے جانے کے موقع پر پنڈت نہرو کی تقریر سے استنباط کیا ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ آزاد بھارت کے بانیوں کا آدرش ایک ایسا بھارت تھا جہاں تمام شہریوں کو آزادیوں اور حقوق سے مستفید ہونے کے یکساں مواقع میسر ہوں۔ عدالت نے رائے دی ہے کہ قانون تعزیرات ہند کی دفعہ ۳۷۷ شہریوں کے مابین جنسی ترجیحات کی بنا پر امتیازی سلوک کے مترادف ہے، چنانچہ یہ قانون بھارتی آئین کی دفعات ۱۴، ۱۵اور ۲۱ میں دیے گئے بنیادی حقوق سے متصادم ہے۔

قانون تعزیرات ہند ۱۸۶۰ء میں مدون کیا گیا تھا۔ اس کا مسودہ بنیادی طور پر لارڈ میکالے نے تیار کیا تھا۔ تب انگلستان پر وکٹورین اخلاقیات کا غلبہ تھا۔ وکٹورین اخلاقیات نظم و ضبط اور معاشرتی بندشوں کو انسانی خوشیوں پر ترجیح دیتی تھیں۔ ناگزیر طور پر قانونی تعزیرات ہند پر بھی اسی اخلاقیات کی چھاپ تھی۔ گزشتہ سو برس میں دنیا بھر میں ہم جنسیت کے بارے میں علمی، طبی، قانونی اور معاشرتی رویوں میں بنیادی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ بھارت میں عملی طور پر گزشتہ تیس برس میں کسی شہری کو دفعہ ۳۷۷ کی خلاف ورزی پر سزا نہیں دی گئی۔ تاہم بدعنوان پولیس اہلکار اس قانون کی مدد سے شہریوں کو ہراساں کرتے تھے۔ نیز قانونی طور پر تحفظ نہ ملنے کی وجہ سے ہم جنسیت کا رجحان رکھنے والے شہری بالخصوص کم عمر لڑکے اور لڑکیاں مجرمانہ رویوں، نفسیاتی پیچیدگیوں اور ذہنی دباؤ کا شکار ہوتے تھے۔ اس دوران اقوام متحدہ نے بھی متعدد مواقع پر بھارتی حکومت کو تجویز دی کہ ہم جنسیت کو قانونی تحفظ دینے سے ایڈز جیسے مرض کے پھیلاؤ پر موثر طریقے سے قابو پایا جا سکتا ہے کیوں کہ تجربے سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ جن ممالک میں غیر ضروری قانونی رکاوٹیں موجود نہیں ہیں، وہاں ایڈز کے بارے میں عوامی آگہی نیز حفاظتی تدابیر تک باآسانی رسائی کے باعث ایڈز کے خلاف مہم چلانا کہیں زیادہ آسان ثابت ہوتا ہے۔ تاہم بھارت میں مختلف حکومتیں متوقع عوامی ردعمل نیز مذہبی تنظیموں کے احتجاج کے خوف سے اس ضمن میں موزوں اقدام کرنے سے گریزاں رہی ہیں۔

بھارت میں جنسی صحت کے حوالے سے کام کرنے والی ایک این جی او ناز فاؤنڈیشن نے ۲۰۰۳ء میں دہلی ہائی کورٹ میں مقدمہ دائر کیا تھا کہ تعزیرات ہند کی دفعہ ۳۷۷ کا ہم جنسیت پر اطلاق ختم کر دیا جائے۔ تاہم دہلی ہائی کورٹ نے فیصلہ دیا کہ ناز فاؤنڈیشن کو اس قانون سے متاثرہ فریق قرار نہیں دیا جا سکتا چنانچہ یہ مقدمہ تکنیکی بنیاد پر خارج کر دیا گیا۔ اس میں ستم ظریفی یہ تھی کہ بھارت میں گزشتہ دو عشروں میں کسی شہری کو ہم جنسیت کے الزام میں سزا نہیں دی گئی۔ چنانچہ ایسے درخواست گزار کا تلاش کرنا محال تھا جسے اس قانون سے براہ راست متاثر فریق قرار دیا جا سکے۔ ناز فاؤنڈیشن نے اس تناظر میں سپریم کورٹ میں اپیل دائر کی۔ سپریم کورٹ نے ناز فاؤنڈیشن کو عوامی مفاد کے اصول کی بنا پر دفعہ ۳۷۷ کے خلاف جائز فریق تسلیم کر لیا اور دہلی ہائی کورٹ کو حکم دیا کہ اس مقدمے کی دوبارہ سماعت کی جائے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ دہلی ہائی کورٹ میں سماعت کے دوران بھارت کی وزارت داخلہ کا موقف یہ تھا کہ دفعہ ۳۷۷ کو برقرار رکھا جائے جب کہ بھارت کی وزارت صحت اس قانون کو ختم کرنے کی حامی تھی۔ یہ امر قابل ذکر ہے ۲۰۱۶ء میں سپریم کورٹ میں نظر ثانی کی درخواست پانچ ہم جنس پرستوں نے دائر کی تھی جن کا کہنا تھا کہ وہ خوف کے سائے میں زندگی گزار رہے ہیں۔

اس مقدمے کی سماعت کے دوران بھارت میں ہم جنسی حقوق کی تنظیموں کے علاوہ دانشوروں کی ایک بڑی تعداد نے بھی اپنی آواز بلند کی۔ نوبل انعام یافتہ بھارتی ماہر معیشت امرتا سین اور عالمی شہرت یافتہ بھارتی مصنف وکرم سیٹھ نے ایک مشترکہ اپیل جاری کی جس میں عدالت سے استدعا کی گئی تھی کہ اس مقدمے کا انسانی بنیادوں پر فیصلہ کر کے بھارتی سماج کو آگے بڑھنے کا موقع دیا جائے۔ اس دوران میں بھارت کے بڑے شہروں مثلاً دہلی، ممبئی، کلکتہ، بنگلور اور چنئی میں پہلی مرتبہ ہزاروں ہم جنس پرستوں نے مظاہرے کیے اور دفعہ ۳۷۷ کے خاتمے کا مطالبہ کیا۔ بالآخر ۶ ستمبر ۲۰۱۸ء کو بھارتی سپریم کورٹ نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے قرار دیا کہ بالغ شہریوں کے درمیان باہم رضامندی سے کیے جانے والے جنسی فعل پر دفعہ ۳۷۷ کا اطلاق نہیں ہوتا۔

بھارتی عدالت کا یہ فیصلہ قانونی تاریخ میں وولفنڈن کمیشن رپورٹ کے تناظر میں دیکھا جانا چاہیے۔ مختلف قوموں کے معاشرتی اور قانونی ارتقا میں بہت سے ایسے قوانین تشکیل دیے گئے جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنی افادیت کھو بیٹھے۔ تاہم یہ قوانین بدستور کتاب قانون کا حصہ

رہے۔مثال کے طور پہ مذاہب کی توہین کے قوانین بہت سے ممالک میں آج بھی موجود ہیں لیکن انھیں عملی طور پر غیر موثر سمجھا جاتا ہے۔اسی طرح برطانیہ میں بھی جنسی افعال کے حوالے سے مختلف قوانین موجود تھے جن پر عمل نہیں کیا جاتا تھا تاہم ۱۹۵۰ء کی دہائی میں ذرائع ابلاغ کی ترقی کے ساتھ ساتھ شہریوں خاص طور پر معروف سیاست دانوں، فنکاروں اور دانشوروں کی ذاتی زندگی میں مداخلت کا رجحان بڑھ گیا۔ یکے بعد دیگرے بہت سے نامور شہریوں کے بارے میں اسکینڈل سامنے آئے۔ناگزیر طور پر مخالفین نے قانونی کارروائی کا مطالبہ کیا۔چنانچہ ان قوانین کی افادیت پر سوالات پیدا ہوئے۔بالآخر برطانوی حکومت نے لارڈ وولفنڈن کی سربراہی میں ایک کمیشن قائم کیا جس نے گہرے غور و خوض کے بعد ۴ ستمبر ۱۹۵۷ء میں اپنی رپورٹ (Wolfenden Report) پیش کی۔

وولفنڈن کمیشن کی رپورٹ کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ ''قانون کا اصل مقصد امن وامان قائم رکھنا نیز عام شہری کو دوسرے افراد کے ہاتھوں نقصان، استحصال یا بدعنوانی سے تحفظ فراہم کرنا ہے۔ہماری رائے میں قانون کا کام شہریوں کی نجی زندگی میں مداخلت کرنا یا معاشرتی طرز عمل کا کوئی خاص نمونہ نافذ کرنا نہیں ہے۔''

> The law's function is to preserve public order and decency, to protect the citizen from what is offensive or injurious, and to provide sufficient safeguards against exploitation and corruption others...It is not, in our view, the function of the law to intervene in the private life of citizens, or to seek to enforce any particular pattern of behaviour.

وولفنڈن رپورٹ گزشتہ ۶۰ برس میں انفرادی شہری آزادیوں کے بارے میں تشکیل پانے والے تمام جدید قوانین کی اساس کہلاتی ہے۔اسی رپورٹ کی روشنی میں ۱۹۶۷ء میں برطانیہ میں ہم جنسیت کو مجرمانہ افعال کی فہرست سے خارج کیا گیا۔دراصل وولفنڈن رپورٹ قانون کے ارتقا میں دو بنیادی اصولوں کا بیان ہے۔اول یہ کہ قانون کو جرم سے غرض ہے، گناہ سے نہیں۔

قانون کا مقصد شہریوں کو گناہ سے روکنا یا نیکی کی ترغیب دینا نہیں بلکہ معاشرے سے جرائم کو ختم کرنا ہے۔ گناہ اور نیکی کے تصورات مذہب کی اقلیم سے تعلق رکھتے ہیں۔ چنانچہ ان پر بات کرنا مذہبی پیشواؤں کا کام ہے۔ جدید ریاست عقائد کی بنیاد پر شہریوں میں امتیاز نہیں برتتی۔ ایک مذہب کے پیروکاروں کے لیے جو افعال گناہ کے ذیل میں آتے ہیں، عین ممکن ہے دوسرے مذہب کے پیروکاروں میں انھیں گناہ نہ سمجھا جاتا ہو۔ چنانچہ ریاست کا کام قوانین کی مدد سے جرم روکنا ہے۔ گناہ کے تعین کا کام فرد کے ضمیر پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ دوسرا اصول جرم کی تعریف سے تعلق رکھتا ہے۔ جدید قانونی لغت میں صرف وہی فعل جرم قرار پاتا ہے جس سے کسی دوسرے شہری کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو۔ دو بالغ شہری باہم رضامندی سے اپنی خلوت میں جو افعال کرتے ہیں ان سے کسی تیسرے شہری کو جسمانی، ذہنی یا مالی اعتبار سے کسی نقصان کا اندیشہ نہیں۔

ہم جنسیت کے بارے میں مختلف ادوار اور مختلف معاشروں میں مختلف رویے رائج رہے ہیں۔ انسانی تاریخ میں ایسے معاشرے بھی موجود رہے ہیں جہاں ہم جنسیت پر سخت ترین سزائیں دی جاتی تھیں۔ ایسے معاشرے بھی انسانی تاریخ کا حصہ ہیں جہاں ہم جنسیت کو معمولات زندگی کا حصہ سمجھا جاتا تھا۔ ایسے معاشروں کی بھی کمی نہیں رہی جہاں ہم جنسیت کو کھلے بندوں تحفظ دینے کی بجائے محض نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔ ۱۹ ویں صدی کے اواخر میں نفسیات کی سائنس کے فروغ سے ہم جنسیت کا مطالعہ بھی شروع ہوا۔ ابتدائی طور پر ماہرین نفسیات ہم جنسیت کو کج روی قرار دیتے تھے۔ ۱۹۵۲ء میں امریکا کے ادارہ برائے نفسیاتی امراض نے اپنے نصاب میں ہم جنسیت کو ایک مرض قرار دیا۔ تاہم ۱۹۷۳ء وہ پہلا برس تھا جب اسی ادارے نے اپنے نصاب پر نظر ثانی کرتے ہوئے ہم جنسیت کو انسانی امراض کی فہرست سے خارج کیا۔

اس دوران عمرانیاتی مطالعوں سے واضح ہوا کہ تمام معاشروں میں ایک خاص تعداد میں ہم جنس پرست پائے جاتے ہیں۔ اس ضمن میں ۱۹۵۳ء میں شائع ہونے والی 'کنسے رپورٹ' (Kinsey Report) نے اہم کردار ادا کیا۔ ڈاکٹر کنسے نے پہلی مرتبہ سائنسی انداز میں واضح کیا کہ کسی بھی انسانی معاشرے میں دو سے لے کر دس فیصد تک ہم جنس پرست موجود ہوتے ہیں۔ اس میں صنف کی قید نہیں۔ یہ افراد بیک وقت اپنے ہم جنسوں اور جنس مخالف کی طرف میلان بھی رکھ سکتے ہیں اور کلی طور پر صرف اپنے ہم جنسوں میں کشش بھی محسوس کر سکتے ہیں۔ اسی طرح کم عمری سے لے کر بلوغت کے بعد تک کسی بھی مرحلے میں اپنی جنسی ترجیحات دریافت کر

سکتے ہیں۔ یہ افراد اپنی جنسی ترجیحات پر اسی طرح شعوری اختیار نہیں رکھتے جس طرح انسان اپنے خدوخال، جلد کے رنگ اور بالوں کی ساخت پر اختیار نہیں رکھتے۔

مطالعے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہم جنسی رجحانات رکھنے والے افراد کو مجرمانہ میلانات کا حامل سمجھنا غلط ہے۔ اوسط درجے کے انسانوں کی طرح ہم جنس پرستوں کے باہم تعلقات میں بھی بہت تنوع پایا جاتا ہے۔ یہ لوگ پائیدار تعلقات اور ذمہ دارانہ معاشرتی کردار کے پوری طرح اہل ہیں۔ البتہ سماجی امتیاز، عدم تحفظ اور اخلاقی احتساب کے مسلسل خوف کے باعث ان کے نفسیاتی رویوں میں پیچیدگیاں جنم لے سکتی ہیں۔ جن کا تدارک جسمانی سزاؤں سے نہیں بلکہ انھیں معمول کی زندگی کے مواقع فراہم کرنے سے کیا جا سکتا ہے۔

کچھ عرصہ پہلے تک عام خیال تھا کہ علاج معالجے کی مدد سے ہم جنسی رجحانات رکھنے والے افراد کو معمول کی جنسی زندگی کی طرف واپس لایا جا سکتا ہے لیکن تجربے سے معلوم ہوا کہ ہم جنسیت کے حامل افراد کی جنسی ترجیحات کو طبی علاج معالجے سے تبدیل نہیں کیا جا سکتا بلکہ ایسا کرنے سے ان میں دوہری شخصیت اور اپنی ذات پر عدم اعتماد جیسے رجحانات پیدا ہونے کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ زیادہ بہتر یہ ہے کہ ان افراد کو صحت مند لیکن مختلف شناخت کے حامل شہری سمجھا جائے جو اپنی تخلیقی، پیداواری، علمی اور تمدنی صلاحیتوں سے انسانی معاشرے میں بھرپور کردار ادا کر سکتے ہیں۔

بھارتی سپریم کورٹ نے اپنے فیصلے سے ہم جنسیت کو فروغ نہیں دیا بلکہ صرف یہ کیا ہے کہ قانون کی از سرِ نو تعریف متعین کر کے حقیقی جرم یعنی کسی شہری کی رضامندی کے بغیر اس سے جنسی فعل نیز ایسے کم عمر افراد کے ساتھ جنسی افعال کو جرم قرار دیا ہے جس سے معاشرے میں ضرر کا اندیشہ ہے۔ اسی طرح عدالت نے لاکھوں انسانوں کو ناجائز ذہنی دباؤ، معاشرتی امتیاز، احساس عدم تحفظ اور غیر ضروری مجرمانہ ذہنیت سے نجات حاصل کرنے کا راستہ فراہم کیا ہے۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق بھارت میں ہم جنس پسند افراد کی تعداد ۲۵ لاکھ ہے۔ بھارت کے قومی لا کمیشن نے ۲۰۰۰ء میں قانون تعزیرات ہند کی دفعہ ۳۷۷ ختم کرنے کی سفارش کی تھی تاہم مختلف سیاسی اور معاشرتی وجوہ کی بنا پر اس سفارش پر اب تک عمل نہیں ہو سکا تھا۔

بھارتی سپریم کورٹ کے فیصلے میں ایک خوشگوار پہلو یہ ہے کہ اس سے جنوبی ایشیا کے دوسرے ممالک میں بھی ایک ضروری بحث شروع ہوگی۔ بھارت کی معیشت تیزی سے ترقی کر

رہی ہے۔تعلیم یافتہ متوسط طبقے میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ اصولی طور پر قانون کا لفظ کسی معاشرے کو راتوں رات تبدیل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تاہم اگر معاشرتی ارتقا موزوں نقطے پر پہنچ چکا ہو تو قانون میں مناسب تبدیلی معاشرتی تبدیلی کی رفتار بڑھا دیتی ہے۔ بھارت میں وشوا ہندو پریشد، راشٹریہ سیوک سنگھ، اکالی دل اور دوسری بہت سی انتہا پسند مذہبی تنظیمیں موجود ہیں، تاہم بھارتی معاشرے میں جنم لینے والی تبدیلیوں کا اندازہ اس خبر سے لگایا جا سکتا ہے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے طالب علموں نے کچھ برس قبل اپنی درس گاہ میں ایک ڈرامے کے ذریعے ہم جنس پرستوں کے لیے یکساں شہری، قانونی، معاشی اور سیاسی حقوق کا مطالبہ کیا ہے۔ جامعہ ملیہ کی بنیاد مولانا محمد علی جوہر نے رکھی تھی اور ڈاکٹر ذاکر حسین جیسے جید عالم برسہا برس تک اس درس گاہ کے مہتمم رہے تھے۔ جامعہ ملیہ دہلی ہندوستان کے تعلیمی نقشے پر مضبوط مذہبی شناخت رکھتی ہے۔ اگر اس درس گاہ کے طالب علم لڑکے اور لڑکیاں ہم جنسیت کے بارے میں عمومی رویوں پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس کرتے ہیں تو جان لینا چاہیے کہ اس خطے کے باشندے تمدنی طور پر ایک نئے عہد میں داخل ہونے کے لیے تیار ہو چکے ہیں۔

ہم جنس پرستی اور اسلامی ادب

راشد یوسف زئی

''غیر شادی شدہ ہم جنس پرست کی زیادہ سے زیادہ سزا دس کوڑے ہیں''۔
[امام ابن حزم الظاہری الاندلسی، بحوالہ 'نزہتہ الالباب فی ما لا یوجد فی الکتاب' از امام التفاشیؒ]

انگریزی ادب میں آسکر وائلڈ ایک ایسے مقام پر کھڑا ہے جسے نہ وکٹورین کہا جاتا ہے نہ جدید۔ وہ خود ایک جداگانہ کلاسک ہے۔ وائلڈ کا ہر جملہ ہیرے کی طرح قلمی اور چمکدار ہوتا ہے۔ ڈراموں اور شاعری کے علاوہ ایک ناول لکھا ہے، '*A Picture of the Dorian Gray*' جو کرارے دار انگریزی اسلوب کے طالب علموں کے لیے واجب التقلید ہے۔ خود انتہائی حسین تھا اور لارڈ ڈگلس کوینز بیری کے حسین ترین بیٹے لارڈ الفرڈ ڈگلس کے ساتھ ہم جنس پرستانہ تعلق کے بنا پر متہم ہوا اور الزم لڑکے کے والد نے خود لگایا۔ عدالت نے وائلڈ کو ہم جنس پرستی کی سزا میں دو سال کے لیے جیل بھیجا۔ رہائی پر تمام برطانیہ نے وائلڈ سے سوشل بائکاٹ کیا۔ بھوک، افلاس اور بھیک مانگتے ہوئے فرانس اور برطانیہ کے بارڈر پر بھکاری کی حالت میں ۱۹۰۰ء میں فوت ہوا۔ جہاں تیرہ سو سال بعد بھی مغربی دنیا کی تنگ نظری کی یہ حالت تھی، وہاں عرب اسلامی دنیا میں ہزار سال قبل ہم جنس پرست ادب باقاعدہ اور مربوط شکل اختیار کر چکا تھا۔ نہ صرف جاحظ، علامہ بدرالدین عینی، ابن ہندو، علامہ تفاشی جیسے نابغے مردانہ ہم جنس پرستی پر علیحدہ کتابیں لکھ چکے تھے

بلکہ عورتوں کی ہم جنس پرستی، Lesbianism یا 'سحاق' پر تیسری صدی ہجری میں ابوالعنبس السیمر ی نے مخصوص تصنیف 'کتاب السحاقات' لکھی تھی۔

ہم جنس پرستی اگرچہ جدید میڈیکل سائنس اور نفسیات کے مطابق نہ غیر فطری ہے نہ گمراہی، ایک صدی قبل ظاہراً مذموم ومعتوب ضرور تھی۔ اور یہ عتاب 'لواطت' کے لفظ کی قوم لوط سے بیجا نسبت کی وجہ سے تھی۔ راقم کے خیال میں لواط کا تعلق 'لطاء' سے ہے۔ 'لطاء' کا معنی ہے چمٹ جانا۔ عربی محاورہ ہے 'لاط الشیء بقلبه': کسی چیز کا دل کے ساتھ چمٹ جانا اور عاشق کردینا۔ 'هو الوط بقلبی': میرا دل اس پہ فریفتہ ہوا۔ 'لاط قاضی فلانا بفلان': قاضی کا کسی کو کسی سے نسباً وابستہ کرنا۔ 'لوطه بالطیب': خوشبو لگانا۔ 'استلاط الولد': کسی کو بیٹا بنانا۔ مرور زمانہ اور لفظی ومعنوی مشابہت سے لواط اور لواطت معیوب معنوں میں مستعمل ہونے لگا۔ عربی میں ہم جنس پرستی کے اصطلاحات کافی دلچسپ ہیں مگر یہ بحث پھر کبھی۔

عوامی عربی میں فاعل ہم جنس پرست (Active Agent) کو لائط، لوطی، ملوط کہتے ہیں۔ جب کہ مفعول ہم جنس پرست (Passive Agent) کو 'مئبون' اور اس کے فعل کو 'اُبنَ'' جب کہ مصر و مراکش میں 'حاوی... جمع حیوی' مستعمل ہے تاہم زیادہ معروف لفظ مخنث رہا ہے۔

قران مجید میں ہم جنس پرستی کی کسی سزا کا ذکر نہیں۔ مابعد کی روایات میں بھی کافی ابہام ہے۔ فقہا بالکل متفق نہیں۔ جاحظ نے 'مفاخرہ' میں خلیفہ اول، عبداللہ ابن زبیر، عبداللہ ابن عمر اور ہشام بن عبدالملک سے مختلف روایات نقل کی ہیں۔ نویری نے 'النہایۃ' میں ہم جنس پرستی کی تمام روایات اور فقہا کی آرا جامعیت کے ساتھ نقل کرنے کے بعد اپنی رائے لکھی ہے، 'اقتلوا الفاعل والمفعول به'۔ مگر یہ النویری کی اپنی رائے ہے۔ منطق کی کتاب 'قطبی' کے ہمارے استاد مولانا بحر العلوم فرماتے تھے کہ ہم جنس پرستی کی اسلام میں کوئی سزا نہیں۔

عربی دنیا میں ہم جنس پرستی قبل از اسلام رائج تھی جس کا ثبوت امام المیدانی کے منقول محاورے ہیں۔ 'الواط من'، میدانی نے ایک محاورہ نقل کیا ہے: 'الواط من الدب'۔ اگرچہ 'دب' ریچھ کو کہا جاتا ہے تاہم یہاں 'دب' اسم معرفہ ہے۔ جاہلی روایات میں ذوانواس بادشاہ نے ذوشناطر کو اس لیے قتل کیا کہ وہ اس کی جنسی فرمائشوں سے تنگ آ گیا تھا۔ تاہم عربی ہم جنسی ادب کا باقاعدہ آغاز عربی نثر کے شہنشاہ اور امام المعقولات جاحظ سے ہوتی ہے۔ جاحظ کا پہلا رسالہ 'مفاخرت الجواریء والغلمان' اور دوسری تصنیف 'الرسالہ فی تفضیل البطن علی

الظهر ' دونوں ہم جنس پرستی پر ہیں۔ عربی دان حضرات موخرالذکر کے رنگین نام سے نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں۔

لڑکیوں کے شائقین کی لڑکوں کے شائقین پر برتری۔

یہ رسالہ عربی مزاحیہ نثر کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ جدید میڈیکل سائنس نے ہم جنس پرستی کا فطری عمل ہونے کا یہ ثبوت بھی دیا ہے کہ یہ عمل جانوروں میں بھی ہے۔ جاحظ نے صدیوں قبل 'کتاب الحیوان' میں ایک ضرب المثل نقل کیا ہے 'الواط من الدیك'، مرغ سے زیادہ ہم جنس پرست۔ اگرچہ 'دیک' آدمی کا نام بھی ہوسکتا ہے۔ صفحہ ۲۰۴ پر جاحظ نے بصرہ کی ایک 'فرس مئبون' یا مفعول گھوڑے کی کہانی نقل کی ہے جو نر گدھوں، خچروں اور گھوڑوں کے پیچھے پڑھ کے اپنی ہم جنسی تسکین کرتا تھا۔ مسعودی نے 'مروج الذھب' میں ایک جانور 'عضار' کا نام لکھا ہے جو سامنے آنے والے پر حملہ آور ہوتا جس کے بعد وہ بندہ مئبونن بن کے مرجاتا۔ (کمزور اردو کی بنا پر راقم اس لفظ کے ترجمہ سے قاصر ہے)

جاحظ نے 'مفاخرہ' میں قبیلہ بنی خزاعہ کے ایک مولی، مامون بن زید بن ثوران کے بطور لوطی ضرب المثل بننے کا واقعہ نقل کیا ہے جس کو قاضی وانتظامیہ نے کوئی سزا نہ دی۔ جاحظ نے ایک بچہ باز اور عام جنسی ذوق والے کا مناظرہ بھی نقل کیا ہے جس کے آخر میں بچہ باز بحث سمیٹتے ہوئے کہتا ہے: ''عورتوں کی محبت پرانے عرب بدوؤں اور اجڈ احمق تہذیب کی علامت ہے۔ جو لوگ اس دنیا اور اعلیٰ تہذیب یافتہ معاشرے کے لطیف احساسات کے ادراک کے قابل نہ ہوں، وہ بچہ بازی کا مزہ کیا جانیں۔'' (مفاخرہ، ص۱۱۶)

مفسرین قرآن نے حضرت یوسفؑ کے واقعات کی تفسیر میں 'عزیز مصر' کی شخصیت کے تعین کے حوالے سے مختلف روایات نقل کی ہیں۔ مابعد کے علمائے تفسیر کے مطابق بائبل کے Potiphar ہی عزیز مصر ہے۔ عطفیر (درست عربی لفظ شاید 'قطفیر' ہو) کو طبری، زمخشری، بیضاوی نے اپنی تفاسیر اور ثعالبی نے 'قصص الانبیا' میں انسانیت کے تین دانا ترین اشخاص 'افرس الناس' میں سے ایک لکھا ہے۔ (باقی دو حضرت شعیبؑ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ)۔ انھی علمائے تفسیر نے مزید لکھا ہے کہ قطفیر کی موت کے بعد جب زلیخا کا نکاح حضرت یوسفؑ سے ہوا تو وہ باکرہ (Virgin) تھی۔ علمائے تفسیر حضرت زلیخا کے بکارت کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے کافی مخمصے کے شکار ہوئے ہیں۔

امام کسائی نے 'قصص الانبیا' میں لکھا ہے کہ عزیز مصر زیادہ شرابی (عناب) ہونے کی بنا پر 'قوت باہ' سے محروم ہو چکے تھے۔ طبری نے مختلف روایات کا تنقیدی جائزہ لینے کے بعد فیصلہ اس روایت پہ کیا ہے کہ 'عزیز مصر ہم جنس پرست تھے'! آخر ایسی بحث کی حاجت کیا تھی؟ تفاسیر کی بات آ گئی، راقم کو قاضی ثنااللہ پانی پتی کی تفسیر مظہری بہت پسند ہے۔ قاضیؒ نے اپنے پیر مرزا مظہر جان جاناںؒ سے عقیدت کی بنا پر اپنی تفسیر کا نام بھی 'تفسیر مظہری' رکھا۔ مرزا مظہر جان جاناںؒ ایک لڑکے پر عاشق تھے جن کا نام عبدالحئی تاباں تھا۔ عاشق و معشوق دونوں اردو کے شعرا بھی تھے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے 'آبِ حیات' میں دونوں کا ذکر جدا جدا ابواب میں کیا ہے۔ امام ابن حزم الظاہری نے اپنی شعری تصنیف 'طوق الحمامہ' اور یاقوت نے 'معجم الادبأ' میں معتبر روایت نقل کی ہے کہ قرطبہ کے امام النحو واللغت احمد بن کلیبؒ ایک لڑکے کے عشق کے درد سے فوت ہو گئے تھے۔ یاقوت نے الروحاء کی ایک کتاب فروش سعد کا واقعہ نقل کیا ہے جس نے عیسیٰ نامی ایک مسیحی لڑکے کے عشق میں اپنے املاک کو آگ لگائی اور صحرا کا راستہ لیا۔ حافظ سخاوی نے 'الضوء لامع' میں اور سیوطی نے 'تدریب الراوی' میں ابن خلدون کو عادی لونڈا باز لکھا ہے۔

امیر المومنین امین الرشید دیوانگی کی حد تک ہم جنس پرست تھے۔ مسعودی نے 'مروج الذھب' میں اس کے واقعات میں لکھا ہے کہ اس کی ماں ام جعفر اس کے ذوق کی تسکین کے لیے مجبوراً مردنما لونڈیاں ڈھونڈتی تھی اور ان کو مردوں کے لباس پہنا کے امیر المومنین بیٹے کی خلوت میں بھیجتی تھی۔ اپنے غلام کوثر سے اس کا جنسی تعلق گندی حد تک مریضانہ تھا۔ انھی عباسی خلفا کے محلات نے 'مردنما لڑکیوں' کے فیشن کو جنم دیا اور 'غلامیات' ادب کی ایک باقاعدہ صنف بن گئی۔ 'تاریخ ادب العرب' اور 'المعجم الوسیط' کے مصنف استاد احمد حسن الزیات نے ہم جنسی ذوق کی تسکین کے لیے مردنما لڑکیوں کے فیشن پر اپنے تحقیقی مقالے 'المرءۃ الغلامیۃ فی الاسلام' میں لکھا ہے کہ دارالسلام بغداد میں لواطت کا فیشن یہاں تک پہنچ چکا تھا کہ لڑکیاں مجبوراً لڑکوں کے روپ میں اپنے آپ کو پیش کرتی تھیں۔ شاید اس لیے امام احمد بن حنبلؒ کے مطابق بے ریش لڑکے، مرد کے ساتھ ایک راستے میں جانا جائز نہیں۔

امیر المومنین المعتصم علانیہ ہم جنس پرست تھے۔ افریقہ کے امیر ابراہیم بن اغلب ثانی نے ساٹھ لڑکے ہم جنسی ذوق کے لیے رکھے تھے جب کہ قرطبہ کے اموی خلیفہ عبدالرحمن الثالث نے لیون کے ایک عیسائی لڑکے کو جنسی فعل سے انکار پہ قید اور بعد میں قتل کیا۔ یہی لڑکا عیسائی

ادبیات میں Saint Pelagius یا پیلا یو ولی بن گیا۔ اگر ابن حوقل کی پیشہ ور لڑکوں، موجرون؛ والی بات درست ہے تو بچہ بازی کے چکلوں کے بانی صرف مسلمان عرب ہیں۔

جاحظ نے جس ہم جنسی ادبی صنف کی بنیاد 'مفاخرہ' میں رکھی، اس نے آگے باقاعدہ شکل اختیار کی۔ لڑکوں سے جنسی تسکین کے نادر طریقے اور نوخیزوں کو دام ہوس میں لانے کی تکنیک پر لطیف رسائل لکھے گئے جن کی تفصیل 'المنجد' نے اپنی کتاب 'الحیات الجنسیہ فی العرب' میں دی ہے۔ جنسیات پر عربی اسلامی لٹریچر پڑھنے کے بعد موجودہ یورپی Pornographic ادا کار پارسا نظر آتے ہیں۔ جاحظ کے تتبع میں لکھے گئے ہم جنسی ادبا میں چند ناموں میں سے میں صرف سنجیدہ مصنفین کا ذکر کرتا ہوں۔ 'الوساطہ بین الزنات واللطاء' مشہور شاعر متنبی کے ہمعصر اور عضدالدولہ کے کاتب اور شاعر ابن ہندو کی تصنیف ہے۔ شارح بخاری، علامہ بدرالدین عینی الحنفی نے 'کتاب الحکایات' لکھ کر حدیث وفقہ کے ساتھ اس رنگین میدان میں بھی نام پیدا کیا۔ اس موضوع پر ممتاز ترین تصنیف علامہ التفاشی کی 'نزھت الالباب فی مالا یوجد فی الکتاب' ہے، جب کہ صدیق حسن خان کی 'نشوت السکران' بھی کسی سے کم نہیں۔

عورتوں کے ہم جنسی تعلق کا ادبی دنیا میں آغاز یونان کے جزیرہ لیسبوس کی شاعرہ سیفو سے ہوتا ہے۔ اس لیے زنانہ ہم جنس پرستی کو Lesbianism کہا جاتا ہے۔ عربی میں اسے 'سحاق' کہا جاتا ہے۔ یہ انگریزی کے Carpet munchers اور Pansy تو آج کل کے الفاظ ہیں۔ عربوں نے یہ میدان صدیوں قبل سر کیا تھا۔ سحاقات حلال ہیں یا حرام، ایک متنازع مسئلہ ہے۔ ایک حدیث کتب حدیث میں ذکر ہے 'سحاق النساء زنا بین ھن' جس سے اس کے حرام ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ جاہلیت میں بھی زنانہ ہم جنسی تعلق غیر معروف نہ تھا۔ 'کتاب الاغانی' میں ایک نعمان بن المنذر کی بیٹی ہند کے ایک دوسری عورت سے ہم جنسی تعلق کا ذکر ہے۔ 'المنجد' کے بقول زرقاء الیمامہ عربی ادب کی روایات میں پہلی ہم جنس پرست عورت تھی۔

مشہور ترین عربی کتاب 'الفھرست' کے مصنف ابن الندیم نے سحاقات ومساحقہ پر دلچسپ ورنگین کتاب 'کتاب الھند وبنت النعمان' میں بارہ ابواب پر مشتمل بارہ واقعات لکھے ہیں۔ سحاقی ادب یہاں تک ترقی کر گیا کہ ابوالعنبس السیمر ی نے اس صنف میں سینکڑوں صفحات پر مشتمل 'کتاب السحاقات' لکھی۔ صلاح الدین ایوبی نے ابن عساکر کے شاگرد امام

ابوالحسن علی بن محمد بن علی بن جمال بن سعدالدین المالکی الاندلسی کو بیت المقدس کا امام مقرر کیا تو فراغت پا کر امام القدس نے بیت المقدس میں بیٹھ کر 'حدائق الغناء فی اخبار النساء' نامی کتاب تصنیف کی جن کے زنانہ ہم جنس پرستی کے لطیف واقعات بیان کرنے کی نہ مجھ میں جرأت ہے، نہ میری اردو میں اتنی طاقت۔

نوٹ: مندرجہ بالا روایات میں راقم کی رائے شامل نہیں ہے۔

['مکالمہ'، ۲۶اور ۲۸ اکتوبر ۲۰۱۷ء]

ابونواس: ایک جسم دو روحوں کا شاعر

حقانی القاسمی

سدوم کی بستی اجڑ گئی، وہاں کے مکین نیست و نابود ہو گئے مگر سدومیت نہ ختم ہوئی اور نہ اس کے ختم ہونے کا کوئی امکان ہے بلکہ یورپ اور مغرب کی بدلتی قدروں کے ساتھ گے کلچر (Gay culture) کافی تیزی کے ساتھ فروغ پا رہا ہے اور سماج میں اس کی جڑیں مستحکم ہوتی جا رہی ہیں اور یہ سوچ جنم لے رہی ہے کہ ہم جنس پسندی محبت میں ہجرت کا ایک ایسا تجربہ ہے جسے شاعروں، فلسفیوں، مفکروں اور روشن دماغوں کے علاوہ مذہبی مشائخ کی عملی حمایت بھی حاصل ہے۔ اس کا ثبوت گے کیپٹل برلن میں منعقدہ وہ نمائش ہے جس میں ۱۸۳۰ء سے ۱۹۵۰ء تک کے معروف ہم جنس پسند و دانشوروں اور آرٹسٹوں کے فنون لطیفہ کے شاہکار اور کتب، فوٹو گراف ہیں۔ گے طبقہ میں اظہار و تشخص ذات کا شعور بھی بیدار ہوتا جا رہا ہے اور اعلانیہ طور پر یہ طبقہ اپنی جنسی ترجیحات کا تعین کر رہا ہے اور مروجہ سماجی رویئے سے انحراف کر کے ہمارے سماجی اسٹرکچر کا ایک مضبوط حصہ بنتا جا رہا ہے۔ چنانچہ اب دنیا کے بیشتر ممالک میں Gay Bars ہیں اور پوری دنیا میں Gays کی تعداد بڑھ رہی ہے اور یہ طبقہ معاشرتی تعصب کے خلاف برسرپیکار بھی ہیں اور قانونی تحفظ کے لیے طویل جنگ میں مصروف بھی۔

ہم جنس پسندوں کے اسی مابعد قافلہ کا ایک انتہائی سرگرم اور فعال رکن عہد عباسی کا عربی شاعر ابونواس بھی تھا جو ایران کے صوبہ خوزستان کے شہر اہواز میں پیدا ہوا۔ ایک انتہائی مفلس و غریب خاندان کے اس چشم و چراغ کے سر سے باپ کا سایہ کم سنی میں ہی اٹھ گیا تھا۔ تب مجبوری

حالات اسے بصرہ لے آئی تھی جہاں اس نے ایک عطار کی دکان میں ملازمت کر لی۔ وہ دن کو کام کرتا اور رات شاعروں کی صحبتوں میں گزارتا۔ ان سے فیض حاصل کرتا۔ ان کے شعر سنتا، اپنے شعر سناتا، لوگوں سے ربط وراہ بھی بڑھاتا، عین اتفاق کہ ایک دن اس کی ملاقات اپنے وقت کے عظیم شاعر والبہ بن حباب سے ہوئی۔ اس کی شاعرانہ شہرت نے ابونواس کے دل میں ملاقات کا ایک والہانہ جذبہ اور اشتیاق پیدا کر دیا تھا۔ یہ ملاقات رنگ لائی۔ والبہ نے ابونواس کی پیشانی پر کامیابی کی حسین کرنیں دیکھیں تو اسے اپنی معیت میں لے جانے پر رضامندی ظاہر کر دی، ابونواس کی باچھیں کھل اٹھیں کہ اسے والبہ جیسا استاد ملا اور والبہ فرط خوشی سے جھوم اٹھا کہ جس خوبصورت معصوم چہرہ کی اسے تلاش تھی، وہ تلاش پوری ہوئی۔ والبہ کی عاشقی کی نظر اس کے چہرے پر ٹھہر گئی اور شاید یہ نظر ابونواس کے جسم کے پار بھی اتری۔ پھر تو ابونواس کی معشوقیت شاعری میں قوس وقزح بکھیرنے لگی۔ اسے شاعری کی نئی معراج نصیب ہوئی اور اس کی شاعری میں آسمان چپکے سے اتر آیا۔ استاد والبہ تو اس کے خوب صورت گالوں اور لمبے لمبے بالوں میں گم 'گمشدہ' ہو کر رہ گئے مگر شاگرد ابونواس نے شہرت وعظمت کی نئی بلندیاں طے کیں۔

استاد نے اپنے شاگرد کو سوچ وفکر کی جو سوغات دی تھی، ابونواس نے اپنی شاعری کے وسیلے سے پوری دنیا کو لوٹا دی۔ ہم جنس پسندی کی جو سوچ اسے ملی تھی۔ اس پر اتنی استقامت اور صلابت کے ساتھ قائم رہا کہ زمانے نے سنگ ملامت برسائے مگر وہ بلاخوف لومۃ لائم اپنی اس سوچ کی تبلیغ وتشہیر کرتا رہا۔ اسے ساری ذلتیں، رسوائیاں قبول تھیں مگر اپنی اس روش سے حذر منظور نہ تھا کہ ہم جنس پسندی کی روایت کی توسیع کا عمل نہ رک جائے اور قوم لوط کی نمائندگی کا جو اعزاز اسے حاصل ہے، اس سے چھین لیا جائے۔ اپنی ہم جنس پسندی کی محبت میں اس نے پھول سے زیادہ نرم، شعلوں سے زیادہ گرم، حسینہ جنان کی پیش کش بھی ٹھکرا دی جس کے عشق کا خمار اس پر اتنا چڑھا ہوا تھا کہ وہ دیوانہ ہو چلا تھا۔ دل گیا، چین گیا، بے قراری بڑھی اور کچھ ایسی حالت ہوئی کہ رگوں میں زندگی کا درد تڑپنے لگا، آنکھوں میں ویرانی چھا گئی اور اس کی چاہت میں جذب وجنوں کی ایسی کیفیت ہو گئی کہ اس کی یاد میں ہزاروں اشعار کہہ ڈالے۔ وہ دور ہوتی رہی، ابونواس قریب جاتے رہے، وہ گالیاں دیتی رہی مگر ابونواس مسکراتے ہوئے بارگاہ حسن میں سجدہ ریزی کرتے رہے۔ بالآخر ایک طویل ریاضت کے بعد ناوک عشق نے اثر دکھایا، پتھر دل حسینہ موم ہوئی اور اس نے ابونواس سے شادی کے لیے مشروط رضامندی ظاہر کر دی مگر ابونواس کو یہ شرط

منظور نہ تھی کہ اس بت سے وصال کی خاطر 'مخمل دوخوابہ' کی اس لذت کو ترک کر دے جس میں اس کی زندگی بسر ہوئی ہے۔ چنانچہ یہ کہتے ہوئے ابونواس نے 'جنان' کے جذبہ کو ٹھکرا دیا کہ:

''محبوبہ میرے اوپر شرطیں رکھتی ہے۔ حالانکہ مجھ پر کوئی بری شرط لگانا اچھی بات نہیں ہے۔ میں ترک لواطت کو خود کے لیے باعث شرم سمجھتا ہوں، کیونکہ میں ہی اس قوم کا واحد نمائندہ ہوں۔''

ابونواس نے کسی کی پرواہ کیے بغیر ہم جنسی محبت کا مبینہ اعتراف کیا اور اپنے شعروں میں ہم جنس پسندانہ جذبات واحساسات کا اظہار کر کے رگوں میں سنسنی سی پیدا کر دی۔ وہ ان خوب صورت نوخیز سبز خطوں کی تعریف میں شعر کہتا جن کے چہرہ پہ نسوانیت جھلکتی اور جسے دیکھ کر ہزاروں دل دھڑکتے۔ ابونواس ان سبزہ نوخطاں کی مستانہ اداؤں اور بھاری بھر کم کولہوں کا ذکر کچھ اس انداز میں چھیڑتا کہ زاہد و پارسا کے قدم بھی ڈگمگا جائیں۔ لذت سے بھرپور یہ اشعار پڑھیے اور ہم جنس پسندانہ جذبہ کے اس خوب صورت اظہار پہ داد دیجیے:

''نسوانیت سے بھرپور اور نرم شانہ نوخیز بچہ ساقی گری پہ مامور تھا، دیکھنے والوں کی نظر اس پہ پڑتی تو پھر ہٹنے کا نام نہ لیتی۔ وہ کانوں میں بالیاں پہنے ہوئے تھا اور کولہے بھاری بھرکم تھے، ہتھیلیاں ایسی کہ جیسے ان میں مہندی رچی ہو۔"

"اس کی جلد اتنی ملائم ہے کہ اس سے گلے مل کر لذت کا احساس ہوتا ہے۔ وہ چاند کا مکھڑا ہے جب پیٹھ پھیر کے بھاری کولہوں کے ساتھ جاتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے کوئی پاؤں میں زنجیر پہنے پھسلن پہ چل رہا ہو۔''

''میں نے تو یہ قسم کھا رکھی ہے کہ سمندر پہ کبھی دھاوا نہ بولوں گا۔ اپنی تمام عمر پیٹھ ہی کی سواری کروں گا۔''

''ملامت گر مجھے نوجوان لڑکوں کو پسند کرنے پر ملامت کرتی ہے۔ میں سمندروں کو میدانوں پر کبھی ترجیح نہیں دے سکتا اور نہ عورتوں کو جنگل کے ہرنوں سے اچھا سمجھتا ہوں۔''

ابونواس نے ہم جنس پسندی کا اعتراف یوں کیا کہ وہ کوئی زاہد و پارسا نہ تھا۔ وہ ایک رند مشرب شاعر تھا۔ اس نے صرف ہم جنسی کا گناہ نہیں کیا بلکہ شراب بھی پی اور جی بھر کے پی۔ کیا مذہب کیا ایمان، سب کو چھوڑا۔ اس کی ہر شام چھلکتے جام کے ساتھ گزرتی تھی کیوں کہ شراب ہی اس کے لیے مونس و غم خوار تھی۔ شراب اس یتیم کے لیے ایک مہربان ماں کی طرح تھی جو اس کے

سارے غموں اور تنہائیوں کو پی جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ شراب کو معبودیت کا درجہ دے کر وہ حق عبدیت ادا کرتا رہا۔ شراب کی تعریف میں شعر کہتا رہا اور ایسی تعریف کہ حسن بصری اور ابن سیرین بھی سن لیتے تو سب کچھ چھوڑ مے کدے کی راہ لیتے۔ ابونواس کی رگوں میں شراب دوڑتی تھی اور وہ شاعری بن جاتی تھی۔ اس لیے اس کی شاعری میں شراب جیسی مدہوشی ہے اور شاعری بھی مستیوں میں نہائی ہوئی سی لگتی ہے۔ اس کی شاعری اور شراب دونوں لازم و ملزوم ہیں:

ہر چند کہ ہو مشاہدہ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

ایک جسم میں دو روحیں رکھنے والا یہ شاعر ہمیشہ مست مئے خمار رہتا تھا اور مسرتوں کی تلاش میں میکدے سے جا لگتا تھا اور شاعری میں مئے خانہ کا در کھول دیتا تھا۔ اس نوع کے چند اشعار دیکھیے اور غرق مئے ناب شاعر کی ذہنی درّاکی اور طاغوتی عبقریت کا مشاہدہ کیجیے:

''رات وہاں نہیں ہوتی جہاں شراب ہوتی ہے، کیوں کہ شرابیوں کا زمانہ تو دن کی طرح چمکتا رہتا ہے۔''

''جب کوئی شرابی جام نوش کرتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے رات کی تاریکوں میں ستاروں کو چوم رہا ہو۔''

''جہاں شراب ہوتی ہے، وہ جگہ پرنور ہوتی ہے اور جہاں نہیں ہوتی، وہ بے نور ہوتی ہے۔''

''میں نے جب تاریک رات میں شراب انڈیلی تو یوں لگا جیسے کوئی روشن ستارہ تاریکی میں آسمان پہ نمودار ہوا ہو۔''

''شراب تو روشن ستارہ اور چودہویں رات کے چاند کی مانند ہے۔''

اسی طرح ابونواس نے خمریات کے باب میں ایسے شعر کہے جو ان سے پہلے شاید ہی کسی نے کہے ہوں۔

بے پناہ شراب نوشی اور ہم جنسی محبت کے اعتراف کی وجہ سے ابونواس ذلیل و رسوا ہوا۔ عقیدے کے باب میں وہ متہم ہوا۔ جس کی وجہ سے اسے جیل کی اذیتیں سہنی پڑیں۔ مگر ابونواس کو اپنی وحشتوں اور آوارگیوں سے پیار تھا۔ اس لیے وہ ہر جبر سہتا رہا، ہر تکلیف برداشت کرتا رہا اور اپنی شاعری کے ذریعہ غم غلط کرتا رہا اور ہمیشہ یہ سوچتا رہا کہ مکاری، منافقت،

دوغلا پن اور مکروفریب سے بہتر ہے کہ انسان اپنے گناہوں کا برملا اعتراف کرلے اور خود ساختہ اخلاقیات کا ڈھنڈورچی نہ بنے۔

ابونواس کو خدا کی قہاریت پہ ایمان تھا تو اس کے غفورالرحیم ہونے پر ایمان کامل۔ وہ بندوں سے نہیں، خدا سے خائف تھا۔ اس لیے خدا کے دامن عفو دراز میں پناہ ڈھونڈھتا تھا۔ ابونواس اپنے تمام تر گناہوں کے باوجود بہت ہی پیارا شاعر تھا کہ اس کی باتوں میں ملاوٹ نہیں تھی، زہر بھی تھا تو خالص تھا۔ وہ خوفناک سچائیوں کی تلاش میں نکلا ہوا ایک شاعر تھا۔ اگر بیمار سماج یہ فرمان جاری کرے کہ ابونواس شاعر نہیں، پاگل ہے۔ اس کی شاعری میں عریانیت ہے، اوچھاپن ہے، وہ فحش نگار ہے تو کہنے دیجیے کہ ابونواس نے شاعری کی ہے، زہد و پارسائی کا دعویٰ نہیں کیا ہے، انفاس العارفین یا زبدۃ الاولیاء نہیں لکھی ہے۔ وہ ایک نرا شاعر ہے جو ہر وادی میں بھٹکتا رہتا ہے۔ ابونواس خواب غفلت سے بیدار ایک جاگتا شاعر تھا۔ اس کی شاعری جرأت و حوصلہ پر مبنی ہے اور واضح شاعری ہے جو اگر خوب صورت جسموں کی گپھاؤں میں بھٹکتی ہے تو علی الاعلان بھٹکتی ہے۔

ابونواس ایک عظیم فن کار تھا جس کی سوچ ماورائے عصر تھی۔ اس نے عربی شاعری کی زمین میں نئے پودے لگائے ہیں اور نیا لب و لہجہ و طرز اظہار دیا ہے۔ اس کی شاعری میں عود کی خوشبو، صندل کی مہک ہے، آسمان کی بلندی اور فکر و فن کی تازگی ہے۔

ابونواس کی شاعری روایت سے بغاوت کی شاعری ہے۔ تخلیقی سطح پر انتہائی حساس ذہن کی شاعری ہے۔ اس لیے ناقدین ادب خواہ اس کے نظریات کے بارے میں کتنی ہی لن ترانیاں کیوں نہ کریں مگر اس کی تخلیقی و شاعرانہ عظمت سے انکار نہیں کر سکتے۔ کیوں کہ اس کی شاعری میں فن کی تمام وسعتیں موجود ہیں اور پھر غلمانیات اور 'خمریات' کے باب میں کون ہے جس نے ابونواس سے اچھے اشعار کہے ہوں۔

ابونواس اُس غلمانی سلسلے کا امام تھا جس سلسلے کی تاریخ بہت طویل ہے۔ اس میں دنیا کے بہت سے مشاہیر کے نام آتے ہیں۔ علامہ نیاز فتح پوری نے ٹاکٹر رافاٹو ویش اور ڈاکٹر ہرشفیلڈ کے حوالے سے بہت سے شہرۂ آفاق اشخاص کے نام درج کئے ہیں جن میں اسکندرِ اعظم، ورجل، جولیس سیزر، مارلو، شیکسپیئر، سوفٹ، شیلے، بائرن، ٹینی سن، لیونارڈو ونسی، مائیکل انجیلو، آسکر وائلڈ کے علاوہ Cavafy نوبل انعام یافتہ آندرے ژید (Andre Gide) جس نے

Corydon کے عنوان سے اغلام بازی کی حمایت میں ایک تہلکہ خیز کتاب بھی لکھی تھی۔ (مارسل پروست، میکس جیکب، ژاں زینے Jean Genes) جس نے The thief Journal میں اپنے اس شوق کا فخریہ انداز میں ذکر کیا ہے۔)

سر رچرڈ برٹن نے Love war and fancy میں ہم جنسی پسندی کی تمام تر تفصیلات درج کرتے ہوئے عرب ممالک کا بطور خاص ذکر کیا ہے اور یہ لکھا ہے کہ بہت سے قبائل مثلاً Tympano Ribas Gallus میں اِسے ایک مذہبی رسم کی حیثیت عطا کی اور ISIS ے منادر تو اس ہوموسیکچولیٹی کے مراکز ہیں۔

ہم جنسیت کیا ہے، اسباب کیا ہیں؟

طاہر یاسین طاہر

سماج افراد سے تشکیل پاتا ہے اور سماجی رویے، افرادی رویوں سے مل کر ایک معاشرتی رویہ تشکیل دیتے ہیں۔ ہم میں سے کسی کو کھانسی بھی ہو جائے تو وہ اس کی موسمی و سائنسی وجوہات کے بجائے سب سے پہلے یہی کہے گا کہ یہ سب مذہب سے دوری کی وجہ سے ہے۔ بے شک تمام الہٰیاتی مذاہب کا ہدف معاشرتی اخلاقیات ہے۔ جو معاشرہ اخلاقی اعتبار سے برتر ہوگا، وہ معاشی اعتبار سے بھی برتر ہوگا۔ کیا ہم دیکھتے نہیں کہ صدر اسلام میں مسلمانوں کے پاس معاشی طاقت تھی؟ کیوں؟ اس لیے کہ اخلاقی طاقت بھی ان کے پاس تھی۔ دنیا کے تمام معاشروں میں البتہ کمزوریاں بھی ہوتی ہیں اور برتری بھی، کسی معاشرے کی کوئی اخلاقی کمزوری ممکن ہے دوسرے معاشرے کو پسند نہ آئے، مگر وہ اس معاشرے میں ایک عام سی آزادیٔ اظہار ہو۔ معاشرتی ضرورتیں وقت کے ساتھ تبدیل ہوتی رہتی ہیں مگر جبلی ضرورتیں آج بھی قریب قریب ویسی ہی ہیں جیسے قبل از مسیح تھیں۔ مثلاً، شادی، افزائشِ نسل، جنسی ضروریات، خوراک کا حصول وغیرہ۔ چیزوں کو ذاتی پسند و ناپسند کے بجائے انھیں طالب علمانہ انداز سے بھی دیکھنا چاہیے۔ علمائے عمرانیات کو اس حوالے سے ضرور معاشرتی رہنمائی کرنی چاہیے۔

'اخباری دانش' ابھی بلوغت کی منازل میں تھی کہ 'سائبر دانش' کا ایسا سیلاب آیا جو ہر چیز کو اپنی 'سائبریا دانش' میں بہائے لے جا رہا ہے، جذباتیت غالب ہے۔ غلطی سے نہیں، اس پر اصرار سے معاشرے تباہ ہوتے ہیں۔ ہم بحیثیت مسلمان جھوٹ بھی بولتے ہیں اور پھر بڑے تفاخر

کے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ جھوٹ بولنا گناہ ہے۔ انسان کی جبلی کمزوریوں کو تسلیم کرنے میں عار ہی کیا ہے؟ ہر کام ہر کسی کے بس کا نہیں ہوتا۔ 'مکالمہ' پہ ایک تحریر شائع ہوئی تو چاروں سے سنگ باری شروع ہوگئی۔ کچھ حضرات نے مکالمہ پہ تحریریں بھی بھجوائیں اور تبلیغ کی کہ نہ صرف ہم جنسیت دین سے دوری کے سبب ہے بلکہ ایسا لکھنا بھی اخلاق باختگی ہے۔ دین داروں سے اتنا ہی کہوں گا کہ حضور، مدارس میں باقاعدہ طلبا سے یہ شغل فرمایا جاتا ہے۔ ایک اصطلاح دین کی موٹی موٹی کتابوں میں ملتی ہے 'علت مشائخ'؛ یہ کیا ہے؟ دینی اخلاقیات سے دوری ایک سبب ہے۔ معاشرتی اور جبلی رویہ البتہ ایک دوسرا اور اہم سبب بھی ہے، جسے نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ ہم جنسیت اور لزبائی عشق کی اربابِ نظر نے تین اسباب سے بحث کی ہے؛ عضویاتی، نفسیاتی اور معاشرتی۔

کرافٹ ایبنگ، ڈاکٹر مال اور پروفیسر مانٹا گیزا کے خیال میں ''ہم جنسی میلان خلقی اور عضویاتی ہوتا ہے''، ہم جنسیت کا سب سے موثر دفاع ایک جرمن عالم، کارل ہائزخ الرخس نے کیا تھا۔ وہ خود پیدائشی 'ہم جنسی' تھا اور ہم جنسیت کو فطری اور قانونی فعالیت منوانے کے لیے عمر بھر جدو جہد کرتا رہا۔ معاشرتی اسباب کے حوالے سے رچرڈ برٹن، جسے 'ہم جنسی عشق' کا سب سے پہلا محقق بھی کہا جاتا ہے، وہ کہتا ہے کہ جہاں کہیں مردوں کو عورتوں کی صحبت میسر نہ آ سکے، اور عورتیں مردوں سے الگ تھلگ رہیں، وہاں ہم جنسی میلان اور لزبائی عشق کو پنپنے کے مواقع مل جاتے ہیں۔ کاسپر کے الفاظ میں، یہ اکتسابی ہم جنسیت ہوتی ہے اور اس کی تہہ میں مجبوری کارفرما ہے، جیسے ایک فاقہ زدہ شخص نامرغوب شے بھی کھا لیتا ہے، چنانچہ صنف مخالف کی صحبت میسر آنے پر اس نوع کا 'ہم جنسی' میلان بھی ختم ہو جاتا ہے۔

اخبار نویس مگر اس سے اختلاف کرتا ہے، کیوں کہ امریکہ و یورپ میں مرد و زن کے اختلاط کے باوجود ہم جنسیت کے باقاعدہ کلب ہیں اور ہم جنس شادیاں بھی ہوتی ہیں۔ ہم جنسیت کے نفسیاتی سبب سے بحث کرتے ہوئے بعض علمائے تحلیل نفسی، کہتے ہیں کہ ''ہر شخص فطری طور پر دو جنسی ہے''۔ دو جنسیت انکشاف سب سے پہلے فلیس نے کیا تھا، جس سے فرائڈ نے استفادہ کیا، فرائڈ کہتا ہے ''میں نے کسی بھی ایک مرد یا عورت کا تجزیہ نہیں کیا جس میں ہم جنسی میلان موجود نہ ہو۔'' وہ مزید کہتا ہے کہ اگر جنسی میلان کو دبا دیا جائے تو تشویش کی الجھن پیدا ہوتی ہے، سٹیکل اور کلفورڈ ایلن کی تحقیق یہ ہے کہ ''ہم جنسیت خلقی نہیں ہوتی بلکہ نفسیاتی نظام میں خلل پیدا ہو جانے سے نمو پذیر ہوتی ہے۔'' نامور مفکر ہیولاک ایلس کہتا ہے کہ ''ہم جنسیت کسی بھی

نفسیاتی مرض کی علامت نہیں ہے، اس کے خیال میں کسی ہم جنسی کو ابنارمل کہنا زیادتی ہوگی۔ بعض مرد، عورت سے مایوس ہو کر یا احساس کمتری کے تحت ہم جنسی بن جاتے ہیں۔ (حالاں کہ احساس کمتری بھی ایک نفسیاتی عارضہ ہے) انھیں اس بات کا اندیشہ ہوتا ہے کہ وہ عورت کی جنسی تشفی نہیں کر سکیں گے۔ بعض نوجوان لڑکیاں مرد کے خوف سے ہم جنسیت کی طرف میلان رکھتی ہیں۔ سیمون دی بوا کہتی ہیں۔

''ایک نوجوان لڑکی مرد کی درشتی اور تندمزاجی سے خائف ہو کر اپنے آپ کو بڑی عمر کی عورت کے سپرد کر دیتی ہے۔ مردانہ قسم کی عورت میں اسے اپنے والدین کی جھلک دکھائی دیتی ہے، اس طرح نوجوان لڑکی حقیقی تجربے سے روگردانی کرتی ہے اور اس کے یہاں تخیل اور حقیقت آپس میں گڈمڈ ہو جاتے ہیں۔''

سماجی، عضویاتی اور نفسیاتی تذکرے کے بعد ہم اس حوالے سے تاریخ کی کتابوں سے گرد ہٹائیں تو بھی ہمیں ہوش ربا واقعات پڑھنے کو ملتے ہیں۔ اگرچہ ان کی وجوہات بھی مذکورہ ہی ہیں۔ 'ہم جنسی محبت' کا کھوج تو قدیم ترین اقوام میں بھی ملتا ہے کیوں کہ یہ ایک نفسیاتی و معاشرتی مسئلہ ہے، چنانچہ یہ شروع سے ہی انسان کے ساتھ ہے۔ کچھ مورخین کی رائے یہ ہے کہ ہم جنسیت کی ابتدا مصر قدیم سے ہوئی، جہاں دیوی ماتا آئسس کے معبد میں ہیجڑے پجاری رہتے تھے جن سے زائرین اپنی تفریح طبع کا سامان پیدا کر لیتے تھے۔ مصر قدیم کی ساڑھے چار ہزار سالہ پرانی ایک تحریر سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس معاشرے میں 'امرد پرستی' کا رواج عام تھا۔ عہد نامہ قدیم کے بابِ پیدائش میں لکھا ہے کہ ''جب دو فرشتے سدوم کو تباہ کرنے آئے تو حضرت لوطؑ کے گھر ٹھہرے، جہاں سدومیوں نے انھیں گھیر لیا اور شور مچایا کہ اے لوط، انھیں باہر بھیجو۔''

قدیم چین اور جاپان میں بھی امردوں کے قحبہ خانے موجود تھے۔ جاپانیوں کا خیال تھا کہ 'ہم جنس پرست دلیر اور شجاع' ہوتے ہیں۔ اہل یونان نے امرد پرستی کو قومی اور تعلیمی ادارہ بنا لیا اور ہم جنسیت ان کے معاشرے، مذہب، فلسفہ، قانون اور شعر و ادب میں نفوذ کر گئی۔ لائی کرگس اور سولن نے اپنے اپنے ضابطہ قوانین میں سدومیت (ہم جنس پرستی) کو مباح قرار دیا، لیکن ایک شرط عائد کی کہ صرف آزاد لڑکوں سے اظہار عشق کیا جائے، غلام ہم جنسی محبت کے اہل نہیں ہوتے۔

سقراط ایک حسین لڑکے آٹولیکس کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے، ''جس طرح اندھیری رات میں آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں پر سب لوگوں کی نگاہیں جم کر رہ جاتی ہیں، اسی طرح

آٹولیکس کے چہرے کی طرف تمام لوگوں کی نگاہیں اٹھ جاتی ہیں۔''یونان کے امرا، اور رؤسا امردوں کے قحبہ خانوں میں جانا اپنی شان سمجھتے تھے۔قدیم یونان کے فلاسفہ نے ہم جنسی عشق کی تعریف وتوصیف میں منطقی دلائل دیے۔یونان کی غنائی شاعری فارسی غزل کی طرح ہم جنسی عشق پر مبنی ہے، اس میں 'امردوں' سے اظہار عشق کیا گیا ہے، ایک شاعر اسٹر یٹون کہتا ہے،''شدید گرمی میں ایک حسین پھول کملھا کر رہ جاتا ہے، اسی طرح خط کا ایک بال لڑکے کے حسن کو تباہ کر دیتا ہے''، ایک اور یونانی شاعر ایک لڑکے کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ''میرے پیارے، تری آنکھیں تو بہروں سے بھی باتیں کرتی ہیں''۔افلاطون سمپوزیم میں کہتا ہے کہ''وہی نوجوان جو ہم جنسی عشق کا تجربہ رکھتے ہوں اچھے سیاستدان بن سکتے ہیں۔''

روسو جیسا مفکر اپنے زمانہ طالب علمی کے احوال میں لکھتا ہے،''جب وہ تحصیل علم کے لیے ایک خانقاہ میں داخل ہوا تو ایک شخص اس پہ فریفتہ ہوگیا، اس سے بوس وکنار کرتا، مگر وہ کریہہ صورت تھا، ایک رات اس نے روسو کو بستر پہ چلنے کو کہا، جسے روسو نے بہانے سے ٹال دیا۔اگلے دن خانقاہ کے منتظم سے شکایت کی تو اس نے کہا کہ، واہ! یہ بھی کوئی بات ہے؟ اوائل عمر میں ایسے کئی واقعات مجھ پر بھی گزر چکے ہیں۔''، خانقاہ کے منتظم نے مزید کہا کہ میں ذاتی تجربے کی بنا پر کہتا ہوں کہ یہ تجربہ چنداں ناخوشگوار بھی نہیں ہوتا، تم خانقاہ کو خواہ مخواہ بدنام کرتے ہو۔روسو کے معاصر دیدیرو نے اپنے ناول راہبہ کی سرگزشت میں لزبائی عشق کا استادانہ نقشہ کھینچا ہے۔

میں اکثر یہ جملہ تکرار سے لکھتا ہوں کہ تاریخ کی کسی سے رشتہ داری نہیں ہوتی۔ہم مگر تاریخ کو عقیدت سے پڑھتے ہیں، اگر اسے ایک مضمون کے طور تجزیاتی مطالعہ کریں تو سبق بھی حاصل ہو۔یونانیوں، جاپانیوں اور ایرانیوں، میں سدومیت ایک قدر مشترک تھی جو رفتہ رفتہ ایک رواج بن گئی۔نامور مفکر علی عباس جلالپوری لکھتے ہیں،''خلیفہ ہارون اور جعفر کی محبت تاریخوں میں محفوظ ہے۔ہارون نے ایک ایسا فرغل بنوایا ہوا تھا جس کے دو گریبان تھے، اسے پہن کر وہ یکجان دو قالب بن جاتے تھے۔''ہارون کا بڑا بیٹا امین سخت ہم جنس پرست تھا۔اس کی ماں زبیدہ نے حسین وجمیل کنیزیں مردانہ لباس پہنا کر اس کے پاس بھیجیں۔امین اپنے ایک غلام کوثر پر جان چھڑکتا تھا۔خانہ جنگی کے دوران جب مامون کی فوج کے سپہ سالار طاہر بن حسین کی فوج بغداد میں گھس آئی اور امین کی سپاہ کو شکست ہوگئی تو ایک شخص دوڑتا ہوا امین کے پاس پہنچا، جو اس وقت دریا کے کنارے بیٹھا اپنے محبوب کوثر کے ساتھ مچھلیاں پکڑ رہا تھا۔اسے شکست کی خبر دی گئی تو وہ

سخت بدمزہ ہوا اور کہنے لگا، خدا تمھیں غارت کرے، دیکھتے نہیں کوثر نے دو مچھلیاں پکڑ لیں اور میرے ہاتھ ابھی تک ایک بھی نہیں لگی۔''

خلیفہ الحاکم فاطمی کا خواجہ سراعین کے ساتھ معاشقہ مشہور ہے۔ خلیفہ ہادی عباسی نے قابل اعتراض حالت میں پا کر اپنی دو حسین وجمیل کنیزوں کا سر قلم کر دیا تھا۔ مزید سنیے کہ سلطان محمود غزنوی کو مشتری چہرہ غلاموں سے عشق تھا۔ فضل بن احمد بھی اس شوق میں اپنے آقا کی پیروی کرتا تھا۔ عماد الدین اصفہانی تاریخ سلجوقیہ میں لکھتا ہے کہ ''سلطان سنجر کی عادت تھی کہ جو غلام اسے پسند آ جاتا، اسے خرید کر وہ اس سے عشق کرتا تھا۔'' تزک بابری میں ہم جنسی عشق کے تذکرے ملتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ سلاطین وامرا کے حرم سراوں میں لزبائی عشق عام تھا، کنیزیں ایک دوسری سے لزبائی اختلاط کر کے اپنی محرومیوں کا ازالہ کرتی تھیں، کیوں کہ قدرتاً بھی ایک شخص سینکڑوں لونڈیوں کی جنسی خواہش پوری نہیں کر سکتا۔

عورتوں کی ہم جنسی محبت کی روایت بھی یونان قدیم کی یادگار ہے۔ ''جزیرہ لزباس کی مشہور و معروف شاعرہ سیفو سے اس کا آغاز ہوا تھا۔'' اس کے وطن کی رعایت سے عورتوں کی ہم جنسی محبت کا نام 'لزبائی عشق' پڑ گیا۔ یہ بات درست ہے کہ ہم جنسیت کی عضویاتی، معاشرتی اور نفسیاتی وجوہات ہیں۔ آج بھی مغرب کے قحبہ خانوں میں ہم جنسی میلان اور لزبائی شوق کی تشفی کے لیے سامان کیے جاتے ہیں۔ وہ افراد جو صرف یہ سمجھتے ہیں کہ ہم جنسیت کی صرف اور صرف وجہ الٰہی اخلاقیات اور دین سے دوری ہے، وہ قطعی غلطی پر ہیں۔ ہاں یہ ایک پہلی وجہ ہو سکتی ہے مگر کلی نہیں۔ تمام الٰہی مذاہب نے اخلاقیات کی تعلیم دی۔ ہندو مذہب میں بھی ہم جنسیت قابل گرفت جرم ہے، مجوسیوں میں بھی اس فعل کو برا سمجھا جاتا تھا، مجوسیوں کی شریعت میں سدومی کی سزا موت تھی۔ کیا یہ سچ نہیں کہ ساسانیوں کے عہد میں ہم جنسیت ایک معاشرتی ادارہ بن گئی تھی؟ کیا اردو شاعری میں مرکزی محبوب مذکر نہیں ہے؟

میر کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب
اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

بابر اپنے ایک عزیز کے بارے تزک بابری میں لکھتا ہے کہ ''سلطان محمود مرزا پابند صوم و صلوٰۃ تھا، لیکن اس نے کئی لونڈے رکھے ہوئے تھے۔ مزید لکھتا ہے کہ اس کی مملکت میں جہاں کوئی نوخیز اور حسین لونڈا دکھائی دیتا وہ اسے قابو میں لانے کی کوشش کرتا تھا۔ اس کے سرداروں

کے بیٹے، حتیٰ کہ اس کے رضاعی بھائی اور رضاعی بھائیوں کے بیٹے بھی اس سے محفوظ نہیں تھے'' آہ کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ مرور زمانہ سے مسلمانوں میں امرد پرستی اس قدر عام ہوگئی کہ غیر مذاہب کے لوگ اسے اسلام کا جزو سمجھنے لگے۔''

البیرونی کے بقول'' کابل کے ہندو راجہ نے اسلام قبول کیا تو یہ شرط لگائی کہ وہ نہ تو گائے کا گوشت کھائے گا اور نہ لونڈوں سے عشق بازی کرے گا۔'' اسلامسٹ صوفی بھی امردوں پر جان چھڑکتے ہیں۔ ابن جابر اپنے عہد کے مشہور زاہد تھے۔ ڈاکٹر زکی مبارک لکھتے ہیں کہ ابن جابر کے ایک شاگرد نے ایک خوبصورت جوان سے کہا، خدا کے لیے مجھے اپنے چہرے کا بوسہ لینے دو۔ لڑکے نے بوسہ نہ لینے دیا اور شیخ کے پاس جا کر اس کے شاگرد کی شکایت کی، کہ اس نے مجھ سے ایسا مطالبہ کیا ہے۔ شیخ نے کہا، کیا تو نے اس کی خواہش پوری کر دی؟ لڑکے نے کہا نہیں! شیخ نے کہا، تو اس کی خواہش کو ٹھکرا کر اسے سزا تو دے چکا ہے، اب مجھ سے شکایت کرنے کیوں آیا ہے؟ یہ امر درست ہے کہ صوفیا امرد یعنی ایسے لڑکوں، جن کی داڑھی مونچھ نہیں آئی ہوتی اپنے ساتھ رکھتے ہیں اور ان سے لذت حاصل کرتے ہیں۔ سلطان محمود غزنوی کا معاشقہ اپنے غلام ایاز سے مشہور ہے۔ مورخ خوند میر نے اس کی تفصیل لکھی ہے۔ گذشتہ صدی کے نصف میں ہم جنسوں نے باقاعدہ انجمنیں بنائیں اور اپنے حق میں جلوس نکالے۔ اگرچہ ہم جنس پرستوں کی انجمن سازی قدیم عہد میں بھی رؤسا و امرا کے حرم سراوں میں ملتی ہے۔ ۱۹۷۰ کو پہلی بار دس ہزار ہم جنسوں نے نیو یارک میں جلوس نکالا اور مطالبہ کیا کہ ہم جنس پرستوں کو نہ صرف ملازمتوں میں مناسب حصہ دیا جائے بلکہ انھیں باہم شادیاں رچانے کی اجازت بھی دی جائے۔ یورپ کے بعض ممالک میں ہم جنسی شادیوں کو قانونی حیثیت حاصل ہے، اگرچہ ایسی شادیوں کو کلیسا کی حمایت حاصل نہیں ہوتی۔ لز بائی عشق ہو یا امرد پرستی؟ تاریخ کے اوراق میں ہوش ربا واقعات درج ہیں۔

موضوع کو سمیٹنے کی طرف آتے ہیں۔ ہم جنسیت ایک معاشرتی، عضویاتی اور نفسیاتی معاملہ ہے۔ اسے کسی کے ایک شخص کے فتوے کی کمزور چادر میں نہیں لپیٹا جا سکتا۔ 'علت مشائخ' پہ فقہی و دینی کتب میں جو باب باندھا گیا ہے وہ اس بات کی گواہی ہے کہ دین دار طبقہ بھی ہم جنسی رویوں سے مغلوب ہے۔

آخری تجزیے میں مرد و عورت ہی ایک دوسرے کی جنسی تشفی کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ یہی ایک دوسرے سے جنسی اختلاط کر کے افزائش نسل کا سبب بنتے ہیں۔ مغرب ہو یا

مشرق، مسلم ہوں یا غیر مسلم، سارے معاشرے ہم جنسی پرستی کے بڑھتے رجحان سے خائف ہیں اوراس کی معاشرتی ونفسیاتی اصلاح کے لیے کوشاں بھی ہیں۔ عضویاتی پہلو کا تعلق خلقی رجحان سے ہے۔ کیا یہ سچ نہیں کہ جن کی حسِ جمال تیز ہوتی ہے ان میں ہم جنسی رجحان بھی قدرے تیز ہوتا ہے؟ اگرچہ وہ معاشرتی حیا کے باعث اسے چھپا کر ہی کیوں نہ رکھتے ہوں؟ رواجاً تنقید کرنے کے بجائے مطالعاتی رجحان کو اپنائیں، مکالمہ کریں، اسی میں معاشرتی حسن اور سماجی حیات کی بقا ہے۔

یاروں کی خامشی کا بھرم کھولنا پڑا
اتنا سکوت تھا کہ مجھے بولنا پڑا

اپنے جیسوں سے انسیت کے بارے میں

مجاہد مرزا

میں دسویں جماعت میں تھا، زلفی ایک اونچے گھوڑے پر سوار ہو کر ہماری گلی میں داخل ہوتا تھا اور گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھے بیٹھے دروازہ کھٹکھٹا دیا کرتا۔ میری بہنوں میں سے کوئی دروازے کی ریخ میں سے دیکھ کر کہتی، ''تمھارا گھڑسوار دوست آ گیا۔'' مجھے لگتا جیسے میرے دانتوں تلے ریت آ گئی ہو، با دل نخواستہ اسے ملنے کے لیے گھر کے دروازے سے نکل جاتا اور جتنی جلدی ممکن ہوتا اسے رخصت کرنے کی کوشش کرتا۔

زلفی گل گوتھنا، معصوم شکل، گورا لڑکا تھا۔ اس کی انفعالیت سے متعلق اسکول میں سب کہتے تھے۔ ایسے شہدوں سے تو میرا ابھی پتہ پانی ہوتا تھا جو پیچھے آ کر ایک خاص قسم سے کھنکارتے تھے۔ میری چال میں لڑکھڑاہٹ آ جاتی تھی اور قدم تیز ہو جاتے تھے۔ ایسے لوگ لڑکوں کی جانب رغبت کے سلسلے میں بدنام ہوا کرتے تھے۔ مگر زلفی تو بے ضرر لگتا تھا البتہ اس کی 'دیکھنی' ایسی ہوتی تھی جیسے اس کی آنکھوں سے خواہش بہہ کر باہر آ جائے گی۔ اس کا مسکراتے ہوئے یہ پوچھنا ''میں کیسا لگ رہا ہوں''، بہت الجھن میں ڈالنے والا ہوتا تھا۔

میں پڑھنے کے لیے لاہور چلا گیا۔ ایف ایس سی کے بعد ٹیگ سسٹم کے تحت مجھے نشتر ملتان میں داخلہ ملا تھا۔ ۱۹۷۱ میں جب طلبا مشرقی پاکستان سے ڈسپلیس ہو کر آئے تو ان میں میرا ایک کلاس فیلو بھی تھا جس کا بھائی مجسٹریٹ تھا۔ کچہری میں اس کی ملاقات زلفی سے ہوئی تھی۔ وہ اب کمشنر آفس میں ملازم تھا، یوں زلفی ایک بار پھر مجھے ملنے لگا تھا۔ یقین کیجیے جب وہ مجھے ملنے آتا

تھا تو میں ہوسٹل کے کمرے کا دروازہ چوپٹ کھول دیا کرتا جو عام طور پر ہمیشہ بند رکھا کرتا تھا۔ اس کے ہاتھوں کا بہکنا اور مسلسل خجل مسکان مسکراتے ہوئے اپنے جسم کے بارے میں باتیں کرنا، دروازہ کھلا رکھنے کی وجہ ہوتی تھی۔ جب وہ کبھی موٹر سائیکل پر میرے پیچھے بیٹھتا تو چپک کر بیٹھتا جیسے چھپکلی اور چھپکلی سے میری جان جاتی ہے۔

مطلب یہ کہ میں بھی اکثریت کی طرح 'ہم جنسیت گریز' یعنی 'ہوموفوبک' ہوں۔ سب جانتے ہیں کہ ہر چیز کے دو یا دو سے زیادہ پہلو ہوا کرتے ہیں چنانچہ 'ہم جنسیت گریزی' کا دوسرا پرتو یعنی 'ہم جنسیت سے رغبت' کا کچھ حصہ ہم سب کے لاشعور میں کہیں کروٹیں لے رہا ہوتا ہے۔ اردو اصطلاح 'ہم جنس پرستی' ہوموسیکسویلیٹی کا یکسر غلط ترجمہ ہے جو 'ہم جنسیت گریزی' کا عنصر شدید ہونے کے باعث کیا گیا ہوگا، البتہ اگر 'ہم جنس پسند' کہا جاتا تو بہت حد تک مناسب ہوتا۔

ہم نے کبھی نہیں سنا کہ ہیٹروسیکسول کو 'جنس مخالف پرست' کہا گیا ہو۔ اس نوع کے تعصب کا اظہار صرف اردو میں ہی نہیں بلکہ کچھ اور معاملات کے بارے دوسری زبانوں میں بھی کیا جاتا ہے جیسے عورتوں کے ساتھ تعلقات رکھنے والے کو انگریزی زبان میں 'وومنائزر' کہا جاتا ہے لیکن اگر عورت بہت سے مردوں کے ساتھ تعلقات رکھے تو ایسی عورت کو 'نمفو مینیک' کہتے ہیں جیسے وہ جنونی ہو۔ اس طرح کے مرد کے لیے 'ڈان جوان' اور 'کیسانووا' جیسے متفاخرانہ الفاظ استعمال کیے جائیں گے جب کہ عورت کے لیے 'ہور' اور 'سلٹ' یعنی 'گشتی'، 'کنجری' جیسے الفاظ برتے جائیں گے۔

ضروری نہیں کہ ہم جنسیت کی جانب مائل یا اس سے کسی سطح کی رغبت رکھنے والے یا والیاں (یاد رہے تکنیکی طور پر یعنی ہارمونوں کے حوالے سے ایسا تھوڑا سا عنصر سبھی مردوں اور عورتوں میں ہوتا ہے، ورنہ جانوروں میں ہم جنسی دیکھنے میں نہ آتی۔ یہ اور بات ہے کہ ہم نے شعور کی بلند سطح اور تربیت کے مخصوص پیمانوں کے باعث اس عنصر کو دبا دیا ہے یا سلا دیا ہے) ہم جنسی فعل کی جانب بھی راغب ہوں۔ یوں ہم جنسی کی جانب راغب ہونے والوں اور ہم جنسی عمل میں شامل ہونے والوں کو علیحدہ کر کے دیکھنا ہوگا۔

میں اور آپ سب مرد چونکہ عورتیں نہیں، اس لیے عورتوں کے محسوسات کے بارے میں جو کچھ کہیں گے، وہ سنی پڑھی باتیں ہوں گی مگر دل لگتی کہیے کیا ہم سب کے دلوں میں زندگی کے مختلف ادوار میں کسی حسین ہم جنس کو دیکھ کر ایک ہلکی سی یا شدید سہی، کسک پیدا نہیں ہوئی؛ چاہے یہ سوچ کر

ہی کہ اگر یہ اتنا حسین ہے تو اس کی بہن کتنی حسین ہوگی، ایسا کہنا مذاق بھی ہے اور مذاق ہے بھی نہیں، اس طرح سوچتے ہوئے ہم ایک بار پھر اپنی ہم جنس رغبت کی سانس بند کر رہے ہوتے ہیں۔

جنسی عمل کوئی بھی ہو، جنس مخالف کے ساتھ یا ہم جنس کے ساتھ، وہ آنکھوں اور ہاتھوں سے شروع ہو کر ہی اپنے انجام کو پہنچتا ہے۔ چونکہ سوسائٹی ہمیں سکھا چکی ہے کہ ہاتھ پھیرنا، سہلانا، پچکارنا، پیار کرنا جنس مخالف کے ساتھ ہی زیب دیتا ہے، اس لیے ہم عمر کے ایک خاص حصے کے بعد، عموماً سترہ اٹھارہ برس کے بعد ان افعال کا ہدف جنس مخالف کو خیال کرنے لگتے ہیں۔

پھر ہم میں سے وہ کون لوگ ہوتے ہیں جو سوسائٹی کے سکھائے ہوئے اعمال کو نہیں مانتے یا نہیں مان سکتے۔ ہم جھٹ سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ جنھیں ایسا کرنے کی لت لگ چکی ہوتی ہے۔ پھر ایسا کیوں ہوتا ہے کہ کچھ لوگ جو ایک خاص عمر تک یا جنس مخالف سے تعلق استوار ہونے تک ہم جنس افراد سے تعلق رکھتے ہیں اور پھر اسے ترک کر دیتے ہیں؟ یا کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو جنس مخالف اور ہم جنس دونوں سے ہی تعلق رکھنے کو مناسب تصور کرتے ہیں یا وہ جو جنس مخالف کے ساتھ وہ جنسی عمل کریں جو ہم جنس کے ساتھ کیا جانا ممکن ہوتا ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ جنس مخالف کے حصول میں دشواری سے لاشعور میں دبی ہم جنس کے ساتھ رغبت ابھر آتی ہے اور جنس مخالف سے ربط ہونے کے بعد ماند پڑ جاتی ہے یا ترک کر دی جاتی ہے۔ مگر وہ لوگ جن میں جنس مخالف کی جانب رغبت پروان ہی نہیں چڑھتی، وہ ایسا نہیں کہ سوسائٹی کی تربیت سے بغاوت کرتے ہیں بلکہ ان کے شعور میں وہ باتیں جگہ ہی نہیں پا سکتیں جو سب کے شعور میں جگہ پا لیتی ہیں کیوں کہ ان کے شعور میں لاشعور کا وہ فطری پہلو راسخ ہو جاتا ہے جسے صوفیا نے عشق مجازی کا نام دیا تھا۔ عشق مجازی میں عورت نہیں بلکہ کم عمر ہم جنس پایا جاتا ہے۔

ہم جنس کی جانب انسیت والوں سے متعلق مذہبی اور سماجی حوالوں سے معاندانہ رویہ ہے۔ صرف مسلمان ہی نہیں عیسائی، یہودی، ہندو بھی ان کے مخالف ہیں۔ دوسرا رویہ سماجی ہے جس کا ہم ذکر کر چکے ہیں یعنی 'ہم جنسیت گریزی'۔ رہی بات مذہبی حوالے سے مخالفت کی تو اس کے لیے حضرت لوط کے قبیلے (قوم) کی داستان کا حوالہ دیا جاتا ہے جس میں ہم جنس انسیت اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ مردوں کا عورتوں کی جانب میلان ختم ہو چکا تھا۔ معاشرے کی بنت خراب ہو رہی تھی۔ اس قبیلے نے اپنے پیغمبر کی نصیحت پر بھی کان نہ دھرا تھا اور بالآخر اس قوم پر عذاب طاری

کیا گیا۔ تباہ ہونے والوں میں لوط کی بیوی بھی شامل تھی۔ اس کے میلان سے متعلق کسی بھی الہامی کتاب میں کچھ نہیں ملتا۔

تو کیا کسی بھی سماج میں یہ رجحان عام ہو چکا ہے؟ مجھے تو زلفی یا اس جیسے دو ایک اور نظر آئے ہیں ساری عمر میں۔ ان معاشروں میں بھی جہاں ایل جی بی ٹی یعنی ہم جنس انسیت کے حامل مردوں اور عورتوں کو ایسا کرنے کی اجازت ہے، ایسے لوگوں کی شرح آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں۔ یہ اقلیت وہ ہے جن کا اپنے رجحان کو ترک کرنے پر زور نہیں چلتا جیسے بائیں ہاتھ سے کام کرنے اور لکھنے والے کا ہاتھ توڑ دیں تو اور بات ہے مگر وہ بایاں ہاتھ ہی استعمال کرے گا۔ پہلے بائیں ہاتھ سے کام کرنے والے کو شیطان کا ساتھی خیال کیا جاتا تھا اور اب وہ امریکہ کا صدر ہے۔ درست ہے کہ ہم اسے اب بھی شیطان کا ساتھی تصور کرتے ہیں، اس کے انسان دشمن اعمال کے باعث نہ کہ اس کی بائیں ہاتھ سے کام کرنے کی عادت کے سبب۔

انکار سے حقیقت ختم نہیں ہو جاتی

عرفان احمد عرفی

''ہمارے ہاں گے ز (ہم جنس پسند) نہیں ہوتے ہیں جیسے آپ کے ملک میں ہوتے ہیں...۔''

۲۵ ستمبر ۲۰۰۷ء کی ایک شام سابق ایرانی صدر محمد احمدی نژاد نے کولمبیا یونیورسٹی نیو یارک میں جب ایک سوال کے جواب میں آئی وی لیگ اسکول کے لگ بھگ سات سو طالب علموں کے سامنے یہ بیان دیا تو پنڈال قہقہوں سے گونج اٹھا۔ کچھ ہی عرصہ پہلے ایران کے قانون کے مطابق دو نوجوان مردوں کو آپس میں محبت کرنے کے جرم میں سرعام پھانسی دے کر موت کے گھاٹ اتارا جا چکا تھا اور لاتعداد ایرانی اپنے ہمسایہ ملک ترکی کی سرزمین پر اُس وقت بھی امریکہ اور دیگر مغربی ممالک کے استنبول کے قانون دانوں کی معاونت سے جنسیت کی بنیاد پر امریکہ اور دیگر مغربی ممالک میں سیاسی پناہ حاصل کرنے کے لیے اپنا وطن ترک کیے بیٹھے تھے، کون جانے اس شام کولمبیا یونیورسٹی کے مجمع میں بھی ایسے 'ایرانی امریکن' موجود ہوں جو اِسی بنیاد پر پہلے سے امریکہ میں ہجرت کر چکے ہوں۔

''میں نہیں جانتا کس نے آپ کو یہ غلط معلومات پہنچا دی ہیں جب کہ ایران میں ہم جنسیت جیسی کوئی علت سِرے سے موجود ہی نہیں۔'' ایرانی صدر نے مزید وضاحت دیتے ہوئے مجمع کو اپنے انکار کا جواز پیش کیا تو حاضرین نے معززمہمانِ خصوصی کی ذہنی پختگی پر اپنے شک کا اظہار کرتے ہوئے خاصا تمسخر اڑایا۔ احمدی نژاد شاید ذہنی طور پر تیار نہ تھے کہ امریکہ جیسے ملک

میں نوجوان طالب علموں کو کسی بھی ایسے موقعے پر ہر نوعیت کا سوال اٹھانے کی جرأت اسکول کے ابتدائی برسوں میں ہی تہذیبی تجسس کے زمرے میں مل چکی ہوتی ہے، اس پر ترقی یافتہ مغربی ممالک کے تعلیمی اداروں میں 'ایل جی بی ٹی' (لزبین، گیز، بائی سیکچوئل اور ٹرانس جینڈر) طلبا و طالبات کی تنظیمیں بالکل اسی طرح اپنا منظم وجود رکھتی ہیں جیسے کھیل، ادب اور دیگر فنون لطیفہ اور سماجی وسیاسی دلچسپیوں کی حوصلہ افزائی کے لیے غیر نصابی سرگرمیوں کے پلیٹ فارمز نصابی عمل کے شانہ بشانہ اپنی موجودگی برقرار رکھتے ہیں۔ آج بھی یوٹیوب پر احمدی نژاد کے اس مضحکہ خیز تاریخی دعویٰ کا کلپ، بین الاقوامی سیاست اور سماجی علوم کے محققین، انسانی حقوق کی عالمی تنظیمیں ایرانی ریاست کی قومی سطح پر اجتماعی خود فریبی اور مسلمانوں کی تہذیبی نرگسیت کے حوالے سے ایک معروف مثال سمجھا جاتا ہے۔ کہنے کو احمدی نژاد نے اپنی کم علمی ظاہر کرتے ہوئے ایک ناقابل قبول حقیقت سے نظریں چرانے کی کوشش میں جھوٹ بول دیا تھا لیکن غور کرنے پر یہ بات بھی سمجھ میں آجاتی ہے کہ طالب علموں نے جس تناظر میں یہ سوال اٹھایا ہوگا، ایرانی صدر اپنے انکار میں کسی حد تک غلط بھی نہ تھے۔ آج اگر صدر یا وزیر اعظم پاکستان سے بھی یہی سوال ایسے ہی کسی بے ساختہ جمہوری ماحول میں پوچھ لیا جائے تو یقیناً ان کا جواب بھی لگ بھگ ایسے ہی فکری الجھاؤ پر مبنی ہوگا۔ یہ سچ ہے کہ پاکستان میں بھی ایران، عرب امارات اور سعودی عرب جیسے دیگر قدامت پسند مسلم ممالک کی طرح جنسی میلان کی بنیاد پر 'ایل جی بی ٹی' برانڈ کی کسی بھی اقلیت کا سماجی وجود سِرے سے ہے ہی نہیں، البتہ اغلام بازی یا امرد پرستی (جو کسی حد تک ہم جنسیت یا ہوموسیکچوئلٹی کے زمرے میں آتی ہو) ایک جرم، اخلاقی بے راہ روی، ذہنی کج روی، غیر فطری علت کے طور پر جانی جاتی ہے، ہاں بطور ممنوعہ موضوع کے اپنی ایک منافقانہ حیثیت ضرور رکھتی ہے۔

دنیا بھر میں شہریت کے قوانین کے معاملے میں 'ایل جی بی ٹی رائٹس' کو بنیادی انسانی حقوق کی بریکٹ میں ریاست کی سطح پر اخلاقی قبولیت کا درجہ دیے جانے پر کھل کر بات کی جا رہی ہے لیکن پاکستان میں بھی چونکہ ایران کی طرح اس نوع کے جنسی فعل کو قانونی طور پر جرم گردانا جاتا ہے، اس لیے تا حال جنسیت سے قطع نظر فقط ٹرانسجینڈر یا خواجہ سراؤں کی سرکاری طور پر شناخت ۷۰ سال بعد اب کہیں جا کر عدالت عظمیٰ نے منظور کی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ پاکستان میں خواجہ سراؤں کی کمیونٹی خطے میں ایک تاریخی اور روایتی تناظر میں اپنی ایک سماجی پہچان رکھتی ہے جو دراصل نسل در نسل کچھ ایسی اساطیری کہانیوں کی لپیٹ میں معاشرتی قبولیت کے درجے پر فائز ہے

جس کا فائدہ نہ صرف خواجہ سراؤں کی اکثریت بلکہ ان کے ساتھ وابستہ دیگر سماجی اور معاشی ادارے بھی اٹھا رہے ہیں۔ حال ہی میں ملک کے مختلف حصوں میں خواجہ سراؤں پر تشدد اور ان سے نفرت کی بنیاد پر قتل کی وارداتوں نے سول سوسائٹی، انسانی حقوق کی تنظیموں، میڈیا اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کو ملکی سطح پر یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ خواجہ سرا ملک میں اکثریت کے ہاتھوں محض تمسخر اُڑانے اور تحقیر و تذلیل کی زد میں آنے کے لیے نہیں ہیں بلکہ انھیں بھی معاشرے میں انسانوں کی طرح عزت کے ساتھ جینے کا حق دیا جا سکتا ہے۔ یقیناً سرکاری اور سماجی سطح پر انسان دوستی کی یہ تحریک پاکستان جیسے ملک کے لیے خوش آئند ہے جس کی اکثریت ناخواندگی اور ذہنی اور معاشی پس ماندگی کے باعث مذہبی تنگ نظری اور جنونیت کا شکار ہے۔ اس وقت پاکستان کے مرکزی شہروں میں 'شی میلز' کے حقوق کی حفاظت کے لیے خواجہ سراؤں نے چند بین الاقوامی غیر سرکاری تنظیموں کی معاشی اور علمی معاونت سے بہت سے پلیٹ فارمز منظم کر رکھے ہیں جو ملکی سطح پر 'ٹرانسجینڈر' کے حقوق اور وقار کی بحالی کے لیے سرگرمِ عمل ہیں۔

کچھ عرصہ قبل سیالکوٹ میں مشی نامی ٹرانسجینڈر پر مجابد معاش نامی گروہ کے غیر انسانی تشدد کی وڈیو وائرل ہوتے ہی قومی میڈیا اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کی وساطت سے ملزمان کے خلاف جو قانونی کارروائی کی گئی ہے، سماجی حلقوں میں حکومت کے اس اقدام کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے۔ اس کی ایک وجہ یقیناً یہ بھی ہے کہ خواجہ سراؤں سے متعلق پاکستان میں نسلوں سے جو 'متھ' رائج ہے، وہ جنسیت کے حوالے سے نہیں بلکہ روحانیت کے حوالے سے ہے۔

تاریخ میں خواجہ سراؤں کی روایت ہمیں مغلیہ دور حکومت میں حرم سراؤں کی معاشرت میں نظر آتی ہے اور موجودہ دور میں انھیں معرفت کی کسی ایسی منزل پر سمجھا جاتا ہے کہ ان کی بددعا ساتوں آسمانوں تک اپنی رسائی رکھتی ہے، عموماً بچوں کی پیدائش اور شادی بیاہ کے موقعہ پر یہ ہمیں ناچتے گاتے یا نذرانے لیتے دکھائی دیتے ہیں۔

گزشتہ چند برسوں سے شہری آبادیوں میں خواجہ سرا ہمیں گداگری کرتے ہوئے بھی دکھائی دے رہے ہیں ان میں سے بیشتر جنسی مزدوری بھی کرتے ہیں اور میلوں، عرسوں میں تماش بینوں اور گاہکوں کا دل لبھاتے نظر آتے ہیں۔ اندرون سندھ اور حیدرآباد، عمرکوٹ جیسے بیشتر علاقوں میں خواجہ سراؤں کی ایک خاص کمیونٹی خود کو فقیر کہلوانے پر مصر ہے، یہ خواجہ سراؤں کی وہ خاص کیٹگری ہے جو پیدائشی طور پر 'اے سیکچوئیلز' ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور فقر کا بھید اوڑھے

اپنی پراسراریت کا پرچار کرتے ہیں۔ قطع نظر خواجہ سرا کی معاشرت کے اسرار ورموز، حال ہی میں میڈیا کی توجہ بننے والا 'سیالکوٹ تشدد' ٹرانس جینڈر کی حقیقت پر آپ ہی آپ بہت سے سوال اٹھانے کا باعث بن رہا ہے جس کی وجہ تشدد کرنے والے ملزم مرد کا وہ بیان ہے جس کے مطابق 'مشی' کے ساتھ اس کی دوستی اور جذباتی تعلق کا اعتراف ہے۔

نجی ٹی وی چینلوں پر ضلعی اور صوبائی سطحوں پر منظم کیے گئے رجسٹرڈ شی میلز رائٹس فورمز کے عہدیداران جو بذات خود بھی ٹرانس جینڈر رہیں، قومی نیٹ ورک پر ببانگ دہل یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ ہم ٹرانس جینڈر کو گیز نہ سمجھا جائے، امرد پرستی اور اغلام بازی سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔

شعیب منصور کی بین الاقوامی شہرت یافتہ فیچر فلم 'بول' اور اس موضوع پر بننے والے بیشتر ٹیلیویژن ڈراموں کی کہانی خواجہ سراؤں کے ساتھ وابستہ اس 'مِتھ' کی بنیاد پر گھڑی گئی ہے جس کے مطابق خواجہ سرا پیدائشی طور پر جنسی شناخت سے محروم ہوتے ہیں اور یہ کہ جب بھی ایسے کسی بچے کی پیدائش ہوتی ہی علاقے کے خواجہ سرا نومولود کے والدین سے اپنی امانت کا مطالبہ کرنے کے لیے وارد ہو جاتے ہیں اور یہ کہ ان کے ڈیروں پر پیدائشی خواجہ سراؤں کو پال پوس کر جوان کیا جاتا ہے، اس من گھڑت کہانی کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔

پاکستان کے تعلیمی اور تحقیقی اداروں میں چونکہ اس موضوع پر سنجیدگی سے کسی بھی انتھروپالوجیکل اسٹڈی کی ہمیشہ سے کمی رہی ہے، اس لیے سائنسی اور علمی بنیادوں پر ایسے اساطیری پرچار کو آج تک چیلنج نہیں کیا جا سکا، حقیقت جاننے کی اس چشم پوشی کی ایک بڑی وجہ تو وہی اجتماعی انکار 'collective denial' ہے جس کا اظہار سابق صدر ایران نے کولمبیا یونیورسٹی میں کیا تھا اور دوسری وجہ وہ خوف یا فوبیا ہے جو صدیوں سے مسلم معاشروں کا وتیرہ رہا ہے اور یہ خوف ہی اِن معاشروں کو کسی بھی صورت پسماندگی سے تہذیبی ترقی کی جانب قدم بڑھانے نہیں دیتا ہے۔

بات معاشرے میں جنسیت کے حوالے سے مختلف صورتوں کی ترویج اور تبلیغ کی نہیں، ضرورت اس فکر کی ہے کہ ایک ہوموفوبک سوسائٹی اسی طرح اپنے آپ پر ذہنی کشادگی کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند کر لیتی ہے جیسے آج کی دنیا کی تہذیب یافتہ اور ترقی یافتہ قومیں اسلاموفوبیا اور زینوفوبیا کی زد میں آ کر انسان دوستی اور ہم آہنگی کے بنیادی تہذیبی اصولوں سے دور ہونے کو پر تول رہی ہے اور خدشہ ہے کہ یہ حقیقت مجموعی طور پر آج کے انسان کے فکری اور اخلاقی ارتقا کی راہ میں ایک ایسی دیوار ثابت ہوگی جسے آنے والے زمانوں میں گرانا آسان نہ ہوگا۔

ہم جنسیت کا سوال اور عام تعصبات کی نفسیات

تصنیف حیدر

پچھلے دنوں ہمارے ایک دوست نے سوال کر دیا کہ بھائی! یہ ہم جنسیت اگر عام ہو جائے اور اس کا جواز اس بات کو بنا لیا جائے کہ ایک انسان اپنی فطرت سے مجبور ہے اور وہ جو کچھ کرنا چاہتا ہے، اس سے اسے روکنا انسانی اخلاقیات کے خلاف ہے تو کیا غیر قدرتی جنسی رشتوں کی باڑھ نہیں آ جائے گی؟ کیا ایسا نہیں ہوگا کہ لوگ پھر اپنے جانوروں کے ساتھ جنسی رشتے بنائیں گیا ور اس عمل کا جواز اس بات کو ٹھہرائیں گے کہ یہ ہماری مرضی ہے، چنانچہ کسی اور کو اس میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔

اول تو مجھے اس بات پر اب ہنسی آتی ہے جب یہ غیر قدرتی کی پخ کسی بات میں لگا دی جائے۔ میں بھی اسی چکر میں پڑا رہتا اگر جنوبی ہندوستان کے متنازع فلسفی اور مصلح پیریار کی تحریریں میری نظر سے نہیں گزرتیں۔ ایک جگہ اس نے لکھا کہ کسی بات کو غیر قدرتی ثابت کر دینے سے کیا وہ غلط ہو جاتی ہے؟ اس نے پوچھا کہ لباس کیا قدرتی چیز ہے؟ کیا ہمارے رہائشی مکانات قدرتی طریقہ ہیں؟ بالکل اسی طرز پر سوچ کر دیکھیے تو اس وقت تو کچھ بھی قدرتی رہا ہی نہیں ہے۔ ہم چاروں طرف سے مصنوعی آسائشوں میں گھرے ہیں؟ یہاں تک کہ جس ٹکنالوجی کی مدد لے کر مجھ سے یہ سوال پوچھا گیا ہے کیا وہ خالص قدرتی دریافت ہے؟ فرج میں رکھا ٹھنڈا پانی قدرتی نہیں، واشنگ مشین میں کپڑوں کو گھسنے والا آلہ قدرتی نہیں، محبوبہ کے ساتھ ویڈیو کالنگ کا ذریعہ قدرتی نہیں مگر پھر بھی کسی انسانی عمل میں قدرتی کا فیتہ جوڑنا اصل میں اس پر اپنے احتجاج کی کمزور آواز کو

واضح کرنا ہے۔ قدرت کے تعلق سے ہمارا ایک ازلی تعصب ابھی تک ہمارا پیچھا کر رہا ہے، ہم سمجھتے ہیں کہ جو کچھ قدرتی ہے، وہ مفید ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ قدرت، دراصل ایک سہولت ہے۔ ہمارے سانس لینے کے عمل میں، ہمارے جینے کے عمل میں یہ معاون ہے، مگر یہ سب کچھ نہیں ہے۔ ہمیں جو چیزیں قدرتی طور پر ملی ہیں، انھیں جس کا تس قبول کرلیا جائے اور اس میں انسانی عمل دخل کو سرے سے خارج کر دیا جائے تو آپ کا زندہ رہنا بھی مشکل ہو جائے گا۔ اس میں کیا شک ہے کہ اگر ہم صرف قدرتی وسائل پر بھروسہ کرتے اور اپنی ذہنی و عملی قوتوں کو بروئے کار نہ لاتے تو آج بھی ہم بربریت کے عہد میں جی رہے ہوتے۔ انسان کا سب سے پہلا غیر قدرتی عمل کسی غار میں پناہ لینا تھا، دوسرا غیر قدرتی عمل غذا کی تلاش کی تکنیک دریافت کرنا تھا۔

ہمارے فاضل دوست کا سوال پورے انسانی سماج کے ذہن پر حاوی ہے۔ اول تو یہ سمجھنا ہی بے وقوفی ہے کہ اگر دو لوگوں کو ہم جنسیت کی اجازت اس بنا پر دی جائے کہ ان کو اپنے مخالف جنس کے ساتھ جنسی تسکین حاصل نہیں ہوتی تو پورا سماج اور پوری دنیا اس قسم کے فعل میں ملوث ہو جائے گا، انسانی سماج کا تانا بانا بگڑ جائے گا، ہر شخص کورا ہم جنس پرست بن کر رہ جائے گا اور اس طرح انسانی سماج تولیدی عمل کو ترک کر دے گا، مزید نسلیں پیدا نہیں ہوں گی اور دنیا میں انسان کا وجود اگلے دس بیس پچاس برسوں میں ختم ہو جائے گا۔

کشور ناہید نے ایک کتاب، جو 'سکینڈ سیکس' کا ترجمہ اور تلخیص ہے، لکھتے وقت اس میں کہیں لکھا ہے کہ وہ ذاتی طور پر اس فعل کو یعنی ہم جنسیت کو پسند نہیں کرتی ہیں اور اس کا جواز بھی جہاں تک مجھے یاد ہے، انھوں نے یہی دیا ہے کہ یہ ایک غیر قدرتی فعل ہے۔ بہر حال اردو میں اس موضوع پر کم لوگوں نے لکھا ہے۔ عصمت چغتائی کی کہانی 'لحاف' ہم سبھی پڑھتے ہیں، مگر وہ کہانی اب پڑھتا ہوں تو اس میں کافی جھول نظر آتے ہیں۔ اول بات تو کہانی میں یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہم جنسیت ایک قسم کے فرسٹریشن سے پیدا ہوتی ہے، یعنی اگر کہانی میں موجود ہم جنس عورت کو اس کا شوہر توجہ دیتا تو وہ ایسی ہرگز نہ ہوتی اور پھر اس عمل کو آخر میں اس طرح دکھایا گیا ہے کہ اس سے ایک قسم کا ہول پیدا ہوتا ہے، وحشت ہوتی ہے۔ ہم مان سکتے ہیں کہ یہ کہانی عام ہندوستانی معاشرے کی حبس زدہ زندگی میں جنم لینے والی ہم جنسیت کی ایک مثال ہے مگر عصمت کے لکھے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی کہیں نہ کہیں اس عمل کو پسند نہیں کرتیں۔ ان کا سارا زور اس گھٹن پر ہے، عورت اور مرد کے اس تعلق پر ہے، جس کے کمزور پڑتے ہی ہم جنسیت

کا بھوت معاشرے میں گشت لگانا شروع کردے گا۔ ایک قدم اور بڑھ کر کہوں تو 'لحاف' ہم جنسیت سے بھی زیادہ پیڈوفیلیا پر لکھی ہوئی کہانی ہے۔ اس رجحان کا میں خود بھی مخالف ہوں، خواہ اس کے حق میں سائمن دی بووا جیسی عورتیں ہی کیوں نہ رہی ہوں اور دیکھا جائے تو ادیبوں کا زیادہ تر معاشرہ، شاید دنیا بھر میں ایک عرصے تک ہم جنسیت کے بجائے پیڈوفیلیا یعنی کم عمر بچوں کے ساتھ جنسی رشتے قائم کرنے پر زور دیتا رہا۔ بعضوں نے تو اس کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور قانونی طور پر کسی کی بلوغت کو قبول کرنے کے مسئلہ پر سوال قائم کردیا اور یہ دیکھ کر شاید ہنسی بھی آئے کہ ان میں سے کچھ ایسے بھی ہوں گے جو 'چائلڈ میرج' یا 'بال وواہ' کے خلاف ہوں گے۔

امرد پرستی کے حق میں کبھی بلا سوچے سمجھے میں نے کچھ لکھا تھا، اب مجھے اس بات کو کہنے میں کوئی جھجھک نہیں محسوس ہوتی کہ یہ رجحان نہایت غیر اخلاقی، تباہ کن اور نابالغ بچوں کو ذہنی طور پر نقصان پہنچانے کا مادہ رکھتا ہے، اس لیے اس پر قانونی طور پر روک لگنی چاہیے اور اس رجحان کی پرورش کم از کم ادیبوں کی طرف سے بالکل نہیں کی جانی چاہیے۔ ہم نابوکوو کی 'لولیتا' اور مارکیز دی ساد کے 'جسٹین' جیسے ناولوں کی جمالیاتی، لسانی یا ادبی سطح پر قدر کرسکتے ہیں، مگر ان رجحانات کی تشہیر کا سامان نہیں کرسکتے اور انھیں اخلاقی طور پر کارآمد نہیں مان سکتے۔ اگر پھر بھی میں بطور ادیب اسے اخلاقی سطح پر برا نہیں سمجھتا تو مجھے کوئی حق نہیں کہ کسی ایسی خبر پر ناک بھوں چڑھاؤں جس سے معلوم ہو کہ کوئی باپ، اپنی نابالغ بچی کے ساتھ برسوں تک بہلا پھسلا کر اس کا ریپ کرتا چلا گیا۔

اردو میں مجھے ایک ہی کہانی ایسی ملی ہے، جس میں ہم جنسیت کی صحیح تصویر پیش کی گئی ہے اور وہ ہے چودھری محمد علی ردولوی کی 'تیسری جنس'۔ عصمت کے برخلاف اس کہانی کو اس طرح نہیں لکھا گیا کہ اس میں ہم جنسیت کو کوئی برا یا غیر اخلاقی فعل سمجھا جائے بلکہ اسے پڑھنے والے کی بصیرت پر چھوڑا گیا ہے۔ ردولوی بڑے زبردست فکشن نگار تھے، فلسفی بھی تھے مگر کہانی کار کے طور پر ان کی دریافت ابھی ٹھیک سے نہیں ہو پائی۔ گناہ کا خوف، میٹھا معشوق اور نہ جانے کیسی کیسی کہانیاں انھوں نے لکھیں، جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اردو زبان میں وہی پہلے آدمی تھے جنھوں نے انیسویں صدی میں 'پردے کی بات' جیسا مضمون لکھا اور عورتوں کو کنڈوم کے استعمال کے ساتھ ساتھ ان تاریخوں کے بارے میں بھی بتایا جن میں اپنے شوہروں کے ساتھ جنسی عمل کرنے سے بچنے پر وہ بلا سبب حاملہ ہونے سے محفوظ رہ سکتی تھیں۔ 'تیسری جنس' کے حوالے سے کہا جاسکتا ہے کہ انگریزی کے تھرڈ جینڈر کا ترجمہ ردولوی نے غلط کیا۔ مگر مادھوی مینن کی کتاب 'دی ہسٹری آف

ڈیزائر ان انڈیا' (ہندوستان میں جنس کی تاریخ) پڑھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ 'کام سوتر' کے مصنف واتسائن نے بھی اپنی اس تصنیف میں ایسے لوگوں کے لیے، جو مرد ہوکر مردوں کے ساتھ یا عورت ہوکر عورتوں کیساتھ رشتہ بنائیں، تھرڈ جینڈر کا لفظ ہی استعمال کیا ہے۔ البتہ منطقی طور پر اس سے بحث کی جاسکتی ہے کہ یہ کتنا درست یا نادرست ہے۔

اردو میں ہم جنسیت کے لیے کوئی تحریک نہیں چلائی گئی۔ سنتے ہیں کینیڈا میں افتخار نسیم نام کے ایک شاعر تھے، ان کا کچھ کلام پڑھا ہے۔ بہت اچھا معلوم ہوا مگر دیکھتے ہیں کہ اب ان کا بھی کوئی نام لیوا نہیں ہے۔ وجہ یہ تھی کہ وہ کھلے طور پر اپنی ہم جنسیت کا مظاہرہ کرتے تھے۔ واجد علی سید کے بقول اپنے ایک سردار پارٹنر کے ساتھ رہتے تھے۔ زندگی بھر ان کے گھر والوں نے انھیں نہیں اپنایا، مگر ان کے مرتے ہی ان کی جائیداد پر قابض ہونے کے لیے تل گئے۔ اصل میں یہ سب باتیں بتاتی ہیں کہ ہم جنسیت کے خلاف ہمارا یہ 'غیر قدرتی' کا الاپ کیسی سوچی سمجھی سازش ہے۔ دوسرا جو خوف ہم پر طاری کیا جاتا ہے، یعنی یہی کہ دنیا کا نظام تہہ و بالا ہوجائے گا، یہ اس سلسلے میں بھی تھا کہ اگر آزاد جنسی رشتوں کو قبول کرلیا گیا تب بھی ایسا ہوگا، جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کے بیشتر ملکوں میں ان رشتوں کو قبول کرلیا گیا ہے اور ان کو ایسا کوئی نقصان نہیں ہوا، کوئی اتھل پتھل نہیں مچی۔ دنیا تباہ نہیں ہوگئی۔ ٹھیک یہی ہم جنسیت کے ساتھ ہونا ہے۔

ہمارا یعنی خاص طور پر ادیبوں کی جماعت کا ہم جنسیت سے خوف کھانا خطرناک ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ادیبوں کا طبقہ دنیا بھر میں تمام دوسرے طبقات کے مقابلے میں زیادہ دانش مندی سے کام لیتا ہے، اس کے یہاں چیزوں کو ان کی عجیب و غریب اور انوکھی اور نئی شکلوں کے ساتھ قبول کرنے کا حوصلہ ہوتا ہے، وہ سماج کو زیادہ بدلتا ہوا محسوس کرتا ہے اور ایسی کسی بھی چیز کو، جس کو کرنے سے کسی تیسرے شخص کی زندگی متاثر نہیں ہوتی، قبول کرتا ہے۔ مگر یہاں تو ہم دیکھتے ہیں کہ حال عجب ہے اور ہم ہی اس بات سے ڈرے ڈرے اور گھبرائے گھبرائے گھوم رہے ہیں کہ دو مرد یا دو عورتیں اپنی مرضی سے اپنی تنہائی میں جسمانی رشتہ نہ بنالیں۔

جہاں تک رہی جانوروں کے ساتھ جنسی رشتہ بنانے کی بات، تو اول تو میں نہیں سمجھتا کہ جانور کے ساتھ رشتہ جانور کی مرضی حاصل کرکے بنایا جانا ممکن ہے۔ اور مجھے نہیں لگتا کہ ایسا طریقہ دریافت کیا جا بھی سکے گا یا نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاں تک میں جانتا ہوں، جنسی تعلق جانوروں کے لیے لذت حاصل کرنے کی چیز نہیں ہے، وہ ان کے یہاں تولیدی فعل کے طور پر

استعمال ہونے والی چیز ہے۔ زیادہ تر جانوروں میں اسی لیے جنسی عمل قائم کرنے کے موسم اور دورانیے تک طے ہوتے ہیں۔ پھر بھی میں اس معاملے کا ماہر نہیں ہوں، مگر یہی کہوں گا کہ کسی کو بھی یہ حق حاصل نہیں ہے کہ کسی کے ساتھ زبردستی جنسی عمل انجام دے۔ جنسی عمل تو چھوڑ یے، زبردستی تو کسی کو اپنے ساتھ بٹھا کر ایک کپ چائے پلانا بھی میری نظر میں اچھا عمل نہیں ہے۔

باقی رہی دنیا کی بات تو وہ کون سا کسی کی بات پر کان دھرتی ہے۔ جسے جو کرنا ہے وہ ویسے بھی کر رہا ہے، ہم تو ایک خیالی دنیا کی بات کرتے ہیں جہاں چیزیں ویسی ہوں، جیسا انھیں ہونا چاہیے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ انسانی سرشت زبردستی کی خواہش سے بالکل پاک ہے، بلکہ کچھ لوگ تو چاہتے ہیں کہ جنسی عمل میں ان کا پارٹنر ان کے ساتھ زبردستی کرے، مگر یہ خواہش ان کے پارٹنر پر واضح ہونی چاہیے اور انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ سامنے والا کون سا 'نہیں' کس مرحلے پر کہہ رہا ہے۔ یہ زبردستی بھی کتنی اور کس حد تک ہو یہ دو لوگوں کو مل کر طے کرنا چاہیے۔

ایران میں شاہد بازی

ظہور شہداد اظہر

ازمنہ قدیم میں شاہد بازی ہمیشہ کسی نہ کسی صورت میں ہر سماج میں موجود رہی ہے۔ مذہبی کتابوں میں بھی مختلف اقوام کا حال تفصیل سے ملتا ہے جو شاہد بازی میں مبتلا تھا۔ 'Sodomy' کی اصطلاح ہی قوم سدوم کے نام پر قائم ہے۔ عربی میں اس کے لیے 'لواطت' مخصوص ہے جو قوم لوط سے نسبت کی وجہ سے ہے۔ اس زمانہ میں یہ لوگ راہگیروں اور مسافروں کے ساتھ بالجبر یہ فعل شنیع کیا کرتے تھے اور یہی وجہ ان کی تباہی کا باعث بنی۔

قدیم یونانیوں میں یہ دستور تھا کہ حسین وجمیل لڑکوں کی پرورش وہ الگ ڈھنگ سے کیا کرتے تھے۔ ان کو نسوانی ملبوسات میں آراستہ کر کے عورتوں کی صحبت میں رکھا جاتا تھا تا کہ ان میں نسوانی خصوصیات پیدا ہوں، پھر ان کو مخصوص خاطر داروں کی تقاریب میں مہمان نوازی کے فرائض سونپے جاتے تھے تا کہ وہ خاص مہمانوں کے جی لبھا سکیں۔ رومی بھی جہاں جہاں گئے، اپنے گرم حماموں کی طرح یہ رسم بھی ہر جگہ ساتھ لیتے گئے۔ بیسویں صدی میں بھی یہ شاہد بازی اپنے پورے عروج پر نظر آتی ہے؛ کہیں زیر زمین تو کہیں بالائے زمین۔ سوئیزرلینڈ میں دو شاہد باز فاعل اور مفعول شادی کر سکتے ہیں اور یہ قانوناً جائز ہے۔ اسی طرح شاہد بازی امریکہ، برطانیہ میں ایک سماجی روایت ہے، جب کہ افغانستان، ہندوستان، پاکستان میں یہ روایت تواتر کے ساتھ جاری ہے، حالاں کہ اسلام کی وجہ سے اس کی کوئی سماجی حیثیت نہیں ہے۔

ایرانی سوسائٹی میں شاہد بازی کافی گہرائی تک اُتر چکی تھی اور ایک تاریخی حقیقت بن

چکی تھی۔ یہ امیروں اور رئیسوں کا روزانہ شعار تھی۔ فردوسی اپنے پیش رو دقیقی کے بارے میں لکھتا ہے کہ دقیقی کا اپنے ترک غلام کے ساتھ امرد بازی کا رشتہ تھا، اس پر فدا تھا۔ وہ یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ 'باوے لا یہ می کرد'

اپنے 'شاہ نامے' کے دیباچے میں فردوسی اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ آخر اسی ترک غلام ہاتھوں دقیقی قتل ہوا۔

فارسی شاعری میں شاہد بازی کو معتصم باللہ کے عہد میں کافی عروج حاصل ہوا۔ معتصم باللہ (۲۱۸ھ-۲۲۷ھ) کی ماں ترک تھی۔ اس کے عہد میں عرب سرداروں کی جگہ ترک سرداروں نے لے لی۔ اقتدار کی اس رسہ کشی میں بہت سے عرب سردار جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ عرب سرداروں کے ساتھ خلیفہ المتوکل اپنے بیٹے اور ترک پاسبانوں کی سازش سے قتل ہوا۔ پھر ایک دوسرے کے بعد خلیفہ المستعین، خلیفہ المتغر ترکوں کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ ترک چونکہ حسن و جمال میں یکتا تھے، اس لیے بڑے بڑے سردار، امیر اور با اثر لوگ ترک بچے خرید کر ان کے ساتھ معاشقہ کیا کرتے، ان پر فدا ہوتے، ان پر سب کچھ نچھاور کرتے۔ سلطان محمود غزنوی اور ایاز کے عشق کی داستان ایک تاریخی ہے۔ جب شاعر اس مطلق العنان بادشاہ کی خدمت میں قصیدہ پیش کرتا ہے تو بادشاہ کے ساتھ ساتھ اس کے غلام ایاز کی بھی تعریف کرتا ہے اور بادشاہ ذرا بھی تیور نہیں بدلتا۔ شاعر جانتا ہے کہ ایاز پہلے بادشاہ کا معشوق ہے پھر غلام، پھر فوجی افسر، پھر مقرب۔ فرخی محمود کی ایک معرکہ آرائی کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:

بروز روشن از غزنین بروں رفت
ہمی رد با جہانے تا شب تار
نماز شام را خنداں بخوانید
کہ دشت از کشتہ شد با پشتہ ہموار

پھر ایاز کے حسن و جمال کی تعریف کرتے ہوئے فرخی لکھتا ہے:

یکی گوید کہ آں سرویست برکوہ
دگر گوید گلے تازہ است بربار
نہ برخیزہ بدر دل داد محمود
دل محمود را یازی میندار

جہاں آقا اور غلام کے اوصاف ایک ساتھ گنائے جاتے ہوں، وہاں باہمی تعلقات کا کیا ٹھکانا؟ نظامی، عروضی، سمرقندی ایک اور واقعہ کے بارے میں لکھتا ہے کہ ایک رات محمود بزم عیش وطرب میں غرق تھا۔ مستی کے عالم میں اس کی نظر ایاز پر پڑی۔ ایاز کی شکن در شکن زلفیں اس کے چہرے پر بکھری پڑی تھیں۔ محمود نے بے اختیاری کے عالم میں ایاز کے گلے میں اپنی بانہیں ڈال دیں لیکن جلدی سنبھل کر جوش تقویٰ اختیار کرتے ہوئے ایاز کے ہاتھ میں خنجر تھما کر حکم دیا کہ اپنی زلفوں کو کاٹ ڈال۔ جب صبح کو محمود نے ایاز کی شکل بدلی بدلی دیکھی تو اسے سخت افسوس ہوا اور پریشانی کے عالم میں بار بار اٹھ کر بیٹھ جاتا۔ تمام درباری محمود کے اس اضطراب سے پریشان تھے۔ آخر علی قریب درباں نے عنصری سے محمود کی یہ کیفیت بیان کی۔ عنصری نے محمود کے سامنے جا کر یہ رباعی پڑھی:

کے عیب سر زلف بت کاستن است
چہ جائے بہ غم نشستن و خاستن است
جائے طرب ونشاط و مے خواستن است
کاراستن سرو پیراستن است

(ترجمہ: معشوق کی زلفوں کا کاٹا جانا عیب نہیں۔ لہٰذا غم کی حالت میں اٹھنا بیٹھنا ٹھیک نہیں بلکہ یہ خوشی اور مے نوشی کا مقام ہے کیوں کہ سرو کی خوب صورتی اس وقت دوبالا ہوتی ہے جب اس کو تراشا جا چکا ہو۔)

اس رباعی کو سن کر محمود کو کچھ تسکین ہوئی اور عنصری کا منہ جواہرات سے بھرنے کا حکم دیا۔

محمود کو اپنے ایک اور غلام طغرل سے بھی بہت محبت تھی۔ ابوالفضل بیہقی نے لکھا ہے کہ ایک روز محمود نے باغ فیروزی میں محفل مے نوشی کا اہتمام کروایا۔ اس محفل طرب میں محمود کا بھائی امیر یوسف بھی موجود تھا۔ مختلف غلاموں نے شراب پلائی۔ آخر میں طغرل کی باری آئی۔ طغرل سرخ کپڑوں میں ملبوس لالۂ صحرائی بنا ہوا تھا۔ امیر یوسف نشے میں دھت طغرل کے چہرے پر نگاہ ہوس برابر جمائے بیٹھا تھا۔ محمود نے امیر یوسف کی یہ حالت دیکھ لی اور آتش حسد سے بھنّا کر کہا، ''اگر حرمت رواں پدرم نہ بودے، ترا حاشے تحت رسیدے۔'' (ترجمہ: اگر مجھے اپنے والد کے روح کی ناموس کا خیال نہ ہوتا تو میں تجھے اونٹ کے نیچے دے ڈالتا۔)

یہ ترکان لالہ رو رزم و بزم دونوں میں اپنے جمال و کمال کے ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔ کافی ہمدانی ان ترکان گیسو بدوش اور زرہ پوشوں کے اوصاف یوں بیان کرتا ہے۔

ایں شوخ سواداں کہ دل خلق ستانند
گوئی ز کہ زادند بہ خوبی بہ کہ مانند

(یہ چنچل سوار جو لوگوں کے دلوں کو بے چین کرتے ہیں، کن کے جنے ہیں اور خوب صورتی میں کن کے مثال ہیں۔)

ترک اند بہ اصل اندر و مشک نیست ولیکن
از خوبی و زیبائی خورشید مشانند

(اصل میں یہ ترک ہیں۔ اگرچہ ان میں مشک نہیں لیکن خوب صورتی میں آفتاب سے مشابہت رکھتے ہیں۔)

در معرکہ سو زند ترا ز نار جحیم اند
در مجلس سازندہ ترا ز جور و جفا اند

(میدان حرب و ضرب میں جہنم کی آگ سے زیادہ جلانے کی خصلت رکھتے ہیں اور محفل نشاط میں حد درجہ جفا پیشہ ہیں۔)

با قرطۂ رومی ہمہ چو بدر منیر اند
برمرکب تازی ہمہ چو باد بر اند

(جب رومی گوشوارے پہنتے ہیں تو درخشاں دکھائی دیتے ہیں اور جب عربی گھوڑے پر سوار ہوتے ہیں تو ہوا سے باتیں کرتے ہیں۔)

در رزم بجز تیغ زدن رائے نہ دانند
در بزم بجز دل ستیدن گار نہ دانند

(میدان کارزار میں بغیر شمشیر چلانے کے اور کوئی خیال نہیں کرتے اور محفل عیش و طرب میں دل موہ لینے کے سوا کوئی کام نہیں رکھتے۔)

اس طرح یہ ترک بچے ساقی گری سے 'مصاحبت' کی منزل تک پہنچے اور 'مقرب' کی منزل سے 'محبوبیت' اور 'معشوقیت' کی منزل تک پہنچے اور جلوت وہ خلوت کے راز دار ٹھہرے۔ حکیم سنائی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

خادماں را ز بہر آں بخرند
تا برخسار شان ہمی نگرند

(لوگ اس لیے غلام خریدتے ہیں کہ ان کے حسن سے آنکھیں سینکیں۔ ان ترکان قیامت بردوش کے تیرِ نظر کا کون گھائل نہیں۔)

فرخی ایک زرہ پوش ماہ چہاردہ کو نصیحت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اسے خود اور زرہ اتار کر چنگ وساز میں مہارت حاصل کر لینی چاہیے، کیوں کہ یہی اس کے حسن کا تقاضا ہے۔

برکش اے ترک بیک سوفگن ایں جامۂ جنگ
جنگ بگیرد دنبہ درقہ و شمشیر از خدنگ

(اے ترک اٹھ! یہ جنگ کا لباس ایک طرف ڈال دے (اتار پھینک) کیوں کہ ڈھال اور شمشیر اور تیر سے جنگ نہیں لڑی جاتی۔

تو رخ روشن خود را بہ زرہ خود مپوش
کہ رخ روشن تو زیر زرہ گیرد زنگ

(تو اپنے ٹمٹماتے چہرے پر زرہ نہ پہن، اس لیے کہ ایسا کرنے سے تمھارے چہرے کی چمک دمک ماند پڑ جائے گی۔)

منوچہری اپنے غلام سے عشق کا اظہار اس طرح کرتا ہے۔

تکنم بر تو جفا ور تو جفا قصد کنی
نہ گدازم کہ کسے قصد جفائے تو کند

(میں تجھ پر ظلم نہیں کروں گا، اگرچہ تم ظلم کا ارادہ کرو گے۔ نہ کسی اور کو تجھ پر ظلم کرنے کے قصد کی اجازت دوں گا۔)

ابوالمعالی رازی ان ترکان زری پوش کی تعریف یوں کرتا ہے۔

یاریب ایں بچہ ترکان چہ بتاں اند کہ ہست
دیدۂ مردم نظارہ ازیشاں چوں بہار

(الٰہی یہ ترک بچے کیسے معشوق ہیں کہ ان کے دم سے خلق کی نگاہوں کو بہار کا نظارا مہیا ہے۔)

سلجوقی حکمران سلطان سنجر خوب صورت غلام خرید کر ان کے ساتھ معاشقہ کرتا اور ان پر

دولت دل کھول کر لٹاتا۔ جب سلطان خوارزم شاہ نے اہل خطا سے صلح کر لی، سعدی نے بھی کاشغر کا سفر کیا اور جب جامع مسجد کے مدرسے میں گیا تو وہاں ایک خوش جمال لڑکا زمخشری کی کتاب غالباً 'مفصل' پڑھ رہا تھا اور اس فقرے کی رٹ لگائے ہوئے تھا، 'ضرب زید عمراً'۔ سعدی نے اس لڑکے کو دیکھ کر کہا، ''خوارزم اور خطا میں صلح تو ہوگئی اور زید اور عمر کا جھگڑا اب تک ختم نہ ہوسکا۔'' لڑکے کو ہنسی آئی۔ اس نے نام ونشان پوچھا، سعدی نے اپنا وطن شیراز بتایا۔ لڑکے نے سعدی کے کچھ اشعار سننے کی فرمائش کی۔ سعدی نے دو عربی اشعار فی البدیہہ سنائے۔ لڑکے نے فارسی اشعار کی فرمائش کی۔ سعدی نے برجستہ کہا:

اے دل عشاق بہ دامے تو صید
ماتبو مشغول تو با عمر و زید

(اے عاشقوں کی جان! میں تیرے جال میں قیدی (تیرا چاہنے والا) ہوں اور میں تمھاری توجہ کا طالب اور تو عمر و زید کی طرف مشغول۔)

اور جب سعدی کو کاشغر سے رخصت ہونے کا وقت آیا تو انھوں نے عملی طور پر لڑکے سے اپنی محبت کا اظہار کیا۔ وہ خود لکھتے ہیں: ''ایں بگفتم و بوسۂ چند برسر و روئے یک دگر دادیم و وداع کردیم۔'' (یہ کہا اور چند بوسے سر اور رخسار کے لیے اور رخصت ہوا۔)

شبلی نے سعدی کے ہم جنسی کے رجحان کی ایک اور مثال 'شعرالعجم' میں دی ہے۔ ہمام، سعدی کا مشہور معاصر تھا۔ ہمام کی ملاقات سعدی کے ساتھ تبریز میں ہوئی۔ غسل کے بعد ہمام جب اپنے مکان میں آیا تو اس کا خوش رو غلام اس کو پنکھا جھل رہا تھا۔ سعدی غلام کے حسن کا حظ لینا چاہتے تھے مگر ہمام حائل تھا۔ دوران گفتگو ہمام نے سعدی سے پوچھا، کیا شیراز میں میرے اشعار کا چرچا ہے؟ سعدی نے کہا ہاں، یہ شعر بہت مشہور ہے:

درمیاں من و دلدار حجاب است ہمام
وقت آن ست کہ ایں پردہ بیک سو فگنم

سعدی لڑکوں کی دوستی کا برملا اظہار بھی کرتے ہیں:

ہمہ دانند کہ من سبزۂ خط دارم دوست
نہ چوں دیگر حیوان سبزۂ صحرائی را

(سبھی جانتے ہیں کہ میں ایک نوخیز 'خط' والے لڑکے کو دوست رکھتا ہوں نہ کہ کسی صحرائی

حیوان کو۔)

اور وہ منزل بھی آتی ہے کہ شیخ سعدی شاہد بازی کو اپنے مذہب میں مستحسن قرار دیتے ہیں۔

نام سعدی ہمہ جا رفت بہ شاہد بازی

ویں نہ عیب است کہ در م

(سعدی کی شہرت شاہد بازی کی وجہ سے چارسو ہوئی۔ اس میں کوئی قباحت نہیں، اس لیے کہ یہ ہمارے مذہب میں قابل تحسین ہے۔)

سعدی جیسے اکابر ہستی کے بعد خواجہ حافظ کی گرم بازاری بھی شاہد بازی میں کچھ کم نہیں۔ اگر ان کو شاہد بازی کا شہسوار کہا جائے تو کچھ مبالغہ نہیں۔ جب کوئی چیز سماج میں قبولیت عام حاصل کر لیتی ہے تو وہ مستحسن قرار پاتی ہے۔ شاہد بازی ان دنوں وجہ افتخار تھی جس طرح آج حرام کی دولت پر اِترانا فخر کی بات ہے۔ خواجہ حافظ فرماتے ہیں:

ای نازنین پسر تو چہ مذہب گرفتہ

کت خون ما حلال تر از شیر مادر است

(اے نازنین لڑکے تو نے کون سا مذہب اختیار کیا ہے کہ تیرے لیے ہمارا خون ماں کے دودھ سے زیادہ حلال ہے۔)

'نازنین پسر' کے علاوہ ان کا تعلق کئی اور بتان سنگ دل سے بھی ہے جن کی سنگ دلی کا یہ عالم ہی:

چند بناز پرورم مہر بتان سنگ دل

یاد پدر نمی کنند ایں پسران نا خلف

(میں کب تک ان سنگ دل محبوبوں کی ناز برداری کروں۔ یہ نامراد لڑکے اپنے والد کا بھی لحاظ نہیں کرتے۔)

ان کے علاوہ ایک چودہ سالہ عیار اور شیرین معشوق بھی ہے جس کے حسن و جمال کے آگے چودھویں کا چاند خار کھائے ہوئے ہے۔

چار دہ سالہ بتے چا یک و شیریں دارم

کہ بجان حلقہ بگوش است مہہ چار دہ اش

(میں چودہ سالہ مکار اور شیرین معشوق رکھتا ہوں کہ چودھویں کا چاند بھی دل و جان سے اس کا حلقہ بگوش ہے۔)

پھر ان کا دل ایک خوبرو، جو نہایت ہی فتنہ گر، ودہ خلاف اور عیار ہے، چھین لیتا ہے۔

دلم ربودۂ لولی و شے است شور انگیز
دروغ وعدہ وقتال وضع رنگ آمیز

(ایک خوب رو نے میرا دل چھین لیا ہے جو فتنہ گر اور جھوٹے وعدے کرنے والا ہے جس کی وضع غضب کی قاتل اور جو بلا کا عیار ہے۔)

پھر ایک دلاور جوان کے لیے دست بدعا ہیں جو عزلت نشینوں کی آہوں کی پرواہ نہیں کرتا۔

یارب تو آں جوان دلاور نگار دار
کز تیر آہ گوشہ نشیناں حذر نہ کرد

(پھر اپنے معشوق کے ہاتھوں قتل ہونا کتنا سعید جانتے ہیں۔)

گر آں شیریں پسر خونم بریزد
دلا چوں شیر مادر کن حلالش

(کیا تمام جنت کی نعمتوں کا ایک نعم البدل یہ نہیں کہ معشوق مے نوشی کرے اور تم اسے کہو پی اور وہ پی جائے۔)

نعیم روضۂ جنت بذوق آں نہ رسد
کہ بار نوش کنند بادہ و تو گوئی نوش

حافظ صاحب کے دلبر کا طفلانہ پن بھی ملاحظہ ہو اور ان کی دور اندیشی بھی۔

دلبرم شاہد و طفل است ببازی روزے
بکشدم زارم و در شرع نباشد گنہش

(میرا معشوق ایک کم سن لڑکا ہے۔ کسی دن کھیل کھیل میں جان سے مار ڈالے گا اور شرعی قانون کے مطابق کوئی باز پرس بھی نہ ہوگی، کیوں کہ شرعاً نابالغ کا فعل قابل مؤاخذہ نہیں۔)

دوسرے عشاق کی طرح خواجہ صاحب کو اپنے معشوق کا ہرجائی ہونا بالکل پسند نہیں۔ اپنے نازنین کو اس طرح سمجھاتے ہوئے کہتے ہیں:

نازنینے چوتو پاکیزہ رخ و پاک نہاد
بہتر آنست کہ با مردم بد نہ نشینی

لیکن عشق کے بازار میں زر کی شرط اولین ہے۔خواجہ صاحب اپنی مفلسی کا دُکھڑا اس طرح بیان کرتے ہیں۔

ززرت کنند زیور بزرت کشند بردر
من بے نوائے مضطر چہ کنم کہ زر نہ دارم

(لوگ تیرے لیے سونے کے زیور بناتے ہیں اور روپے کے زور سے تیری ہم آغوشی حاصل کرتے ہیں، میں مفلس وقلاش کیا جھک ماروں۔میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔)

شیر خان لودھی جو امرائے عالمگیری میں سے تھا، اپنی کتاب 'مرأۃ الخیال' میں لکھتا ہے:

حضرت عالمگیر شاہ در اوائل ایام سلطنت حکم کردہ بود کہ دیوان خواجہ حافظ شیرازی را مردم از کتب خانہائے خود برآرند و معلمان مما لک محروسہ بصبیان تعلیم نہ نمایند۔

شبلی نعمانی، خواجہ کے بارے میں لکھتے ہیں، ''خواجہ صاحب کے کلام میں جو جذبات ہیں، وہ خود ان کے واردات وحالات ہیں۔''

علامہ اقبال خواجہ حافظ کے بارے میں لکھتے ہیں:

مسلم و ایمان اور زنار دار
رخنہ اندر دینش از مژگان یار

اور ڈاکٹر عندلیب شادانی لکھتے ہیں، ''میرا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ خواجہ حافظ واقعی امرد پرست تھے لیکن ان کے اشعار سے کم از کم اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ ان کے عہد میں امرد پرستی نہ صرف یہ کہ معیوب نہ سمجھی جاتی تھی بلکہ فیشن میں داخل تھی اور ہر شاعر اپنے اشعار میں سوسائٹی کے مذاق اور ملکی رواج کے مطابق کسی نوخطہ یا سادہ رو سے عشق کا اظہار ضرور کرتا تھا۔''

یہاں یہ بات نظر میں رکھنا ضروری ہے کہ آخر تنقید کا فیصلہ کلام پر ہوتا ہے، شخصیت پر نہیں۔شاعری ہی عنوان بحث ٹھہرتی ہے۔جب شاعری ان حقائق کی ترجمان ہو تو چشم پوشی سے کیا حاصل؟ میر درد صوفی شاعر ہیں، اختر رومانوی ہیں۔مجاز انقلابی، جگر رندی وسرمستی کے شاعر ہیں۔ نقادوں کے فیصلے ان کے کلام کے بارے میں ہی تو ہیں۔شاعری کے آئینہ میں ہم شاعر کو دیکھتے

ہیں۔جب شاعر اعتراف کری:

حافظ چہ شد از عاشق و رند مست و نظر باز

بس طور عجب لازم ایام شباب است

(حافظ اگر رند و نظر باز ہے تو کیا ہوا۔ بہت سے عجیب طریقے لازمۂ شباب ہیں۔)

پھر اپنے معاصرین کے بارے میں کہتے ہیں:

مے خوارہ و سرگشتہ و رند ہم و نظر باز

واں کس کہ چو ما نیست دریں شہر کدام است

(مانا کہ ہم شرابی، رند اور عشق باز ہیں مگر شہر میں کون ایسا ہے جو ہم سا نہیں۔)

اپنے عہد کے صوفیان باصفا کے بارے میں حافظ کہتے ہیں:

صوفیاں جملہ حریف اند و نظر باز ولے

زاں میاں حافظ دل سوختہ بدنام

(جتنے صوفی ہیں سب عشق باز ہیں مگر ان میں سے حافظ دل سوختہ ہی بدنام ہو گیا، دوسرے بدنام نہ ہوئے۔)

یہ ایک حقیقت ہے کہ تیسری صدی ہجری سے ساتویں صدی ہجری تک امرد پرستی بغداد، ایران، سمرقند اور ماوراء النہر تک اپنے پورے بازو پھیلا چکی تھی اور فیشن آف دی ڈے بن چکی تھی۔ اب یہ کچھ صوفیوں کے مجازی عشق کی سیڑھی نہ تھی۔ ہر امیر، نواب، صوفی شاعر کا بچوں سے عشق کرنا شیوہ روزگار تھا، اس میں کوئی قباحت تھی نہ کسی قسم کی کسر شان۔ شاہد بازی اور بادہ آشامی لازم و ملزوم تھے، کوئی محفل، کوئی جلسہ ان کے بغیر ناتمام تھا۔ ڈاکٹر عندلیب لکھتے ہیں، ''امرد پرستی کا یہ سیلاب جتنا آگے بڑھتا چلا گیا، پُرزور ہوتا چلا گیا۔ چنانچہ سلجوقی دور میں یہ عالم تھا کہ عارف و عامی سب اس کی رو میں بہتے چلے جاتے تھے۔ اس دور کے ممتاز اور نامور شعرا اسی رنگ میں رنگے نظر آتے ہیں۔''

ساتویں صدی سے دسویں صدی ہجری تک شعرا شاہد بازی کے بغیر لقمہ نہیں توڑتے تھے۔ دسویں صدی ہجری میں امرد پرستی کیا رنگ اختیار کر لیتی ہے، اس کے مطالعہ کے لیے شہزادہ سام مرز ولد طہماسپ صفوی کا تذکرہ شعرا 'تحفہ سامی' جو ۹۵۷ھ کی تصنیف ہے، قابل سیر ہے جو دسویں صدی ہجری کی ایرانی سوسائٹی کی بہترین تصویر پیش کرتی ہے۔ چند شعرا کے حالات ملاحظہ ہوں:

مولانا حیرانی:

اصلاً قمی ہیں مگر ہمدانی مشہور ہیں۔ سلطان یعقوب کے ندیم تھے۔ کئی مثنویاں لکھی ہیں۔ کاشان میں ایک جوان پر عاشق ہوئے۔ لہٰذا کاشان کے قاضی نے آپ کو شہر بدر کرنے کا حکم دیا۔ اس موقع پر آپ نے قاضی کی ہجو میں جو قصیدہ کہا، وہ کافی مشہور ہوا جس کا مطلع تھا:

صباح عید اگر من دست آں نازک بدن بوسم
ز شادی تا بہ شب آں روز دست خویشتن بوسم

قاضی محمد:

مدتوں رَے کے قاضی رہے۔ وصالی تخلص کرتے تھے۔ جوانی میں صادق نامی ایک شخص پر عاشق تھے۔ اس نے آپ کو ایک حوض میں گرادیا اور آپ کا ہاتھ زخمی کر دیا جس کے متعلق کہتے ہیں:

عشق صادق اگر دست من شکست چہ باک
ہر آنکہ عاشق صادق بود چنیں باشد
بے ثبوت مرا احتیاج بینہ نیست
گواہ عاشق صادق در آستیں باشد

مولانا سائل:

(م ۹۲۸ھ) اصلاً رازی مگر ہمدانی مشہور ہیں۔ شاعر شیریں زبان تھے۔ اکثر اہل استعداد آپ کی صحبت کو غنیمت سمجھتے تھے۔ ایک جوان پر عاشق ہو گئے تھے جس کے دوستوں اور عزیزوں نے آپ کو سخت ایذائیں پہنچائیں۔ ایک دن ان لوگوں نے آپ کو برہنہ کرکے ذلیل کیا، مجبور ہو کر نہاوند کا راستہ لیا۔ آپ کا معشوق اس دن شکار کو گیا تھا۔ برف و باراں کا طوفان آ گیا اور وہ اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گیا۔ راستے میں دونوں کی ملاقات ہوئی۔ ساری رات عاشق و معشوق اکٹھے رہے۔

امیر ہمایوں:

ایام جوانی میں آپ تبریز میں سلطان یعقوب کے ایک جوان ملازم ولی بیگ نامی پر عاشق ہو گئے تھے۔ اس کی محبت نے آپ کو شاعر بنا دیا۔ سال بھر تک آپ ہر روز معشوق کی گزرگاہ پر بیٹھا کرتے تھے لیکن ملاقات نہیں ہوتی تھی۔ آخر کسی طرح یہ بات ولی بیگ تک پہنچی۔ ایک دن وہ کچھ لوگوں کے ساتھ ادھر سے گزرا۔ امیر موصوف سے ملاقات ہو گئی۔ کہا، کوئی شعر کہیے۔ آپ نے فی البدیہہ کہا:

یک دم کہ باتوام بسوئے من نظر مکن
سیرت ندیدہ ام ز خودم بے خبر مکن

قاضی سنجانی:

شاہ سنجان کی اولاد میں سے تھے۔ بلا کے ذہین اور فہیم تھے۔ 'مخزن الاسرار' کے تتبع میں ایک مثنوی 'منظر الابصار' لکھی اور ایک مثنوی میں شاہ طہماسپ کے کارنامے نظم کیے ہیں۔ اتفاق سے نوے برس کی عمر میں قاضی صاحب مرض عشق میں مبتلا ہوئے، ملامت کا نشانہ بنے، بڑی ذلتیں برداشت کیں، رسوائے زمانہ ہوئے۔ ایک دن ایک نوجوان نے مذاقاً کہا؛ ''بڑے میاں یہ شعر کس کا ہے؟

اے پیر گشتہ بہر جوانی سیہ مرد
موئے سپید در پئے زلف سیہ مرد''

قاضی صاحب نے برجستہ جواب دیا:

قاضی آخر درمیاں بازیچۂ طفلان شدی
خود بگو پیرانہ سرایں عشق ورزیدن چہ بود

اہلی خراسانی:

بہت ہی خوش گو شاعر تھے اور سدا عشق بازی میں لگے رہتے تھے۔ آخر خراسان میں

فریدوں مرزا پر بری طرح فریفتہ ہوئے۔ مجنوں کی طرح بال بڑھا لیے جو سر پر جھاڑ جھنکاڑ کی طرح الجھے رہتے تھے۔ اس کیفیت کو خود لکھتے ہیں:

موئے ژولیدہ کہ سر من ابتر دارم

سایۂ دولت عشق است کہ برسر دارم

آخر شہزادے نے اہلی کو اپنی خدمت میں طلب کیا اور بہت نوازش کی۔ سلطنت کے تباہی کے بعد اہلی تبریز چلے گئے۔ وہاں کبھی ایک جوان سے پینگیں بڑھاتے رہے، کبھی دوسرے جوان پر ریجھتے رہے۔ آخر گوشہ نشینی اختیار کر لی۔

مولانا ابدال:

پہلے پہل عطاری کیا کرتے تھے۔ سام مرزا کے مطابق ابدال سام مرزا کے ساتھ رہے۔ ایک دن شہزادے نے ابدال سے پوچھا کہ وہ ابدال کیسے بنے۔ ابدال نے کہا جن دنوں وہ عطاری کی دکان کرتے تھے، ایک جوان پر عاشق ہو گئے۔ ایک دن جب معشوق کو دکان میں غزل سنا رہے تھے کہ محصل آیا اور روپے کا تقاضا کیا۔ ابدال نے اسے ٹھہرنے کو کہا، محصل نے ایک زور کا ڈنڈا سر پر مارا۔ معشوق یہ حال دیکھ کر سراسیمہ ہوا اور چل پڑا۔ آتش جدائی میں ابدال نے دکان کو آگ لگا دی۔ شہر سے باہر ایک قلندر سے ملاقات ہوئی۔ ابدال نے اپنے سارے کپڑے قلندر کو دے دیے اور خود اس کی گدڑی پہن لی اور کوچۂ یار کی طرف چل پڑے۔ جب عزیز و اقارب نے ابدال کا یہ حال دیکھا تو اسے دارالشفا لے گئے اور تین ماہ تک قید میں رکھا۔ جب نتیجہ کچھ نہ نکلا تو مجبوراً رہا کرنا پڑا۔ اسی دن سے ترک تعلق کر دیا۔ ابدال تین برس تک اصفہان میں رہے اور ننگے سر ننگے پاؤں پھرتے رہے۔ پھر تبریز چلے گئے، پانچ سال تک وہاں رہے جو آرمینیوں کے ساتھ گزارے۔ پھر توفیق الٰہی رہنما ہوئی اور توبہ کی اور بارہ برس عبادت اور ریاضت کی۔

میر نصیبی:

جلیل القدر سید اور عظیم الشان فاضل تھے۔ آپ کا تعلق نور بخشیہ سادات سے ہے۔

رَے سے شیراز آئے اور علامہ جلال الدین دوانی کے شاگرد ہوئے۔ اسی زمانے میں گویے کے ایک لڑکے محمود نامی پر عاشق ہو گئے اور عاشق بھی ایسے کہ دنیا اور اس کے امور سے بیگانہ ہو گئے۔ علامہ دوانی کی وفات کے بعد اپنے وطن طرشت (رَے) کو لوٹ گئے اور اپنے دیوان کی ترتیب میں لگ گئے۔ ۱۹۱۴ء میں فوت ہوئے۔

زندہ در عشق چاں بود نصیبی مجنون
عشق آں روز مگر ایں ہمہ دشوار نہ بود

مولانا شہودی:

لاہیجانی ہیں۔ سلطان یعقوب کے معاصر تھے، کافی عرصہ قاضی یحییٰ لاہیجانی کے رشتہ دار پر عاشق رہے۔ ارباب غرض نے آپ کو کافی تکالیف پہنچائیں اور قاضی موصوف سے شکایت کی۔ قاضی نے آپ کے قتل کا حکم دیا۔ اسی اثنا میں مولانا کا محبوب اس محفل میں آیا۔ مولانا اسے دیکھتے ہی بے ہوش ہوئے۔ قاضی کو مولانا کے حال زار پر ترس آیا، معشوق کو حکم دیا کہ مولانا کے منھ پر گلاب چھڑکے اور لطف ونوازش کرے۔ مولانا کی یہ رباعی کافی مشہور ہے:

بر برگ سمن سنبل تر ریختہ
از آب حیات آتش انگیختہ
زنہار مدہ بباد آں زلف سیاہ
کز ہر تارش دلے در آویختہ

واہب اصفہانی:

مرزا حسن نام، شاہ عباس صفوی کے عہد میں ایک معزز عہدے پر فائز تھے۔ ایک زمانہ میں آپ کو زاغ نامی ایک چھوکرے سے عشق ہو گیا تھا اور کسی طرح اس کا وصل نصیب نہ ہوتا تھا۔ محبوب کی سنگ دلی اور رقیب کی ریشہ دوانیوں سے زندگی کا قافیہ تنگ ہو چکا تھا۔ ایک دن آپ کے ایک عزیز نے آکر واہب کو یہ خبر دی کہ آپ کا معشوق ایک طوائف 'گوئے زرد' نامی پر عاشق ہو گیا ہے۔ واہب نے موقع غنیمت جان کر ایک قطعہ لکھ کر طوائف کو بھیجا:

عالمے صید تو گردید چوا وہ صید تو شد
بود در طالع حسنت کو شود عالمگیر

(جب وہ تیرا شکار ہوگیا تو ساری دنیا تیری شکار ہوگئی۔ تیرے حسن کی قسمت میں عالمگیر ہونا لکھا تھا۔)

محتشم کاشی:

شاہ طہماسپ کا مداح تھا۔ دورصفویہ کے شعرا میں محتشم کا مرتبہ کافی بلند ہے۔ اس کی جیسی شہرت کسی اور شاعر کو نصیب نہ ہوئی۔ اس کا مرثیہ ترکیب بند ساری اسلامی دنیا میں مشہور ہے۔ خود محتشم کاشی ایک خوبرولڑکے کے جلال پر فریفتہ تھا۔ اس نے اپنی داستان محبت خود اپنے قلم سے موسوم بہ 'جلالیہ' لکھی ہے۔ اس میں کچھ ۶۴ غزلیں ہیں باقی نثر ہے۔ 'جلالیہ' کے بارے میں ڈاکٹر عندلیب مرحوم فرماتے ہیں؛ ''سب سے اہم بات محتشم نے یہ بیان کی ہے کہ امرد پرستی کے شوق میں شعرا عورتوں سے بیزار ہو گئے تھے۔'' ('تحقیقات'، ص ۲۶۰)

میر ہادی موسوی:

پہلے پہل تحصیل علم میں محو تھے لیکن جب عشق بازی کی چاٹ پڑ گئی تو تعلیم کو خیر باد کہہ دیا۔ شاہ طہماسپ کے عہد میں محتسب کے عہدے پر مامور تھے۔ اس کے باوجود خود مناہی کے مرتکب ہوتے تھے۔ آخر میں شہید امام رضا علیہ السلام کے روضہ کے متولی بنائے گئے۔ کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے۔

بگفتم تیغ کیں بردار و اول قتل ہادی کن
بہ خندہ گفت در عاشق کشی ہادی نمی دانم

(میں نے کہا تلوار اٹھاؤ اور پہلے ہادی کو قتل کر۔ ہنس کر بولا، مجھے عاشق کشی میں کسی ہادی کی ضرورت نہیں ہے۔)

بابا افضل کاشی:

شیخ سعدی کے معاصر اور ایک جید فاضل تھے۔ عالم بے مثل کے ساتھ ساتھ ایک بلند پایہ کے عارف تھے۔ خواجہ نصیر الدین طوسی نے آپ کی شان میں کہا ہے:

گر عرض دہد سپہرا علیٰ
فضل فضلا و فضل افضل
از ہر ملکے بجائے تسبیح
آواز آید کہ افضل افضل

(اگر آسمان بابا افضل اور دیگر فضلا کی فضیلت پیش کرے تو ہر فرشتہ اپنی تسبیح کے بجائے یہ کہے افضل سب سے افضل ہے۔)

آپ ہی کے پاس خاطر سے نصیر الدین طوسی نے ہلاکو سے سفارش کر کے منگول کے فتنوں سے کاشان اور اس کے نواحی علاقے بچا لیے تھے ورنہ یہ علاقے بھی منگول شورش کے دوران تاخت و تاراج ہو گئے ہوتے۔ آپ کی طرف بہت سے رسالے منسوب ہیں۔

آپ ایک درزی کے لڑکے پر عاشق ہو گئے اور تین برس تک آپ کا یہ معمول رہا کہ اکثر اوقات آپ معشوق کی دکان کے برابر مسجد کے دروازے میں بیٹھتے تھے اور معشوق کے خیال میں محو رہتے تھے۔ ادب مانع تھا، اس لیے عاشق و معشوق میں کبھی گفتگو نہیں ہوئی۔ ایک دن آپ معشوق کی دکان پر گئے، وہ دکان پر موجود نہ تھا۔ معلوم ہوا کی چند خوبرو جوانوں کے ساتھ باغ کی سیر کو گیا ہے۔ آپ بھی چپ چاپ وہاں پہنچے اور ایک پیڑ کے نیچے بیٹھ کر ان کی گفتگو سنتے رہے۔ ان میں ہر ایک نے اپنے چاہنے والے کا حال سنایا۔ آپ کے معشوق کی جب باری آئی تو اس نے کہا، ''تین برس سے ایک شخص ہماری دکان کے پاس بیٹھا رہتا ہے لیکن میں نے کبھی اس سے بات نہیں کی، اس لیے کہ جس وقت میں کپڑا اپھاڑتا ہوں تو اس سے الفراق الفراق کی آواز آتی ہے۔ چونکہ وصال کا انجام فراق ہوتا ہے اور رنج فراق جان کاہ ہوتا ہے، اس لیے میں نے گوارہ نہیں کیا کہ وہ اس عذاب میں مبتلا ہو۔ اسی وجہ سے میں بظاہر اس سے کوئی سروکار نہیں رکھتا۔'' بابا افضل نے یہ بات سنتے ہی ایک آہ کا نعرہ بلند کیا اور بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ سب لڑکے بابا افضل کے پاس پہنچے اور آپ کو پہچان لیا۔ آپ کا معشوق آپ کے قدموں پر گر پڑا اور آپ کے حلقۂ ارادت

میں داخل ہوگیا۔ یہی واقعہ آپ کے ترک وتجرید کا باعث بنا۔ آپ کی رباعی جو ابوالخیر کی طرف منسوب ہے، اہل حال میں کافی مشہور ہے:

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ
گر کافر و گبرو بت پرستی باز آ
ایں در گہ مادر گہٗ نومیدی نیست
صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

میر عبدالباقی:

سادات اصفہان سے ہیں۔ خاصے مولوی ہیں مگر ہمیشہ سرو قامتوں سے دل بستگی رکھتے ہیں۔ اسی لیے لشکر میں آتے جاتے تھے۔ بادشاہ اس بات سے ناراض ہوگیا۔ مثنوی 'سجۃ الابرار' کا جواب لکھا ہے۔ تصوف میں ایک اور مثنوی بھی لکھی ہے۔ عاشقانہ اشعار کہتے تھے۔

گزشتہ صفحات میں ایران میں امرد پرستی اور امارد پسندی کی جو تصویر سامنے آتی ہے، اس کو دیکھ کر بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ شاہد بازی ایرانی معاشرت میں کس قدر سرایت کر گئی تھی۔ کوئی اس کے بغیر ایک نوالہ تک توڑ نہیں سکتا تھا۔ چوتھی صدی ہجری میں محمود غزنوی کی تاج پوشی (۳۸۷ھ/ ۹۹۷ء) کے ساتھ امرد بازی کا شباب دیکھنے کو ملتا ہے۔ محمود کے درباری شاعر کھلے بندوں محمود اور ایاز کے رشتۂ تعشق کو اپنے قصائد میں بیان کرتے ہیں۔ فردوسی اور فرخی کے قصائد میں شاہد بازی کھلے بندوں پیش کی گئی ہے۔ پھر سلجوقی دور میں یہ روایت خوب پنپتی اور سنورتی ہے۔ اس عہد کے شعرا نے سلطان وقت کے ساتھ ساتھ لشکریوں کے حسن و جمال کی بھی تعریف کی ہے۔

دوسری مرتبہ جب شوکتی ہندوستان گیا تو ایک لڑکے پر دست درازی کی، اس نے شوکتی کو قتل کر دیا۔ یہ شعر اسی کا ہے:

شمع وگل و پروانہ و بلبل ہمہ جا اند
اے دوست بیا رحم بہ تنہائی ما کن

اسی طرح ادھم کاشی بھی امرد بازی کے بازار میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ادھم تبریز کے دوران ایک خوبرو جوان پر عاشق ہوگئے۔ ایک دن آدھی رات کو ایک کوچے میں آپ

کی مڈبھیڑ معشوق سے ہوئی۔ معشوق نے غرورِحسن میں آپ کو ایسی کاری ضرب لگائی کہ آپ کا کام تمام ہو گیا۔ نزع کے عالم میں یہ رباعی وردِ زبان تھی:

دوشینہ سحر یتیم تبریزیٔ من
آمد سر راہ بخون ریزیٔ من
عریاں ز لباس عاریت ساخت مرا
ایں بود نتیجۂ سحر خیزیٔ من

(رات پچھلے پہر میرا طرح دار معشوق تبریزی میرا خون بہانے کے لیے رستے میں آیا اور زندگی کا لباس مجھ سے چھین لیا۔ میری سحر خیزی کا انجام یہ نکلا۔)

ادھم کاشی کی طرح علی باخرزی بھی امارد پسندی کے مشغلے میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ اس کا نام ابوحسن علی تھا۔ طغرل بیگ سلجوقی کے دربار میں کاتب کے عہدے پر تھے۔ اپنی رضا سے سبکدوش ہو کر گوشہ نشینی اختیار کی، اسی دوران پیوند نامی ایک حسین وجمیل لڑکے پر عاشق ہو گئے۔ یہ نوجوان ترک نسل سے تھا۔ آخر اس ترک بچے کے ہاتھوں علی باخرزی کی موت واقع ہوئی۔ جس وقت پیوند پتھر کے نیچے اس کے ہاتھ دبا کر تلوار سے لہولہان کر رہا تھا، باخرزی یہ رباعی پڑھتا جاتا تھا:

من می بردم بیا مرا سیر بہ بین
ویں حال بصد ہزار تغیر بہ بین
منگے زیر دست من از زیر بہ بین
از یار بریدنی بہ شمشیر بہ بین

قاضی ہمدانی کی حکایت امرد بازی کا ایک ایسا اڑتا اشتہار ہے جو ایران کے اس مذاق فاسدہ کی ترجمانی کرتا ہے جو ان ایام میں معاشرے کے سر چڑھ کر بولتا تھا۔ یہ قاضی صاحب ایک نعل بند کے لڑکے پر ریجھ گئے۔ خلوت میں اس کے ساتھ پکڑے جاتے ہیں۔ بادشاہ سزا سناتے ہوئے کہتا ہے کہ میرے نزدیک مناسب یہ ہے کہ تجھے قلعہ پر سے نیچے گرا دیا جائے تاکہ تو ہلاک ہو جائے اور لوگ اس واقعہ سے عبرت حاصل کریں۔ قاضی جی نے برجستہ جواب دیا کہ اے خداوند جہاں! یہ جرم دنیا میں تنہا میں نے ہی نہیں کیا ہے۔ کسی اور کو گرا دیجیے تاکہ میں اس سے عبرت حاصل کروں۔ بات درست تھی۔ بادشاہ نے ہنس کر قاضی کو معاف کر دیا۔

اس طرح سعدی 'گلستان' کے باب پنجم میں اپنی اور اپنے معاصرین کی امرد پرستی کا حال بیان کرتے ہیں جن کے متعلق یہ حکایات ہیں، وہ اس عہد کی سوسائٹی کے چاند تارے ہیں۔ سوزنی سمرقندی جو ہزل گوئی اور ہجونگاری میں شہرہ آفاق ہیں، ایک درزی پسر پر عاشق ہو گئے اور اس کی محبت میں درزی کا پیشہ اختیار کیا۔ محبوب سے دست درازی کی، اس نے کہا:

گفتار پدرم می نگرد دور شواز من
آخر بہ پدر ہست حمیت بہ بسر پر

سوزنی کیا جواب دیتا ہے، دل تھام کر پڑھیے:

گفتم کہ خدایا سببے ساز بزودی
کا ایں ماہ شکر خندہ بگرید بہ پدر بر

(اس نے مجھ سے کہا 'دور ہٹ، میرا باپ دیکھ رہا ہے۔ آخر باپ کو بیٹے کی غیرت ہوتی ہے۔' میں نے کہا، اے خدا کوئی ایسی صورت نکال کہ جلدی سے اس ماہ رو کا باپ مر جائے۔)

['اردو غزل میں شاہد بازی'، گلشن پبلشرز، سری نگر، ۱۹۹۵]

افغانستان میں ہم جنس پرستوں کی خفیہ زندگی

آریا احمدزئی

افغانستان میں ہم جنسیت ایک ایسا موضوع ہے جو کہ ممنوع ہے۔ ذرائع ابلاغ میں اس موضوع پر بات کبھی کبھار ہوتی ہے اور زیادہ تر لوگ ہم جنس پرستی کو غیر اخلاقی اور غیر اسلامی سمجھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمیں افغانستان کی ہم جنس پرست کمیونٹی کے بارے میں کوئی اعداد و شمار دستیاب نہیں ہیں اور کوئی نہیں جانتا کہ ملک میں گے، لزبین اور ٹرانس جینڈر افراد کی اصل تعداد کیا ہے۔

بی بی سی نے چار ایسے ہی افغانوں سے بات کی جن کے جنسی رجحانات عام لوگوں سے مختلف ہیں۔ ان سب نے ہمیں بتایا کہ وہ کس طرح ایک خفیہ زندگی گزارنے پر مجبور ہیں، لیکن یہ چاروں اس بات پر ڈٹے ہوئے ہیں کہ وہ اپنے اپنے جنسی رجحانات پر سمجھوتہ نہیں کریں گے۔

(حفاظتی اقدامات کے پیش نظر چاروں افراد کے اصل نام خفیہ رکھے جا رہے ہیں۔)

زینب کی عمر ۱۹ سال ہے۔ وہ اپنے خاندان کے ساتھ رہتی ہیں، لیکن ان کے والدین اور بہن بھائیوں کو بالکل علم نہیں کہ زینب کیا محسوس کرتی ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ''میں کوئی پندرہ، سولہ سال کی تھی جب مجھے احساس ہوا کہ میں مردوں کو پسند نہیں کرتی... ان دنوں میں ایک بیوٹی پالر میں کام کرتی تھی۔ وہاں میرے ارد گرد بہت سے لڑکیاں ہوا کرتی تھیں، تب ہی مجھے لگا کہ مجھے لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیاں زیادہ اچھی لگتی ہیں اور میں لڑکیوں میں زیادہ کشش محسوس کرتی ہوں۔''

زینب کے بقول انھیں اپنے جذبات کا اظہار کرنے اور اپنی پہلی ساتھی یا پارٹنر کو یہ

بتانے میں سال لگ گئے کہ وہ اسے ایک عرصے سے پسند کرتی ہیں۔ جب زینب نے اپنی برسوں پرانی سہیلی کو بتایا کہ وہ اس سے محبت کرتی ہیں، تو ان کی دوست کا ردِعمل ایسا تھا جیسے اسے بہت دھچکا لگا ہو۔ ''میں نے اپنی سہیلی کو بتایا کہ میں اس کے بارے میں وہی جذبات رکھتی ہوں جو عموماً ایک لڑکا کسی لڑکی کے لیے رکھتا ہے۔'' اس اظہارِ محبت کے کچھ عرصہ بعد تک زینب کی سہیلی ان سے دور ہو رہی اور دونوں میں فاصلہ پیدا ہو گیا، لیکن بعد میں دونوں دوستوں نے ایک جوڑے کی شکل اختیار کر لی۔ زینب کے بقول اگرچہ وہ دونوں ہفتے میں ایک یا دو بار ہی مل پاتی تھیں، لیکن ان کا یہ نیا رشتہ باقی لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہی رہا۔ زینب کہتی ہیں کہ ''ہمارے ہاں لیزبین خواتین کی ایک بڑی تعداد پائی جاتی ہے، لیکن وہ اس پر کُھل کر بات نہیں کر سکتیں۔''

''افغانستان میں ہم جنس پرست خاتون ہونے کو غیر اسلامی سمجھا جاتا ہے۔ اگر لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ آپ لیزبین ہیں تو اس کے نتیجے میں آپ کی موت بھی ہو سکتی ہے۔ اس لیے یہ بات میرے لیے بہت اہم ہے کہ میرے گھر والوں کو کبھی معلوم نہ ہو کہ میں لیزبین ہوں۔'' جہاں تک اپنے اردگرد کے لوگوں کی جانب سے نا قبولیت اور انتقامی کارروائی کے خوف کا تعلق ہے، تو اس کا اظہار ان تمام افراد نے کیا جن سے بی بی سی نے اس رپورٹ کے سلسلے میں بات کی۔

اس کے علاوہ ان افراد نے یہ بتایا کہ انھیں شادی کے لیے گھر والوں کی جانب سے دباؤ کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ خاندان والے چاہتے ہیں کہ آپ کے لیے ضروری ہے کہ آپ جنس مخالف کے فرد سے شادی کریں اور افغان معاشرے کی روایات کے مطابق زندگی گزاریں۔

داؤد جب ۱۸ سال کے تھے تو انھیں احساس ہوا کہ وہ ایک ہم جنس پرست مرد (گے) ہیں، تاہم اس کے باوجود انھوں نے ایک خاتون کے ساتھ منگنی کر لی۔ ان کے بقول ''یہ منگنی میری رضامندی کے بغیر کی گئی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ یہ منگنی توڑ دوں کیوں کہ مجھے مخالف جنس میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوتی تھی۔'' داؤد کی منگنی توڑ دی گئی اور اب وہ ایک مرد کے ساتھ خوش و خرم زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ''ہم دونوں کا رشتہ بہت گہرا ہے۔ جب ہم ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو ہمیں لگتا ہے کہ ہم کسی دوسری ہی دنیا میں پہنچ گئے ہیں۔'' لیکن زینب کی طرح داؤد بھی ایک دوہری زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔

''افغانستان میں ہم جنس پرستی کو ایک بہت بُری اور منفی بات سمجھا جاتا ہے۔ اگر لوگوں کو ہم دونوں کے بارے میں معلوم ہو جائے تو ہو سکتا ہے کہ وہ ہمیں پھانسی پر لٹکا دیں۔''

جہاں تک تعزیرات افغانستان کا تعلق ہے تو اس کی شق نمبر ۴۲۷ میں جس جنسی جرم کا ذکر ملتا ہے وہ 'پیڈیسری' ہے، یعنی بڑی عمر کے مرد اور ایک لڑکے کے درمیان جنسی تعلق۔ اس جرم کی سزا 'طویل قید' ہوسکتی ہے۔ اگر افغانستان کے قانونی دستاویزات کو دیکھا جائے تو واضح نہیں ہوتا کہ ملک کا قانون ہم جنسیت کو کس نظر سے دیکھتا ہے، لیکن افغانستان کے قانونی حلقوں اور یہاں کی ہم جنس پرست برادری کو اس بارے میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہم جنس پرستی کو یہاں جرم سمجھا جاتا ہے۔

تاہم افغان اور اسلامی قوانین کے ماہر اور برطانیہ کی ہل یونیورسٹی سے منسلک ڈاکٹر نیاز شاہ کہتے ہیں کہ افغانستان کا پینل کوڈ دراصل اسلامی قوانین کے اس اصول کی عکاسی ہیں جس کے تحت اسلامی معاشرے میں ہم جنس پرستی پر پابندی ہوتی ہے۔

ڈاکٹر نیاز شاہ کہتے ہیں کہ ''اسلامی قانون صرف ایک قسم کے جنسی فعل کی اجازت دیتا ہے، اور وہ ایک بالغ مرد اور بالغ خاتون کے درمیان اسی وقت ہوسکتا ہے جب وہ ایک دوسرے سے شادی کرلیں۔''

بی بی سی بات کرتے ہوئے ڈاکٹر شاہ کا کہنا تھا کہ ''اگر دونو جوان لڑکے یہ اعلان کردیں کہ وہ ہم جنس پرست ہیں اور وہ ایک 'گے' جوڑے کی شکل میں اکٹھے رہنا چاہتے ہیں تو اس پر لوگ بہت برہم ہوجائیں گے، اور کچھ لوگ چاہیں گے کہ ان لڑکوں کو مار دیا جائے۔'' ان کا مزید کہنا تھا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ افغانستان میں ماضی میں اور اِن دنوں بھی بہت سے لوگ مختلف قسم کے ہم جنس رشتوں میں زندگی گزار رہے ہیں اور کئی مرد دوسرے مردوں سے جنسی تعلق رکھتے ہیں، لیکن یہ مرد خود کو 'گے' نہیں سمجھتے کیوں کہ یہ لوگ خواتین سے شادیاں بھی کرلیتے ہیں۔

ڈاکٹر شاہ کے بقول افغان معاشرے میں ایک مرد کا دوسرے مرد سے پیار، ایک اجنبی تصور ہے۔ ''میں افغانستان میں کسی مرد کے دوسرے مرد کے ساتھ اس قسم کے تعلق کو نہیں جانتا جس میں وہ دونوں کھلے عام ایک دوسرے کے ساتھ رشتے میں ہوں اور ان کا کسی خاتون سے کسی قسم کا جنسی تعلق نہ ہو۔''

بی بی سی سے بات کرتے ہوئے افغانستان کے ایک معروف عالم دین شمس الرحمان کا کہنا تھا کہ زیادہ تر علما کے درمیان اس معاملے پر اتفاق پایا جاتا ہے کہ اگر ہم جنسیت کا فعل ثابت ہوجائے تو اس کی سزا موت ہی ہونی چاہیے۔ ''ان دونوں کو ایک پرانی دیوار کے ساتھ کھڑا کر کے

وہ دیوار ان کے اوپر گرا دینی چاہیے اور یوں انھیں ایک دردناک موت مارنا چاہیے۔‘‘

افغانستان میں ایک شخص جس کی خواہش ہے کہ اس کے ملک میں ’ایل جی بی ٹی‘ برادری کے لوگوں کے ساتھ بہتر سلوک ہونا چاہیے، وہ نعمت سادات ہیں۔ وہ اس سلسلے میں افغانستان میں ایک مہم بھی چلا رہے ہیں۔ نعمت سادات نے تین سال پہلے کھلے عام تسلیم کر لیا تھا کہ وہ ’گے‘ ہیں۔ ’جب میں نے یہ اعلان کیا تو میرے خاندان کے زیادہ تر لوگوں اور میرے دوستوں نے مجھ سے تعلق توڑ لیا۔ ان میں ایسے لوگ بھی شامل تھے جو افغانستان سے زیادہ مغربی ممالک میں زندگی گزار چکے تھے۔

آج کل واشنگٹن میں رہائش پذیر نعمت سادات کے بقول ’’حتیٰ کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اشرافیہ، ہارورڈ اور برکلے جیسی یونیورسٹیوں کے پڑھے ہوئے لوگوں کو بھی مجھے قبول کرنے میں مشکل ہوئی۔‘‘ سادات کی پیدائش افغانستان کی ہے لیکن وہ اس کے بعد کئی سال بیرون ملک رہے اور پھر ۲۰۱۲ء میں تعلیم کے شعبے میں ملازمت کی غرض سے افغانستان واپس آ گئے۔

سادات نے بتایا کہ جب انھوں نے کھلے عام تسلیم کر لیا کہ وہ ’گے‘ ہیں تو افغان حکام نے ان پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا اور انھیں کابل کی امریکن یونیورسٹی کی ملازمت سے بھی ہاتھ دھونا پڑے۔ ان کا کہنا ہے کہ جب وہ افغانستان میں تھے تو انھیں کابل کی ہم جنس پرست کمیونٹی کے افراد سے ان کی زندگیوں کے بارے میں بات کرنے کا موقع ملا۔ ’’دنیا کے باقی شہروں کی طرح کابل میں بھی ایسے مقامات موجود ہیں جہاں اس کمیونٹی کے لوگ آپس میں ملتے ہیں، جیسے جسمانی ورزش کے جمز، پارک یا شاپنگ مالز وغیرہ۔ لیکن ان مقامات کی ملاقاتیں زیادہ تر وہاں تک محدود رہتی ہیں، آپ ایک دوسرے سے ایک آدھ بار ہی مل پاتے ہیں۔‘‘

سادات کہتے ہیں چونکہ زیادہ تر لوگ اپنے خاندان والوں کے ساتھ رہتے ہیں، اس لیے وہ کسی کو اپنے ساتھ گھر نہیں لے جا سکتے۔ اس لیے انھیں کوئی دوسری جگہ کرائے پر لینا پڑتی ہے، جیسے کسی اسٹور کا پیچھا والا کمرہ۔ ’’میں نے دیکھا کہ کابل میں ہم جنس پرست لوگوں کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ دیرپا دوستی یا رشتہ قائم کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ ایل جی بی ٹی افراد کی زندگی شرعی قوانین میں جکڑی ہوئی ہے۔ کسی ایسے شخص سے شادی جس سے وہ سچی محبت کرتے ہوں، یہ تو بڑے دور کی بات ہے۔ افغانستان کے ہم جنس پرست افراد تو اپنے لیے جینے کا حق بھی نہیں مانگ سکتے۔‘‘

نعمت سادات کو امید ہے کہ آخر کار ایک دن قدامت پسند مسلمان معاشروں میں بھی ہم جنس پرست افراد اپنے حقوق حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے لیکن نعمت سادات جس مغرب میں رہائش پذیر ہیں، وہاں بھی ان افراد کے حقوق کا تعین حال ہی میں ہوا ہے اور اب بھی یہ حقوق دباؤ کا شکار ہیں۔

مثلاً جرمنی میں ۱۹۹۴ء تک مردوں کے درمیان جنسی تعلق غیر قانونی تھا اور حالیہ عرصے میں ہی ریاست ایسے افراد کو ہرجانہ دلوانے کا انتظام کر رہی ہے جنھیں ماضی میں ان کی جنسی شناخت کی وجہ سے مقدمات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

اور یہ صرف اسلام ہی نہیں جو ہم جنس پرستی کو ایک غیر اخلاقی فعل تصور کرتا ہے۔ اگرچہ اس سال کے اوائل میں کیتھولک عقیدے کے روحانی پیشوا، پوپ فرانسس نے کہا تھا کہ جو سلوک ماضی میں ہم جنس پرست افراد کے ساتھ روا رکھا گیا ہے، اس پر کلیسا کو معافی مانگنی چاہیے، تاہم بہت سے قدامت پسند عیسائیوں کے خیالات بھی اسی قسم کے ہیں جو اسلام میں ہیں۔ تاہم افغانستان میں اس قسم کی تبدیلیوں میں ابھی بہت عرصہ لگے گا۔

۲۴ سالہ شمیلہ ٹرانس جینڈر رہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ پیدا تو لڑکا ہوئی تھیں، لیکن ان کو ہمیشہ 'لڑکیوں والے کام' اچھے لگتے تھے۔ چھوٹی عمر سے ہی انھیں گڑیا سے کھیلنا اور لڑکیوں میں اٹھنا بیٹھنا اچھا لگتا تھا۔ لیکن وہ جب سے بالغ ہوئی ہیں، انھیں اپنی جنسی ترجیحات کو خفیہ رکھنا پڑتا ہے۔

''میں خود کو ایک قیدی کی طرح اس کمرے میں بند کر لیتی ہوں۔ میں آئینے کے سامنے اپنا بناؤ سنگھار کرتی رہتی ہوں، موسیقی سنتی ہوں، ٹی وی دیکھتی ہوں اور ڈانس کرتی رہتی ہوں۔''

ان کا ساتھی بھی اسی بات پر اصرار کرتا ہے کہ شمیلہ کو اپنی شناخت کو ایک راز ہی رکھنا چاہیے۔ شمیلہ کے بقول ''میرا پارٹنر بہت سخت ہے اور وہ چاہتا ہے کہ میں لوگوں کے سامنے ہمیشہ لڑکوں والے کپڑے پہنا کروں۔ میرا سب سے بڑا المیہ یا حسرت یہ ہے کہ میں لڑکی کیوں نہیں پیدا ہوئی۔ میں چاہتی ہوں کہ میں بچے پیدا کروں، میرا بھی ایک شوہر ہو اور میں ایک اچھی زندگی گزاروں۔''

صرف شمیلہ ہی نہیں، بلکہ اس معاملے پر بی بی سی سے بات کرنے والے تمام افراد نے بتایا کہ انھیں بھی اسی قسم کے احساسات ہوئے اور وہ بھی خود شناسی اور خود کو اندر سے ٹٹولنے کے مراحل سے گزرے۔ سب خو کو امید اور مایوسی کے درمیان پھنسا ہوا محسوس کرتے ہیں لیکن یہ تمام

لوگ اس بات پر ڈٹے ہوئے ہیں کہ وہ اپنی اصل شناخت اور جنسی ترجیحات پر قائم رہیں گے۔

نعمت سادات پُرامید ہیں کہ حالت بہتر ہو جائیں گے، لیکن ان کا کہنا ہے کہ یہ تبدیلی صرف اسی وقت آ سکتی ہے جب ہم جنس پرست افراد کے حقوق کو اقلیتوں کے حقوق کے بڑے تناظر میں دیکھا جائے۔ ''جب تک ہم متحد نہیں ہو جاتے، اس وقت تک کسی خوش وخرم ایل جی بی ٹی کمیونٹی کی امید کرنا غلط ہوگا، اور نہ ہی خواتین یا دیگر اقلیتوں کے حقوق کی پاسداری۔''

ہندوستان کے خواجہ سرا

اختر بلوچ

مغلیہ دور میں خواجہ سرا حرم کی تمام سرگرمیوں پر نظر رکھتے تھے اور اس کی اطلاعات بادشاہِ وقت کو پہنچاتے تھے۔ ان کا دربار میں کافی اثر ہوتا تھا۔ اکثر امرا بادشاہِ وقت کی خوشنودی کے لیے بھی انھیں استعمال کرتے تھے۔ مغلیہ دور میں محمد شاہ رنگیلا کے عہد میں خواجہ سراؤں کو ایک خاص حیثیت حاصل ہوئی۔ 'فرہنگ آصفیہ' میں اِس کا ذکر یوں ہے:

ہمارے ہندوستان میں محمد شاہ رنگیلے کے وقت سے اس فرقے نے رونق پکڑی، کیوں کہ بادشاہِ مذکور نے محلوں میں آنے جانے کے واسطے قلماقنیوں، ترکنوں، جسولنیوں، یعنی بساولنیوں وغیرہ کے بجائے ایسے ہی لوگوں کو مقرر فرما کر 'ناظر' اور 'خوجہ' کے لقب سے ملقب کیا، جیسے ناظر محبوب علی خاں وزیر بہادر شاہ، ناظر بسنت علی خاں وزیر شاہ عالم۔ ناظر بلال علی خاں، ناظر محفوظ علی خاں وغیرہ وغیرہ اب تک نام رکھے جاتے تھے۔ اسی عہد میں جب کثرت سے یہ لوگ ہوگئے اور دیکھا کہ محمد شاہ کو راگ رنگ سے بہت شوق ہے تو اِن لوگوں نے ناچنا گانا اختیار کیا اور اپنا ایک علاحدہ ہی فرقہ مقرر کر کے میر بہو جی ایک خنثٰی کو، جیسے میر بھُچڑی کہنے لگے، اپنا پیر قرار دیا۔ وہ گرو بنے، یہ چیلے کہلائے اور آگے کو گرو اور چیلے کا سلسلہ چلا اور اِن سب کا سردار 'بادشاہ' کہلایا جس کی گدّی، یعنی تخت پہاڑ گنج واقع دہلی ہے۔ لاوارث ہیجڑے کا مال، یعنی جس کا گُرو یا چیلا زندہ نہ ہو، بادشاہ کے سپرد کیا جاتا اور ہر قسم کی آمدنی میں بادشاہ کو بہ طور خراج کچھ دیا جاتا ہے۔

شہر میں جہاں کہیں بیٹا ہوتا ہے، وہاں اس علاقے، یعنی بِرت کے ہیجڑے جا کر ناچتے گاتے اور اپنی بدھائی لاتے ہیں؛ ہولی، دیوالی، دسہرے میں، مگر زیادہ تر صرف دیوالی میں یہ لوگ دکان دکان ڈھولک بجا کر ناچتے، چھلّے گاتے اور مانگتے پھرتے ہیں۔ میر بُھچڑی کی کڑھائی ان کے ہاں ایک مشہور نیاز ہے۔ ہیجڑے کا مُردہ کسی نے نہیں دیکھا، بلکہ مثل بہت مشہور ہے کہ کھتری کی بارات اور ہیجڑے کا مُردہ کسی نے نہیں دیکھا۔ جس کی وجہ، یہ ہے کہ مذہب اسلام میں ان کے مُردے کی نماز جائز نہیں، پس یہ لوگ اپنا مُردہ شہدوں یا قلیوں کے سپرد کر کے دھوکے سے نماز پڑھوا لیتے ہیں اور انھی سے دفن کرا دیتے ہیں، بعد میں قبر پر جا کر روتے پیٹتے اور خوب ماتم کرتے ہیں۔ دہلی میں علی الصباح ہر ایک محلے میں ایک ہیجڑا آتا اور یہ پکارتا ہوا پھیری لگا جاتا ہے: 'ہوا بیٹا! کسی کے ہوا بیٹا! کون سا گھر جاگا!' جس گھر میں لڑکا پیدا ہوتا ہے، وہاں کی خبر لگا جاتا اور دوسرے روز اپنی ٹولی کو لے کر بِرت مانگنے آ کھڑا ہوتا ہے، اور جو کچھ قسمت کا ہوتا ہے، یہ سب ناچ گا کر بدھائی لے جاتے ہیں:

بیٹا ہوا کسی کے جو سن پاویں ہیجڑے
سنتے ہی اس کے گھر میں پھر آ جاویں ہیجڑے
ناچیں بجا کے تالیاں اور گاویں ہیجڑے
لے لے کے بیل بھاؤ بھی بتلاویں ہیجڑے
اس کے بڑے نصیب جہاں آویں ہیجڑے

(نظیر اکبر آبادی)

سپہ سالار خواجہ سرا، ملک کافور

برصغیر کے خواجہ سراؤں میں ایک بڑا نام ملک کافور تھا جو علاء الدین خلجی دورِ حکومت میں سپہ سالار کے عہدے تک پہنچا۔ مفتی شوکت علی فہمی اپنی کتاب 'ہندوستان پر اسلامی حکومت' میں اس کا ذکر کچھ یوں کرتے ہیں:

اس سے قبل ہم بتا چکے ہیں کہ سلطان علاء الدین نے کھمبایت سے آئے ہوئے کافور نامی ایک خوبرو اور نوعمر غلام کو اپنا منظورِ نظر بنا لیا تھا۔ یہ خوب صورت لڑکا امرد تھا جس نے بہت جلد

سلطان کے مزاج میں اِس قدر دخل حاصل کر لیا کہ ۷۰۶ھ مطابق ۱۳۰۷ء میں سلطان نے اس کا درجہ تمام امرا سے بلند کر کے اس کو وزارت عظمیٰ کا عہدہ تفویض کر دیا اور اِس کے ساتھ ہی اسے سپہ سالار بنا کر اور ایک لاکھ فوج دے کر دکن کی تسخیر کے لیے روانہ کر دیا۔

'فرہنگ آصفیہ' کے مرتب مولوی سید احمد دہلوی گو کہ ملک کافور کی بہادری اور دلیری کے قائل ہیں، لیکن وہ خواجہ سرائی کے پس منظر میں ملک کافور کا ذکر اِن الفاظ میں کرتے ہیں:

اِس جاہلانہ حرکت میں اہل خطا سے ہی یہ حرکت سرزد نہیں ہوئی، بلکہ ہندوستان کے بادشاہ سلطان علاء الدین خلجی کے عہد میں بھی ملک کافور کو ہمارے ہندوستان میں شاہان خطا کے زمانے سے کم اقتدار اور مرتبہ حاصل نہیں ہوا۔ ملک کافور سلطنت کے اعلا ارکان میں تھا۔ اس سے بڑے بڑے نمایاں کارنامے ظہور میں آئے تھے۔ یہ شخص چار مرتبہ تسخیر دکن کے واسطے بھیجا گیا۔ راجہ رام دیو کو اِسی نے قید کر کے دہلی روانہ کیا۔ دوار کے راجگان کو اِسی نے مغلوب کیا۔ وارنگل کے راجہ کو اِسی نے باج گزار بنایا۔ تمام دکن کو گولکنڈا تک تہہ و بالا کر کے وہاں ایک مسجد مسلمانوں کے عہد سلطنت کی یادگار تعمیر کی۔ غرض ہندوستان کی تیرھویں عیسوی صدی بھی خواجہ سراؤں کی تاریخ کے واسطے ایک قابل فخر صدی ہوئی ہے۔

سلطان علی عادل شاہ کی خواجہ سراؤں میں دلچسپی

'تاریخ فرشتہ' میں سلاطین بیجاپور کے ایک سلطان علی عادل شاہ کی خواجہ سراؤں سے دلچسپی اور بعد ازاں ایک خواجہ سرا کے ہاتھوں قتل کا ذکر یوں ہے:

اسے خوب صورت خواجہ سراؤں اور غلاموں کو جمع کرنے کا بہت شوق تھا، ایک مرتبہ علی عادل شاہ نے اپنا ایک قاصد امیر برید کے پاس بھیجا اور یہ پیغام دیا: ''مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمھارے پاس دو نہایت ہی حسین اور خوب صورت خواجہ سرا ہیں، تم فوراً اُن خواجہ سراؤں کو میرے پاس روانہ کر دو۔'' امیر برید نے چند دن تک ٹال مٹول کی اور خواجہ سراؤں کو علی عادل شاہ کے پاس روانہ نہ کیا۔ انھی دنوں مرتضیٰ نظام شاہ بحری نے امیر علی برید پر حملہ کر دیا۔ برید علی عادل شاہ سے مدد کا طالب ہوا۔ علی عادل شاہ نے دو ہزار سوار اس کی مدد کے لیے روانہ کیے۔ برید اس سے متاثر ہوا اور اس نے وہ دونوں حسین خواجہ سرا، جن کو علی عادل نے طلب کیا تھا، بیدر سے بیجاپور بھیج دیے۔

یہ دونوں خواجہ سرا جب بیجا پور پہنچے اور ان کو اپنے یہاں آنے کی وجہ معلوم ہوئی تو ایک خواجہ سرا کو بہت ناگوار گزرا۔ اس نے عادل شاہ کا کام تمام کرنے کا ارادہ کرلیا۔ جس روز یہ دونوں خواجہ سرا شاہی حضور میں پیش ہوئے، اسی رات متذکرہ بالا خواجہ سرا نے علی عادل شاہ کو چاقو سے قتل کردیا۔ یہ حادثہ ۲۳ صفر ۹۸۹ھ کو وقوع پذیر ہوا۔ اس کا مادہ تاریخ 'ظلم دید' سے برآمد ہوتا ہے، مُلا رضائی مشہدی نے علی عادل شاہ کا بہت ہی غم انگیز اور جاں گداز مرثیہ لکھا۔ ملک کے تمام امیر اور جملہ اراکین سلطنت اس سانحہ دل شکن سے بے حد افسردہ تھے۔

ایک اور بادشاہ برہان شاہ کی یوسف خواجہ سرا سے محبت کا یہ عالم تھا کہ یوسف نے بادشاہ کو قتل کرنے کی کوشش کی اور بادشاہ نے اس کی کوشش کو ناکام بنا دیا، اِس کے باوجود بادشاہ کے دل میں یوسف کے لیے کوئی مَیل نہیں آیا۔ محمد قاسم فرشتہ اِس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ایک مقربِ شاہی یوسف خواجہ سرا نے، جو حسن و جمال میں اپنی مثال آپ تھا، رات کے وقت بادشاہ کو قتل کرکے اس کے بیٹے اسمٰعیل کو تخت پر بٹھانے کا ارادہ کیا۔ برہان شاہ کو اس کی اطلاع ہوگئی، لیکن اسے یقین نہیں آیا کہ یوسف اس کے بارے میں ایسا بھی سوچ سکتا ہے۔

ایک رات بادشاہ نیند کے بہانے خواب گاہ میں گیا۔ یوسف خواجہ سرا بھی خنجر ہاتھ میں لے کر خیمے میں آ گیا۔ برہان شاہ نے اس کو دیکھ لیا اور چھلانگ لگا کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ یوسف سے بادشاہ کو بڑی محبت تھی، لہٰذا اس نے اسے کچھ نہ کہا، بلکہ اس واقعے سے ایسی چشم پوشی کی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

نرمان (دیباچہ)

افتخار نسیم

Life is not fair، اس بات کا ادراک جب مجھ پر ہوا تو میں بھونچکا رہ گیا۔ 'تو کیا اس زندگی کی صلیب کو عمر بھر کے لیے اکیلے ہی اٹھانا ہوگا؟' میں نے تو سمجھا تھا کہ یہ ایک اسٹیج ہے جس میں سے ہر شخص گزرتا ہے لیکن میں کیوں اسی جگہ پہ آ کر رک کر رہ گیا۔ جہاں سے تمام لوگ اپنے لڑکپن سے ہو کر آگے نکل جاتے ہیں اور پھر ان کے ساتھ ایک نازک اندام لڑکی ایک مضبوط سہارا بن جاتی ہے، پھر وہ اس کے لیے بچوں کی شکل میں خوب صورت تحفے دیتی ہے، اور پھر وہ اپنے آپ کو ان بچوں میں متشکل اور منتقل کر کے اس دنیا سے اگلی دنیا میں چلا جاتا ہے، لیکن میں اس خوب صورت چکر سے باہر کیسے نکل گیا؟ کون سی درز یا کون سا دروازہ کھلا رہ گیا تھا۔ اس کے لیے میں نے کتنی نمازیں پڑھیں، ساری ساری رات مسجد میں جا کر وظیفے کیے (کہ میں ایک مسلمان گھرانے میں پیدا ہوا تھا)، کئی صوفیوں کے پاس جا کر اس بات کا اظہار کرنا چاہا لیکن حوصلے اور ہمت نے ساتھ نہ دیا۔

زندگی بچپن سے گزر کر لڑکپن میں آئی۔ لائل پور شہر؛ ایک صنعتی شہر، ایک چھوٹا سا شہر جو قصبہ گاؤں کے ملنے سے ایک شہر بن گیا۔ ہر شخص دوسرے شخص کو جانتا تھا، کوئی بھی عمل دوسرے سے چھپا نہیں رہ سکتا تھا۔ اس کے باوجود کئی 'عمل' ہوتے رہے۔ یہ ایک open secret تھا کہ اس معاشرے میں ایک اور طرزِ زندگی بھی ہے جسے آپ 'ہم جنسوں' کی زندگی کہہ سکتے ہیں۔ آپ

اپنے جیسے لوگوں سے انسیت کے بارے میں

میں ہمت ہے تو اس دُہری زندگی کو قبول کرلیں۔ شادی کریں، ایک عورت جو آپ کے لیے بچے جنے اور معاشرے میں عزت دے۔ اور گھر سے باہر ایک لڑکا جسے آپ روحانی اور جسمانی طور پر چاہیں۔ یہ ہے اس معاشرے کی بنیاد جس میں، میں بڑھا پلا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میں اکیلا ہوتا چلا گیا۔ مجھے اپنے ہم عصر لڑکوں میں کوئی خاص 'دلچسپی' نہیں تھی۔ شاید اس لیے کہ میں اپنی عمر سے بہت بڑا تھا۔ سوچ ایک عذاب ہے اور میں اس کا ایک مکمل ثبوت ہوں۔

میں ہمیشہ سے 'مختلف' تھا، مجھے اس بات کا ادراک غالباً پانچ چھ سال کی عمر میں ہی ہو گیا تھا۔ مجھے کسی نے 'مختلف' نہیں بنایا، میں پیدا ہی ایسا ہوا تھا۔ میں کسی پر الزام نہیں دیتا کہ مجھے ایسا بنانے میں کوئی ملزم نہیں ہے کہ یہ کوئی جرم نہیں۔ کسی کو کوئی 'مختلف' نہیں بنا سکتا اور ہم باقی معاشرے کے so called normals کی طرح پیدا ہوتے ہیں اور نارمل ہی مرجاتے ہیں۔ میرے نزدیک Abnormalacy تب ہوتی جب کسی شخص کو متبادل فعل کرنے کے لیے مجبور کردیا جائے۔ معاشرے کے خوف سے یا قانون کی گرفت میں آنے کے خوف سے۔

بہرحال، اس ماحول میں مختلف ہونا کوئی آسان بات نہیں۔ میں بھی باقی بچوں کی طرح معصوم اور Impressionable تھا، لیکن کوئی شخص ایسا نہیں تھا کہ میں اس سے کھل کر بات کرسکتا، چنانچہ جب میں لڑکپن میں داخل ہوا تو میرے جسم میں کئی تبدیلیاں آئیں، ان میں سے ایک تبدیلی کا ادراک 'جنس' تھا۔ اب دل صرف کسی کے ساتھ باتیں کرنے کو نہیں بلکہ اس سے اور زیادہ متعارف ہونے کو چاہتا تھا۔ جب سب لڑکے، لڑکیوں کے پیچھے سائیکل لے کر ان کو گھر سے اسکول اور اسکول سے گھر پہنچایا کرتے تھے، میں اکیلا کسی باغ میں بیٹھا منٹو، عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر پڑھا کرتا تھا۔ یہ نہیں کہ میں نے اپنے جسم کی آواز کو کبھی نہیں پہچانا تھا لیکن میرے نزدیک 'اس کے بعد' کا مسئلہ تھا کہ میں پھر اکیلا رہ جاؤں گا۔

کاش! میں مصلحت پسند ہی ہوتا۔ لیکن اپنی ضدی طبیعت اور اپنے خودساختہ اصولوں کو کہاں لے جاتا کہ میں بچپن سے ہی ایسا تھا۔ میرا دل بھی چاہتا تھا کہ میں Tahula Bankhead کی طرح بعض لوگوں سے جو کہ مجھ سے دوسری ملاقات میں اجنبی بن کر پیش آتے تھے، کہتا؛ "Don't you recognize me with my cloth on"، لیکن یا تو مجھ میں اتنی جرأت نہیں یا پھر مجھے ان کی لاچارگی پر رحم آجاتا تھا۔

بچپن سے لڑکپن اور لڑکپن سے جوانی میں داخل ہوا تو ایک دم جیسے میری کایا کلپ ہوگئی۔ میں اپنے جذبوں کے اظہار میں کچھ اور بھی open ہوگیا۔ کئی لڑکیوں کے ساتھ بھی راز و نیاز کی تمام منزلوں کو طے کیا اور سوچا کہ میرا 'علاج' ہوگیا۔ لیکن اس کے بعد جو روح میں ایک زبردست خلا پیدا ہوجاتا تھا اور پھر جرم کے احساس کو کیسے دور کرتا۔ میں ایک Pepertual Guilt کا شکار ہوگیا جو ایک عمر تک سوہان روح بنا رہا۔ مجھے ایسا لگتا تھا کہ گھر کا نرفرد ہونے کی وجہ سے مجھ پر جو ذمہ داریاں تھیں، ان سے میں عہدہ برآ نہیں ہورہا تھا۔ خوش قسمتی سے ہمارا گھرانا ایک متوسط گھرانا تھا، جس میں تین بڑی لڑکیاں تھیں اور ایک مجھ سے چھوٹی۔ تعلیم کی دولت سے مالا مال لیکن روپے کی دولت سے محروم۔ چنانچہ ان بہنوں نے اپنی تمام توجہ میری طرف مبذول کردی کہ یہ پڑھ لکھ کر ہماری غربت کے دلدر دور کرے گا۔

میرے والد صاحب (خدا ان کو غریق رحمت کرے) اپنی دوسری بیوی کے ساتھ ایک عالی شان کوٹھی میں رہتے تھے اور ہم شہر کے ایک چھوٹے سے مکان میں سات بہن بھائی لڑتے جھگڑتے ہنستے کھیلتے پل رہے تھے۔ اس معاشی تفاوت اور جذباتی ناانصافی نے میرے ذہن پر بہت شدید دباؤ ڈالا (خدا کے لیے کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں اس وجہ سے مختلف ہوگیا تھا)۔ میں نے کوشش کی کہ گھر سے اس غریبی کی بلا کو نکال دوں۔ وہاں رہتے ہوئے میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ میری والدہ مرحومہ مجھے تھوڑی سی یاد ہیں جیسے کسی نے خواب دیکھا ہو۔ کوئی اچھی یا بُری کوئی کہانی ان کے ساتھ وابستہ نہیں تھی، چنانچہ مجھے اس بات کا کبھی احساس نہیں ہوا کہ ماں کیا ہوتی ہے۔ اس لیے میری کسی بھی نظم یا غزل میں اس محرومی کا کوئی اظہار نہیں کہ ماں کی محبت کا تجربہ مجھے نہیں اور جس چیز کا تجربہ نہیں، اس کا اظہار کیسے کروں۔

میرے لیے غربت، پیار کی کمی اور اپنے بارے میں مختلف ہونے کی تلخی سے نجات کا راستہ صرف کتابیں پڑھنا تھا جو میں نے خوب پڑھیں۔ پھر ان ہی دنوں میں ایسے لڑکوں سے ملنے لگ گیا جو میری طرح کے تھے لیکن ان میں ملنے سے دو مسئلے پیدا ہوئے۔ ایک تو یہ کہ وہ Catamite تھے جنھیں شہر کے لوگ اچھی نظر سے نہیں دیکھتے اور دوسرا وہ خود زندگی کے بارے میں اتنے سنجیدہ نہیں تھے۔ وہ تمام کسی نہ کسی بہانے سے اسکولوں سے نکال دیے گئے تھے یا خود اپنے ہم عصروں کی زیادتیوں کے ہاتھوں تنگ آ کر پڑھائی چھوڑ گئے تھے۔ ان کا صرف ایک مشغلہ تھا، 'ناچنا'۔ بدصورت سے بدصورت، بےسُرا، بےتال جس کا دائیں پاؤں بائیں پاؤں سے

بھی ملتا تھا وہ اپنے آپ کو ہیلن، ککو یا پھر ایمی مینوالا سے کم ڈانسر نہیں سمجھتا تھا۔ اس طبقے کی ایک اپنی بولی تھی۔

یہ پُراسرار قبیلہ مجھے بہت پسند آیا، چنانچہ میں نے مزید اس میں گھس جانا مناسب سمجھا لیکن تعلیم مکمل کرنے کے شوق اور پیسے کی کمی نے مجھے ان سے زیادہ قریب نہ ہونے دیا لیکن اس کے باوجود میں اس پراسرار قبیلے کے رسم ورواج، بولی اور عادات سے خوب واقف ہوگیا۔ انھیں دنوں مجھے لکھنے کا بھی شوق چرایا اور میں اُلٹی سیدھی غزلیں لکھ کر قمر لدھیانوی صاحب کے پاس لے جاتا تھا کہ ابا مرحوم نہیں چاہتے تھے کہ ہم میں سے کوئی بھی شاعر بنے۔ کچھ عرصے کے بعد قمر صاحب نے کہہ دیا کہ عروض کی غلطی درست کردیا کروں گا لیکن تصحیح کردہ مصرعے تمھارے مصرعوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ اس لیے خیال کی بندش تم خود کیا کرو۔

میں جب بھی اپنے پُراسرار قبیلے میں واپس آتا تو معلوم ہوتا کہ یہ اوپر سے ہنسنے کھیلنے ناچنے گانے والے لوگ اندر سے کتنے دُکھی ہیں۔ اس بات کا احساس کسی کو بھی نہیں ہوسکتا کہ یہ میلے ٹھیلوں میں سرکس کے باہر ’اڑی‘ پر ناچنے والے۔ گھروں میں خانسامے اور باورچی کا کام کرنے والے شادی بیاہ میں ناچنے گانے والے بھی انسان تھے، کسی ماں کے بیٹھے تھے، ان کے گریئے (عاشق) ہمیشہ شادی شدہ ہوتے ہیں اور ان میں نوے فیصد خود بھی شادی شدہ ہیں کہ ماں، باپ، خاندان اور معاشرے نے مجبور کردیا تھا۔ یہ کسی دفتر میں کام نہیں کرسکتے۔ کسی جگہ افسر نہیں بن سکتے۔ اتنے اچھے ذہن اس لیے تباہ ہورہے تھے۔ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا یہ معاشرے کے ہاتھوں استعمال ہونے والے تھے جنھیں میں نے بہت قریب سے دیکھا اور میرا دل غصے اور رنج سے بھر گیا۔ میں ایل ایل بی کرنے کے بعد امریکہ آ گیا۔

امریکہ ایک نئی دنیا؛ میری دنیا سے بالکل مختلف sixties کی لزبئین موومنٹ ابھی پروان چڑھ رہی تھی، stonewall کا واقعہ ابھی تازہ تازہ تھا۔ یہاں آ کر مجھے احساس ہوا کہ Homosexual کے لیے ایک باعزت لفظ بھی ہے جسے Gay کہتے ہیں۔ امریکہ میں رہنے والے Homosexuals کی داستان گوئی پاکستان یا ہندوستان میں رہنے والوں سے مختلف نہیں ہے، وہی معاشرے کا دباؤ، خاندان والوں کی ناطقہ بندی اور طعنہ تشنیع۔ آوازیں اور گالیاں اور جسمانی تشدد سب کچھ یہاں بھی ہورہا تھا۔ یہاں کے نفسیات والوں نے Homo-sexuality کو ایک بیماری کا نام دے کر ہم جنسوں پر انتہائی متشدد تجربے کیے جن میں الیکٹرک

شاک سرفہرست ہیں۔ امریکہ کی جنوبی ریاستوں میں تو ہم جنسوں کو جلا دیا جاتا تھا، اس لیے ہم جنسوں کو پہلے طنزاً Fggot بھی کہا جاتا ہے۔ آخر اس تشدد اور ظلم کے خلاف آواز اٹھائی گئی جس کی طرف داری یہاں کے رائٹرز Avant-Garde اور بڑے بڑے علما اور فضلا نے کی۔ Stonewall بار کے اندر قلعہ بند ہو کر پولس سے لڑنے والے ہم جنس بھائیوں نے اپنی جان پر کھیل کر باقی کمزور اقلیت کو ایک تشخص بخش دیا، ایک گنگ جذبے کو زبان مل گئی اور بقول آسکر وائلڈ کے:

'A love that dare not speak its name'

اب بہ بانگ دہل اپنا اظہار کرنے لگی۔

میں نے اس تاریخ کا مزید مطالعہ کیا تو مجھے احساس ہوا کہ ایک بڑی جھوٹی زندگی گزار رہا تھا۔ یہ لوگ مجھ سے مختلف نہیں ہیں تو پھر ان میں سچ بولنے کی طاقت کہاں سے آگئی۔ میں غزلوں میں جھوٹ لکھتا تھا اور میں نے محسوس کیا کہ غزل کی روایت میں اس طرح کھل کر بات نہیں کرسکتا کہ قافیے کی مجبوری ہے، تو میں نے نظم کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنالیا اور میری یہ نظمیں اسی سچائی کا اظہار ہیں، اسی جذبے کا نام جسے اب تک محبت کہا جاتا رہا ہے، انھیں میں اپنی نظموں میں پیش کررہا ہوں۔

اس کتاب کا مقصد کسی شخص کی طرز زندگی کو مختلف کردینا نہیں اور نہ ہی یہ کسی جنت گم گشتہ کی یافت کا وعدہ ہے۔ یہ تو صرف ایک سچائی ہے جس کا اظہار میں نے لفظوں میں کردیا ہے کہ میں اندھیرے کا آدمی بن کر زندہ رہنا گوارہ نہیں کرتا۔

مجھے علم ہے اس کتاب سے ان احباب کی دل شکنی ہوگی جو مجھے 'ایسا' نہیں سمجھتے تھے لیکن اگر وہ میری سچائی کی وجہ سے مجھ سے الگ ہوجائیں یا مجھ سے نفرت کرنا شروع کردیں گے تو مجھے قبول ہے۔ ان کو علم نہیں کہ اس سچائی کے ناکردہ اظہار سے میرے اندر کتنا زہر بھرا ہوا تھا جو نکل گیا۔ میں تنہائی کی صلیب پر مصلوب رہا تھا۔ اب میں اپنے جیسے لوگوں میں ہوں اور خوش ہوں۔ یہ ضروری نہیں کہ اگر ایک شخص اقلیت ہے تو اس کے تمام حقوق چھن جائیں۔ اگر ایک شخص محنت کرکے دو وقت کی روٹی کماتا ہے تو اس میں اس کی عزت ہے نہ کہ اس میں کہ وہ کس کے ساتھ سوتا ہے۔ میری ترجیح جنس کے کشف نے مجھے اور اچھا بنادیا کہ اب میں یہ کمزور اقلیتوں کے دُکھ درد کو سمجھنے لگ گیا جن میں بچے، عورتیں، جانور، درخت اور تمام حشرات الارض شامل ہیں۔ جسم کی

بندشوں سے آزاد ہو کر ذہنی طور پر ان چیزوں سے ہم آہنگ ہو گیا۔ میرے نزدیک انسان ہی ایک مکمل اکائی ہے؛ کوئی مذہب، رنگ نسل اور جنسی ترجیحات نہیں ہے۔ میں شکرگزار ہوں پروردگار کا کہ میں انسان پیدا ہوا اور انسان ہی مرجانا چاہتا ہوں۔ میرے نزدیک ایک انسان کا دوسرے انسان کے ہاتھوں استحصال ہونا ایک بہت بڑا جرم ہے۔ یہ استحصال معاشی، جسمانی، ذہنی اور جنسی بھی ہوسکتا ہے۔ میرا خواب ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ خواب ضرور حقیقت میں بدل جائے گا کہ کوئی لڑکا یا لڑکی اپنی ترجیح جنس کی وجہ سے لوگوں کے طعنہ میں تشنیع اور مظالم کا نشانہ نہیں بنے گا اور بغیر کسی تفاوت یا تفریق، وہ دنیا میں اپنی ذہنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا سکے گا۔ انھیں بھی معاشرے اور قانون کا ایسا ہی تحفظ حاصل ہوگا جو ایک اکثریت کو ہے۔

دوسرا خواب یہ ہے کہ تمام دنیا میں پاسپورٹ اور کرنسی کی تمام پابندیاں ختم ہو جائیں۔ ہر شخص دنیا کے اس دائرے پر بغیر کسی رکاوٹ اور تفریق کے آ جا سکے۔ کیا یہ دنیا، یہ زمین ان پابندیوں کے بغیر خوب صورت نہیں ہو جائے گی۔ ہم لوگ کسی کو بھی اس وجہ سے کہ وہ پہلی دنیا، دوسری دنیا یا تیسری دنیا سے ہے، مختلف نظر سے نہیں دیکھیں گے۔ مسلمان، عیسائی، یہودی، ہندو، بدھ مت یا جتنے بھی مذاہب ہیں، سب ایک دوسرے کے ساتھ محبت اور صلح پسندی سے رہ سکیں گے۔

یہ نعرہ شاید پرانا لگتا ہے لیکن اس کی سچائی اب بھی نئی ہے، 'نفرت کی سب دیواریں گرا دو'، آؤ ہم سب اس دنیا کو انسان کے رہنے کے لیے ایک خوب صورت جگہ بنا دیں اور صرف ہم ہی کر سکتے ہیں۔ آؤ ایک دوسرے کو قبول کر لیں، کوئی جیسا بھی جہاں بھی ہے، اسے امن اور شانتی سے رہنے دیں۔

شکریہ ادا کرنا ایک رسم سہی، لیکن اس میں بھی کتنی اپنائیت ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں، میں سب سے پہلے پروفیسر چوہدری محمد نعیم کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے میرے تخلیقی جنون اور وقت بے وقت کی ٹیلی فون کالوں کو برداشت کر کے اتنے سالوں تک بڑے تحمل اور صبر کا ثبوت دیا، یہ ان کی بہت بڑی انسان نوازی ہے۔ شکاگو میں میرے واحد سامع ہیں، ان کے بغیر میری شعری دنیا نامکمل ہے۔

سلمان اختر کے بارے میں کیا کہوں، خود ایک نہایت اچھے شاعر جو جاں نثار اختر اور صفیہ اختر کے بیٹے، جاوید اختر کے بھائی ہیں اور میرے بہترین دوست ہیں۔ ان کی بیوی راج کی مجھے مکمل support حاصل ہے جو میرے حوصلے بلند کرتی رہتی ہے۔

میرے مسیحا چندر ناتھ آ ہوجہ کا ذکر آتے ہی میری آنکھیں بھیگ جاتی ہیں، انھوں نے اپنی پروفیشنل تھراپی سے میری انتہائی زیادہ مدد کی ہے۔ میرے گونگے جذبے کو زبان دی، زبان کو طاقت اور اسے اِذن دیا کہ اظہار کروں کہ میں کیا ہوں۔

بہت سے لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو میرے اس سفر کے ساتھی رہے۔ ان بے چہرہ لیکن جاندار اجسام کے لوگوں کے نام یا تو میں بھول گیا یا پوچھے نہیں تھے۔ ان کا بھی مشکور ہوں کہ زندگی میں ہر تجربہ کچھ نہ کچھ دے جاتا ہے، یہ تو لینے والے پر منحصر ہے کہ وہ اسے منفی بنا دے یا مثبت کر دے۔

شکریہ ذوالفقار علی شاہ زلفی کا جس نے پاکستان میں رہتے ہوئے اپنے معاشرے سے بغاوت کی۔

شکریہ سراج کا کہ اس نے مجھے امریکہ کی Under Ground دنیا سے روشناس کرایا۔

شکریہ انجم سلیمی، نذر جاوید، مقصود وفا، اشرف یوسفی، فیضی، نعیم ثاقب، عارف عسکری اور خرم خلیق کا جو نئی نسل کے وہ نمائندہ شاعر ہیں جو مجھے سمجھتے ہیں اور ان کی شاعری سے بہت سی توقع کی جا سکتی ہے۔

شکریہ ڈاکٹر عذرا رضا، علی شوکت خواجہ، ممتاز علی خاں کا جو مختلف دنیا سے تعلق رکھتے ہیں اور میرے اپنے ہیں۔

۲۴ اگست ۱۹۹۴

فکشن

تیسری جنس

چودھری محمد علی ردولوی

مدی کا اصلی نام احمدی خانم ہے۔ تحصیل دار صاحب پیار سے مدی مدی کہتے تھے۔ وہی مشہور ہو گیا۔ مدی کا رنگ بنگال میں سو دو سو میں اور ہمارے صوبے میں ہزار میں ایک تھا۔ جس طرح فیروزے کا رنگ مختلف روشنیوں میں بدلا کرتا ہے، اسی طرح مدی کا رنگ تھا۔

تھی تو کھلتی ہوئی سانولی رنگت جس کو سبزہ کہتے ہیں، مگر مختلف رنگ کے دوپٹوں یا ساڑھیوں کے ساتھ مختلف رنگ پیدا ہوتا تھا۔ کسی رنگ کے ساتھ دمک اٹھتا تھا، کسی رنگ کے ساتھ تمتماہٹ پیدا کرتا تھا۔ بعض اوقات جلد کی زردی میں سبزی ایسی جھلکتی تھی کہ دل چاہتا تھا دیکھا ہی کرے۔ شمع کی روشنی میں مدی کی رنگت غضب ہی ڈھاتی تھی۔ کبھی آپ نے دوسرے درجے کے مدقوق کو دیکھا ہے، اگر بیماری سے قطع نظر کیجیے تو رنگت کی نزاکت ویسے ہی تھی۔ آنکھیں بڑی نہ تھیں مگر نگاہ نیچے سے اوپر کرتی تھی تو واہ واہ معلوم ہوتا تھا مندر کا دروازہ کھل گیا، دیوی جی کے درشن ہو گئے۔ مسکراہٹ میں نہ شوخی نہ شرارت، بناوٹ کی شرم، لبھاوٹ کی کوشش۔ لکڑی لوہے کے قلم کو کیسے موقلم کر دوں کہ آپ کے سامنے وہ مسکراہٹ آ جائے۔

بس یہ سمجھ لیجیے کہ خدا نے جیسی مسکراہٹ اس کے لیے تجویز کی تھی، وہی تھی۔ مدی اپنی طرف سے اس میں کوئی اضافہ نہیں کرتی تھی۔ اس کے کسی انداز میں بناوٹ نہ تھی۔ ہاتھ پاؤں، قد چہرے کے اعضا سب چھوٹے چھوٹے مگر واہ رے تناسب۔ آواز، ہنسی، چال ڈھال ہر چیز ویسی ہی۔ میں مدی سے بہت بے تکلف تھا، مگر عشاق میں کبھی نہ تھا اور جہاں تک میں جانتا ہوں کوئی اور

بھی نہیں سنا گیا۔ ایسی خوب صورت عورت بلا مرد کی حفاظت کے، زندگی بسر کرے اور عشاق نہ ہوں، بڑے تعجب کی بات ہے۔ مگر واقعہ ہے، ایک دن میں نے کہا، "مدی! اگر ہم جادوگر ہوتے تو جادو کے زور سے تم کو تتلی بنا کر ایک چھوٹی سی ڈبیا میں بند کر کے اپنی پگڑی میں رکھ لیتے۔" اس فن شریف سے واقف کار حضرات جانتے ہیں کہ جو حربہ میں نے استعمال کیا تھا، وہ کم خالی جانے والا تھا۔ مگر اس کے جواب میں وہی بے تکلف مسکراہٹ کی ڈھال جو تلوار کا منھ توڑ دے۔

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

اکثر خیال گذرتا ہے کہ یہ استغنا تحصیل دار مرحوم کی سفید داڑھی کے سائے میں پرورش پانے کا اثر ہے۔ مگر پھر عقل کہتی تھی کہ جوش حیات نے نہ معلوم کتنی سفید داڑھیوں میں پھونکا ڈالا ہے۔ وہ سفید داڑھی قبر میں پہنچ گئی، اس کا اثر کہاں سے آیا۔ بہر حال قصہ سنتے جائیے اور رفتہ رفتہ رائے قائم کرتے جائیے۔ مدی کے ہر انداز میں نسوانیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ ایک بات البتہ تھی جو گو عورتوں میں بھی ہوتی ہے مگر ایسے بوڑ والوگ اس کو مرد ہی سے منسوب کرتے ہیں، یعنی اپنے ہم طبقہ عورتوں میں اور اسی طبقے کے مردوں میں مدی حکومت خوب کر لیتی تھیں۔ ہر شخص عورت ہو کہ مرد ان کا تابع فرمان رہتا تھا، اور ان کے اشارے پر چلنے کو تیار۔ اب شروع سے قصہ سنیے۔ تحصیل دار صاحب کا نام کیا کیجیے گا جان کر، مرحوم بڑے اچھے آدمی تھے۔ مگر بے عیب خدا کی ذات، کچھ خاص خاص کمزوریاں کہی جاتی تھیں۔ پرانی وضع کے لوگ تھے۔ بڑی شان سے تحصیل داری کی۔ لاکھوں کمائے اور ہزاروں اڑائے مگر اولاد نہ ہونے کی وجہ سے ان کی زندگی کچھ بے مرکز سی ہو گئی تھی۔ بی بی بہت دن ہوئے مر چکی تھی۔ کوئی قریب کا عزیز بھی نہ تھا۔ صرف ایک نوکر تھا وہی سیہ سپید کا مالک تھا۔ تنخواہ اسی کے ہاتھ آتی تھی اور جب پنشن ہوئی تو پنشن کا بھی وہی حق دار ٹھہرا۔ میاں کے کپڑے اور کھانا بھی میاں حسن علی ہی پسند کرتے تھے۔ حسن علی کسی کام کو بازار گئے۔ وہ تھان رادھانگری ڈوریے کے لیے چلے آتے ہیں۔ میاں کے کرتے بنیں گے مگر میاں کو اس وقت خبر ہوئی کہ جب درزی قطع کرنے لگا۔

"ارے میاں حسن علی، یہ ڈوریہ کیا لائے ہو؟"

حسن علی: "آپ کے کرتوں کے لیے۔ ڈوریہ وضع دار ہے۔ سلنے پر اور کھلے گا۔"

" کھلے گا تو مگر کرتے تو میرے پاس تھے۔ ابھی اسی دن شربتی لے آئے۔ آج ڈوریہ

لیے چلے آتے ہیں، آخر پوچھ تو لیا ہوتا۔"

"پوچھ کے کیا کرتا۔ آپ ہی تو کہتے کہ رہنے دو گھر میں ایک چیز ہوگئی۔ برسات کا زمانہ ہے۔ دھوبی دیر میں آیا کرے گا۔ دو جوڑے فاضل اچھے ہوتے ہیں۔"

"خیر بھئی۔"

تحصیل دار کھانے پر بیٹھے ہیں۔" میاں حسن علی آج کل بازار میں مچھلی نہیں آتی؟"

" آتی تو ہے مگر گرمیوں کی وجہ سے میں نے نہیں منگوائی۔ اس فصل میں مچھلی نقصان کرتی ہے، صبح کو مرغ پک جائے گا۔" تحصیل دار صاحب پر حسن علی کی شخصیت ایسی غالب آئی تھی کہ جو بات وہ پسند کرتے تھے، تحصیل دار سمجھتے تھے کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔ اسی وجہ سے غیر ذمہ دار لوگ دونوں کا ذکر کر کے مسکراتے تھے اور آپس میں آنکھیں مارتے تھے۔ میاں حسن علی کا استرے صفاچٹ چہرہ اور تحصیل دار صاحب کی بھبو داڑھی پر چہ مگوئیاں ہوتی تھیں۔ داڑھی مونچھوں کا صفایا صرف انگریزی داں حضرات کا حق ہے۔ اگر حسن علی ایسے اپنی چال چھوڑ کر ہنس کی چال چلیں گے تو اللہ ہی نے کہا ہے لوگ کوئی نہ کوئی نکالیں گے۔

بہر حال اصلیت کی خبر خدا کو ہے۔ ہم تو جو کچھ بھی دیکھتے تھے، وہ یہ تھا کہ تحصیل دار کا ہمدرد دنیا جہاں میں حسن علی کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ حسن علی کو بھی اس سے اچھا آقا اگر چراغ لے کر ڈھونڈتے تو نہ ملتا۔

اللہ میاں نے دو جنس بنائی تھیں؛ عورت اور مرد۔ یورپ کے ڈاکٹروں نے تحقیقات کر کے ایک اور جنس ایجاد کی ہے جو اپنے ہی جنس کی طرف راغب ہو۔ اس جنس میں عوتیں بھی شامل ہیں اور مرد بھی۔ اب نہ معلوم تحصیل دار اور حسن علی اس تیسری جنس میں سے تھے یا ویسے ہی تھے جیسے ہم آپ یا بعد کو کچھ ادل بدل ہوئی۔ اس کو نہ ہم جانتے ہیں نہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ جانیں اور ان کا کام۔ بظاہر ان دونوں کے افعال سے دوسروں کی سماجی زندگی میں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اس لیے ہم کو کھوج کی کوئی ضرورت بھی نہیں معلوم ہوتی۔ تحصیل دار صاحب بھاری بھرکم آدمی تھے۔ اولاد نہ ہونے کا دکھڑا کیا روتے مگر اولاد کی تمنا اس بات سے ظاہر ہوتی تھی کہ جب کھانا کھاتے تو حسن علی احمدی کو بلوا بھیجتے تھے کہ دستر خوان پر بیٹھ جائے۔ اسی وجہ سے کھانا تنہائی میں کھانے لگے تھے۔ نوکر کی لڑکی کو دستر خوان پر کھلاتے کچھ اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس کے علاوہ اگر سب کے سامنے کھلاتے تو صاحب اولاد نہ ہونے کا رنج اور بچوں کی تمنا لوگوں پر کھل جاتی۔ بی احمد

ی خانم عرف مدی بیگم کا سن چار برس کا رہا ہوگا۔ دسترخوان پر شوربہ گرانا، لقمہ ڈبونے میں دال کا پیالہ گھنگول دینا بچوں کا شیوہ ہے۔ اور نفیس لوگ اسی وجہ سے بچوں کو الگ کھلاتے ہیں۔ گو کہتے یہی ہیں کہ جوانوں والا کھانا بچوں کو نقصان کرتا ہے مگر تحصیل دار صاحب کو اس میں لطف آتا تھا۔ ادھر دسترخوان پر بیٹھے اور ادھر بی مدی کی طلب ہوئی۔ رفتہ رفتہ مدی خود وقت پہچان گئیں۔ تھوڑے دنوں میں مدی تحصیل دار صاحب کے یہاں رہنے لگیں۔ یا گھر میں ایک طرف چھوٹا بھیا اور بیچ میں حسن علی کی بی بی تھیں یا ان کی پلنگڑی الگ بنی۔ صاف چادر لگائی گئی۔ چھوٹے چھوٹے تکیے بنوائے گئے۔ تحصیل دار صاحب کے پاس ان کی بھی پلنگڑی بچھنے لگی۔ جوتے پہنے رہنے کی تاکید ہوئی کہ بچھونا میلا نہ ہو۔ لڑکی تھی پیدائشی سلیقہ مند۔ ایک بار سے دوسری بار بتانے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ پانچ چھ ہی برس کے سن میں ایسا سلیقہ آ گیا کہ آدھی بی بی معلوم ہوتی تھیں۔ تحصیل دار صاحب کے پان خود بناتی تھی۔ دس گیارہ برس کے سن میں جنس تلوانا، کھانا پکوانا، سب کچھ مدی کے ہاتھ ہو گیا تھا۔ دن جاتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ چودھویں برس مدی کا شباب دمک اٹھا۔ دیکھنے والوں کا دل چاہتا کہ دیکھا ہی کریں۔ مدی بھی جب بال بنانے کھڑی ہوتی تو آئینے کے ساتھ خود بھی متحیر رہ جاتی تھیں۔ اب ماں کو شادی کی فکر ہوئی۔ تحصیل دار صاحب سے کہا گیا۔ انھوں نے کہا جلدی کیا ہے، ہو جائے گی۔ مگر لڑکی حسن علی کے بھتیجے کو بچپن ہی سے مانگی تھی۔ ادھر سے بھی اصرار ہوا کہ جوان لڑکیوں کا امیروں کے گھر میں رہنا اچھا نہیں۔ لیجیے صاحب شادی ہو گئی۔ تحصیل دار صاحب نے خود تو اپنے گھر سے شادی نہیں کی مگر جہیز وغیرہ خوب سا دیا۔ چوتھی چالے کے بعد پھر وہی تحصیل دار صاحب کے یہاں کا رہنا۔ مدی کے دولہا بھی تحصیل دار صاحب کے یہاں آتے تھے۔ مدی سسرال کم جاتی تھی۔ گئیں بھی تو کھڑی سواری، بہت رہیں تو ایک رات نہیں تو اسی دن واپس آ گئیں۔ سسرال والے جاہل، شوہر بھی الیف کے نام لٹھا نہیں جانتے۔ گو مدی بھی بغدادی قاعدہ اور عم کے سپارے کے آگے نہیں پڑھی تھیں مگر پھر بھی پڑھے لکھے ہوئے کی پالی ہوئی تھیں۔ عمر بھر امیری کارخانہ دیکھا تھا، مدی کا دل سسرال میں کم لگتا تھا۔ کم سنی میں بیاہ کا تجربہ کچھ اچنبھے میں ڈالے تھا۔ شادی کے بعد اگر عورت پر کنوارے پنے کی آب نہیں رہ جاتی تو سہاگ کی رونق چہرہ چمکا دیتی ہے۔ مگر احمدی کے چہرے سے نہ اس بات کا پتہ چلتا تھا، نہ اس کا۔ میاں بیوی کا برتاؤ کا حال دو چار دن میں کیا کھلتا۔ مگر کسی خاص خوشی یا اطمینان کا اندازہ اس میں بھی نہیں دکھائی دیتا تھا۔ کچھ ہی دنوں میں یہ بھی نہ رہ گیا اور کھلم کھلا ناخوشی کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ شوہر صاحب کچھ

دبے دبے سے تھے۔ تحصیل دار صاحب کے یہاں آ کر وہ بھی اپنی شوہریت کا برتر درجہ برت نہیں سکتے تھے۔ خود اپنی ہیچ میرزی اور بی بی کی بلندی ان کی نظر میں کھٹکتی تھی۔ ضرورتیں مجبور کرتی تھیں، نئی نئی بی بی، کچھ روپیہ پیسہ بھی ہاتھ آ جاتا تھا۔ اس لیے چپ تھے۔ ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ مدی جو سو کر اٹھیں تو ایک چھڑ غائب۔ بستر پر اِدھر اُدھر دیکھا، دلائی جھاڑی، پائینتی جھک کے دیکھا، گھر میں ادھر اُدھر تلاش کیا مگر کہیں نہ ملا۔ نہ معلوم کیا سمجھ کر چپ ہو گئیں۔ دوپہر کے قریب ماں سے آ کر کہا۔ ماں نے شور مچا دیا۔ تحصیل دار صاحب تک خبر ہوئی، انھوں نے سنتے ہی کہہ دیا کہ یہ حرکت سوائے مدی کے دولہا کے اور کسی کی نہیں ہو سکتی۔ یہ بھی کہا کہ اس کے جوا کھیلنے کی خبر مجھ تک پہنچ چکی ہے۔ لیجیے صاحب شوہر بھی روٹھ گئے۔ دو چار دن کے بعد رخصتی کا اصرار ہوا۔ مگر چھڑے والی بات پکڑ کر مدی کے ماں باپ نے انکار کر دیا۔ ایک روز مدی کے شوہر نے حسن علی کے گھر آ کر بہت سخت سست سنایا، اور غصے میں یہ بھی کہا کہ حرام زادی کے جھونٹے پکڑ کر گھسیٹتا نہ لے جاؤں تب کہنا۔ اس وقت تک مدی نے کسی کی جانب داری نہیں کی تھی لیکن اب وہ بھی فرنٹ ہو گئی۔ اور ایسی فرنٹ ہوئی کہ مرتے دم تک پھر منھ نہ دیکھا۔ حسن علی نے بھی خیال کیا، داماد ممکن ہے کچھ شہدا پن ہی کر بیٹھے، اس لیے مدی کا پورے طور سے تحصیل دار صاحب ہی کے یہاں رہنا اچھا ہے۔ شوہر صاحب، ہمیشہ کے لیے معطل کر دیے گئے۔

جب سے مدی کی شادی ہوئی تھی۔ تحصیل دار صاحب کچھ چپ سے رہتے تھے، اس واقعے کے بعد وہ بھی بحال ہو گئے۔ مدی کے شوہر نے اپنی مفاہمت سے یہ بھی کہا کہ تحصیل دار صاحب نے اس سے آشنائی کر رکھی ہے مگر اس کو کون باور کرتا۔ حسن علی والی بات پر تو لوگ ہنسی مذاق بھی کرتے تھے مگر اس بات کو کسی نے جھوٹوں بھی یقین نہ کیا۔ البتہ تحصیل دار صاحب تجربہ کار آدمی تھے، انھوں نے موت زندگی کا خیال کر کے مدی کے لیے علاحدہ گھر اور کچھ بودگی کا انتظام کرنا شروع کیا۔ اس واقعے کے دوسرے سال کے اندر تحصیل دار صاحب کا انتقال ہو گیا۔ تحصیل دار صاحب مرحوم کے یا تو کوئی نہیں تھا یا یکبارگی نہ معلوم کتنے وارث پیدا ہو گئے اور آپس میں مقدمہ بازی شروع ہو گئی۔ بی مدی نے بھاری پتھر چوم کے چھوڑا۔ اٹھ کر اپنے گھر چلی آئیں۔ تخت، چارپائیوں، الماریوں پر نہ ان کا حق تھا، نہ انھوں نے دعویٰ کیا۔ نقد جو کچھ تحصیل دار صاحب ان کو دے گئے ہوں، کون لے سکتا تھا۔ ہاتھ ناک، گلے میں جو کچھ تھا وہ ان کا تھا ہی۔ مدی نے حسن علی کی صلاح سے یہ طریق اختیار کیا کہ اپنے طبقے سے اونچی ہو کر رہنا پسند نہ کیا بلکہ

اپنے جیسے لوگوں سے انسیت کے بارے میں

جس حیثیت کے ان کے ماں باپ تھے، اسی برادری میں رہیں۔ البتہ روپیہ پیسہ اور سلیقہ ہونے کی وجہ سے اپنے طبقے میں یوں رہیں جیسے مالی کی نگاہ میں سب پھولوں میں گلاب کا پھول ہوتا ہے۔

تحصیل دار صاحب کے سال ہی بھر بعد طاعون بڑے زوروں کا پڑا۔ اس میں میاں حسن علی اور ان کی بی بی بھی چل بسیں، اب صرف بی مدی اور ان کا چھوٹا بھائی رہ گئے۔

اس وقت تک مدی نے کچھ اچھا برا کیا ہوگا، اس کی ذمہ داری صرف ان کے اوپر نہ تھی۔ کیوں کہ ہر معاملے میں تحصیل دار مرحوم اور اس سے کم درجے تک ان کے باپ کی رائے شامل رہتی تھی۔ اس کے بعد جو کچھ پیش آیا، وہ البتہ ان کے دل و دماغ کا نتیجہ تھا۔۔ مدی کا برتاؤ ہر شخص سے عمدہ تھا۔ کوئی شاکی نہ تھا بلکہ اڑوس پڑوس کی عورتیں ہر وقت ان کے گھر میں موجود رہتی تھیں۔ ان سے بھی جو ہوسکتا تھا، آنے جانے والیوں کے ساتھ سلوک کرتی تھیں۔ گھر میں کپڑا سینے کی مشین تھی۔ دن بھر لوگوں کے کپڑے مفت سیا کرتی تھی۔ کسی کو اگر روپے دو روپے کی ضرورت ہوتی، وہ بھی قرض کے نام سے دے دیے۔ جس کسی کا کہیں ٹھکانہ نہ لگے، وہ مدی کے یہاں چلا آئے۔ روٹی اپنی پکائے دال بی مدی سے لے لے۔ پان پتا بھی مدی کے پاندان سے کھائے۔ اسی زمانے میں ایک عورت نہ معلوم کہاں کی باہر سے آئی۔ اس کو بھی مدی نے رکھ لیا۔ عورت سلیقہ مند تھی۔ اپنا بار بھی ان پر نہیں ڈالتی تھی بلکہ پیسے دو پیسے کا سلوک خود ہی کر دیتی تھی۔ کچھ انگوٹھیاں، کچھ کیلیں، لیس، صابون وغیرہ بیچتی تھیں۔ صبح ہوئی اور برقع اوڑھ کر نکل گئیں۔ دوپہر کو آئیں، کھانا کھایا، آرام کیا، اس کے بعد پھر نکل گئیں۔ شام کو لوٹیں ... یہ مسماۃ آئی تھیں تو یہ کہہ کر دو چار دن میں سودا کر کے دوسری جگہ چلی جائیں گی۔ مگر مدی سے کچھ ایسی پرگت ملی کہ گھر کی طرح رہنے لگیں۔ محبت و یگانگی کی وہ پینگیں بڑھیں کہ سگی بہنیں مات تھیں۔ صورت و شکل کی تو معمولی تھیں مگر قد کشیدہ تھا۔ جب برقع اوڑھ کر راستہ چلتی تھی تو معلوم ہوتا تھا کہ مرد کا بھیس بدلے ہوئے چلا آتا ہے۔ چال ڈھال قد کے علاوہ بھی کچھ اور باتیں مردوں کی ایسی تھیں مثلاً ہاتھ پاؤں کے دیکھتے سینہ کم تھا۔ کمر، کولھے، پاؤں کی چوڑی چوڑی ایڑیاں بھی عورتوں کی ایسی نہ تھیں۔ تھوڑے ہی دنوں میں یہ ہوگیا کہ دن کو ویسا ہی مجمع رہتا تھا مگر رات کو دوسری عورتیں کم رہنے لگیں۔ جب منھ نہیں پایا تو پرائے گھر میں کیسے ٹھہرتیں۔ پہلے تو عورتوں میں سرگوشیاں ہوئیں، پھر محلے میں ہر شخص اسی کا ذکر کرنے لگا۔ مگر مدی اور اس عورت نے بجائے تردید کرنے کے ایک آزادانہ بے پروائی کا انداز اختیار کر لیا۔ ان عورتوں نے کہا، ہم لوگ کسی کی بہو بیٹی ہیں یا پھر سے نکاح کرنا ہے جو ہر شخص

کے آگے قسمیں کھاتے، قرآن اٹھاتے پھریں۔ دنیا اپنی راہ، ہم اپنی راہ۔ مدی نے کہا، اگر ہمارے کوئی والی وارث ہوتا تو کسی کی مجال پڑی تھی کہ ایسی بات کہتا۔ زمانہ گذرتا گیا اور لوگوں کا شک یقین میں بدلتا گیا۔ قاعدہ ہے کہ پنچ برادری سے اگر دب جاؤ تو وہ اور دباتے ہیں۔ اگر مقابلے پر تیار ہو جاؤ تو لوگ اپنی نیکی کی وجہ سے اکثر معاف بھی کر دیتے ہیں۔ یہی حال ان دونوں کا ہوا کہ نہ کسی نے پوچھ گچھ کی، نہ انھوں نے انکار کی زحمت اٹھائی۔

لکھنے والے کو اغلام مساحقے کے ذکر میں کوئی مزا نہیں آتا، مگر اسی کے ساتھ ان چیزوں کا ذکر کرنے سے ڈرتا بھی نہیں۔ اگر یہ چیز دنیا میں ہوتی ہیں تو چپ رہنے سے ان میں اصلاح نہ ہو گی۔ نہ یہ طے ہو سکے گا کہ کہاں تک یہ چیزیں فطری ہیں، اور کہاں تک اسباب زمانہ سے پیش آتی ہیں۔ کسی جولاہے کے پاؤں میں تیر لگا تھا۔ خون بہتا جاتا تھا مگر دعائیں مانگ رہا تھا کہ اللہ کرے جھوٹ ہو۔

ہمارے قصبے کے لوگ دراصل ہیولاک ایلس اور فرائڈ نہیں پڑھے ہیں۔ اس وجہ سے مجبوراً ہمیں ان مسائل پر بحث کرنا پڑی۔

ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ ہر عورت میں کچھ جز و مرد کا ہوتا ہے، اور ہر مرد میں کچھ جز و عورت کا۔ جو جز و غالب ہوتا ہے، اسی طرح کے خیالات اور افعال ہوتے ہیں۔ مردانہ قسم کی عورتیں اور زنانہ قسم کے مرد ہر جگہ دکھائی دیتے ہیں۔ ممکن ہے بعض ان میں ایسے ہوں جن کے فطرتاً اپنے ہی جنس سے اچھے تعلقات معلوم ہوتے ہیں۔ مگر اس میں بھی کلام نہیں کہ اسباب زمانہ سے بھی لوگ اس راہ لگ جاتے ہیں۔ بجائے اصلاح کی کوشش کے ہر معاملے میں یہی رائے قائم کرنا کہ یہ قدرتی تقاضے سے ہے اور اس لیے اصلاح کی ضرورت نہیں، ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ البتہ ایسے فعل کی جس میں سماج کا کوئی نقصان نہ ہوتا ہو، تو قانونی سزا ہونی چاہیے یا نہیں یہ دوسرا مسئلہ ہے۔

اچھا اب قصہ سنیے۔ مدی اور اس عورت سے دو سال دوستی رہی۔ اسی کے بعد لڑائی ہو گئی۔ کس پر بگاڑ ہو گیا، یہ کسی کو معلوم نہیں۔ وہ عورت جس راہ آئی تھی، اسی راہ چلی گئی۔ بی مدی اجڑی بچڑی رنڈاپا کھینے لگیں۔ جوئندہ یابندہ۔ تھوڑے دنوں کے بعد ایک اور ہم جنس مل گئیں۔ اس کے بعد اور بھی ملاکیں مگر...

نہ بے وفائی کا ڈر تھا نہ غم جدائی کا

مزا میں کیا کہوں آغاز آشنائی کا

وہ پہلی سی بات پھر نہ نصیب ہوئی۔ اب روپیہ پیسہ بھی کم رہ گیا تھا، اسی لیے آمدنی بڑھانے کی بھی فکر دامن گیر ہوئی۔ بی مدی نے تحصیل کے آگے ہاتھ بڑھایا، نہ پھر سے شادی کی ہوس کی بلکہ خود کام کرنے پر تیار ہو گئیں۔ پراٹھے کباب بنانا شروع کیے۔ جاڑوں کی فصل میں انڈے گاجر کا حلوا بنانے لگیں۔ کچھ عورتوں کی ضروریات کا بساط خانہ بھی منگوالیا۔ چکن کورشیا کا بھی ڈھچر ڈالا، بیچنے والوں کی کمی نہ تھی۔ اردگرد کی لڑکیاں اور عورتیں سودا بیچ لاتی تھیں اور حق المحنت سے زیادہ حصہ پاتی تھیں۔ بی مدی کو سوداگری کا سب سے بڑا گر نہیں یاد تھا۔ یعنی جو آدمی بہت سے کام ساتھ ہی کرتا ہے، وہ کوئی کام نہیں کرسکتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خرچ آمدنی سے زیادہ ہی رہا۔ یہاں تک کہ مکان بھی گروی رکھنا پڑا۔

روپیہ جانے کے بعد توقیر میں بھی فرق آجاتا ہے مگر اس کی شائستگی اور رکھ رکھاؤ ایسا تھا کہ پھر بھی لوگوں کی نظر میں ہلکی نہ ہوئی۔ کپڑے اب بھی سلیقے کے پہنتی تھی۔ گاڑھا پردہ کبھی نہیں تھا۔ آج بھی سڑک پر ماری ماری نہیں پھرتی تھی۔ تنخواہ والے نوکر کبھی نہیں تھے۔ آج بھی کام کاج کرنے والے آسانی سے مل جاتے تھے مگر اقبال مندی میں گھن بہت دنوں سے لگ چکا تھا، اس لیے چہرے کی آب رخصت ہو چکی تھی۔ زمانہ بدل جانے سے مزاج میں بھی فرق آ گیا تھا۔ ایک دن ان کے گھر میں کئی عورتیں جمع تھیں۔ کسی نے کہا، ''بن مرد کی عورت کس گنتی شمار میں ہے۔'' بی مدی بول اٹھیں ''سچ کہتی ہو بہن''۔ ایسی بات ان کے منھ سے کبھی نہیں سنی گئی تھی۔ یہ سن کر بعض نے دوسروں کو اشارہ کیا۔ بعض نے اتفاق کیا۔ دو ایک ایسی بھی تھیں جو مدی کا منھ تعجب سے دیکھنے لگیں۔ یہ وہ تھیں جنھوں نے مدی کے منھ سے مرد کا نام بلا ناک بھوں چڑھائے عمر بھر نہیں سنا تھا۔

زمانہ گزرتا گیا مگر بی مدی کے دن نہ پھرنا تھے نہ پھرے۔ کچھ دنوں بعد ایک شاہ صاحب آئے۔ بہت مرجع خلائق تھے۔ عقیدت مندوں کا ہجوم ہر وقت لگا رہتا تھا۔ بی مدی بھی دو تین بار کباب پراٹھے کی نذر نیاز پیش کر چکی تھیں۔ اتنے میں خبر اڑی کہ شاہ صاحب حج کو جائیں گے۔ ہمیشہ مرغ پلاؤ توکل پر کھایا کیے۔ اب حج بھی توکل پر کریں گے۔ جس دن شاہ صاحب چلے، لوگوں نے دیکھا مدی بھی دامن سے لگی چلی جارہی ہیں اور لوگوں سے کہا سنا معاف کرارہی ہیں۔ جو کچھ بچی کھچی پونجی تھی، وہ بیچ کر نقد کرلیا۔ باقی کے لیے شاہ صاحب کی ذات اور توکل کا توشہ کافی ٹھہرا۔ حج سے واپسی پر وطن نہیں آئیں بلکہ شاہ صاحب ہی کے قدموں سے لگی رہیں۔

شاہ صاحب اپنے وقت کے بلعم باعور تھے۔ جی چاہے الگنی پر ڈال دیجیے، چاہے چادر کی طرح کاندھے پر لٹکا لیجیے۔ مدی میں جوانی کی کنی گلنے میں اب بھی دیر تھی۔ مگر شاہ صاحب کو دیکھ کر خواب میں بھی آشنائی کا خیال نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اگر غور کیجیے تو پیر بھی ایک طرح کا شوہر ہی ہوتا ہے جس پر مرید اسی طرح تکیہ کرتا ہے جیسے عورت مرد پر۔

کوئل زنانہ

اشرف صبوحی دہلوی

ہیجڑوں، بھانڈوں اور زنانوں کا بھی ہندوستان میں بڑا زور تھا۔ درباروں سرکاروں تک رسائیاں تھیں۔ دنیا میں اور جگہ بھی یہ مخلوق پیدا ہوتی ہوگی، لیکن خدا جانے وہاں انھیں کس نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ہمارے ہاں تو ان کی خوب آؤ بھگت تھی۔ جس محفل میں یہ نہ ہوتے، رانڈ سمجھی جاتی۔ ان میں بھی بڑے بڑے نامی گزرے ہیں۔ اَچپل، گلزار بھانڈ، شہزادہ، دولھا ہیجڑے، شام گھٹا اور کوئل زنانے اپنے اپنے وقت کے چمکتے ہوئے ستارے تھے۔

وہ جو کہتے ہیں، جسے پیا چاہے وہی سہاگن۔ کسی نے سچ کہا ہے:

خاک ساران جہان را بہ حقارت منگر
تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

دنیا والے انھیں کسی نظر سے کیوں نہ دیکھیں، کیسا ہی حقیر و ذلیل سمجھیں، اللہ میاں کی مہربانیاں خاص نہیں عام ہیں۔ بارش جب ہوتی ہے کوڑی اور باغ پر یکساں۔ سورج جب چمکتا ہے، پھول اور کانٹے سب اس کی شعاعوں سے برابر مستفید ہوتے ہیں۔

سنگ کیوں لعل ہوا نیر اعظم کی نگاہ
دانہ کیوں سبز ہوا مسکر مت ابر سیاہ

ایسی اچھوتی مخلوق میں بعض بعض صاحب کمال بھی تھے۔ کہتے ہیں، آخری وقت میں غدر کے بعد کا ذکر ہے، ایک ہیجڑے کو جوجی کی دُھن سمائی تو اپنے سارے دھندے چھوڑ کر، اگلے

پچھلے گناہوں سے توبہ کر، گھنا پا تا بیچ سفر کی تیاری کر لی۔ سن رکھا تھا کہ گندی کمائی کے روپے سے حج نہیں ہوتا۔ مولویوں کے پاس پہنچا لیکن سب نے دھتکار دیا۔ بہت پریشان، دل میں شمع رسالت کی لَو لگی ہوئی، خیال آیا درویشوں سے پوچھنا چاہیے۔ ان دنوں ایک رند مشرب شاہ میر کی بڑی شہرت تھی، ہچکچاتا ہوا ان کے پاس پہنچا۔ شراب کا دور چل رہا تھا، دور سے دیکھتے ہوئے بولے، ''ابے حرام حلال کرنے والوں کے پاس جا، یہاں تو پینی پڑے گی۔''

بیچارا چپ کھڑا ہو گیا۔

شاہ میر: حج کا ارادہ اور مولویوں کی معرفت؟

ہیجڑا: حضور، سب کہتے ہیں کہ تیرا روپیہ گندا ہے۔

شاہ میر: پھر وہ اپنی کوثر کا چھینٹا دے کر پاک نہیں کر سکتے؟

ہیجڑا غریب کیا جواب دیتا، چپ منہ دیکھنے لگا۔

شاہ میر: کھڑے کھڑے جائے گا؟ بیٹھتا کیوں نہیں؟

ہیجڑا: (بیٹھ کر) حضور!

شاہ میر: (شراب کی پیالی بھر کر) لے یہ تو پی۔

ہیجڑا: قبلہ توبہ کر چکا ہوں۔

شاہ میر: تو حج بھی ہو چکا۔ ابے، اسی میں غوطہ مار کر حج ہو گا۔

ہیجڑا: پیرومرشد!

شاہ میر: جا تو پھر مولویوں سے فتویٰ لے۔ یہاں تو اسی راہ سے حج کو بھیجا کرتے ہیں۔

شاہ صاحب کی لال لال آنکھیں دیکھ کر کچھ تو وہ ڈرا اور کچھ ان پر اعتقاد، جھٹ پیلا اٹھا منہ سے لگا لیا۔ عجب مزہ پایا۔ شراب کیا تھی، دودھ اور شہد کے گھونٹ تھے۔

شاہ میر: ہاں بھئی، حج کو جاؤ گے؟ کتنا روپیہ ہے؟

ہیجڑا: کچھ کم دو ہزار۔

شاہ میر: اچھا، کل اسی وقت یہاں لے آنا۔ ہم اسے پاک کر دیں گے۔

ہیجڑا کچھ دیر بعد وہاں سے اٹھ کر اپنے گھر آیا۔ دن بھر اور رات بھر سوچتا رہا کہ روپیہ کس طرح پاک ہو سکتا ہے؟ شرابیوں کی باتیں ہیں، کوئی اور فتور نہ پڑ جائے۔ صبح ہوئی، دل دھکڑ پکڑ تھا، مگر حج کی چٹیک بھی لگی ہوئی تھی۔ روپیہ پوٹلی میں باندھ سیدھا تکیے پہنچا۔

شاہ میر: (ہیجڑے کو دیکھتے ہی پکار کر) آ گئی سونے کی چڑیا۔ (اپنے چیلے چانٹوں سے) کیا دیکھتے ہو، لوٹ لو۔ بھٹی بنائیں گے۔ خدا نے دن پھیر دیے۔

وہاں کیا دیر تھی، اور ہیجڑے بیچارے کی کیا ہستی۔ جا دبوچا۔ پوٹلی چھین حصے بخرے ہونے لگے۔ اس کی سٹی گم، حواس باختہ، نہ لڑنے کی طاقت نہ واویلا مچانے کا دھرم۔ جنگل بیاباں قبرستان میں کون اس کی فریاد سنتا۔

شاہ میر: کیوں بھئی حج کو جانے کا ارادہ ہے؟

ہیجڑا: (آنسو بہا کر) میاں، اب میں کیا کروں؟ حرام حلال کی جیسی کمائی تھی، وہ بھی تم نے لٹوادی۔

شاہ میر: اللہ کو یاد کرو۔

ہیجڑا: ہارے کی فریاد اللہ ہی سننے والا ہے۔

شاہ میر: تو بھئی پاؤں پیدل چلے جاؤ۔

ہیجڑا: میاں اتنا دم ہوتا تو اب تک کبھی کا چلا جاتا۔

شاہ میر: (پیالہ بھر کر) اچھا لو اسے پیو اور تمھاری ہم کیا خاطر کریں۔ کڑھو نہیں، حج کو جانے کا بھی انتظام ہو جائے گا۔

ہیجڑا دم بخود۔

شاہ میر: (لال لال آنکھیں چمکا کر) پیتا ہے یا نہیں؟ زیادہ نخرے کیے تو یاد رکھ ابھی سونٹا پڑنے لگے گا۔

ہیجڑا غریب سہم گیا۔ پینی پڑی۔ اب کے مرشد کے پیالے میں کچھ اور رنگ تھا۔

شاہ میر: (اپنے چیلوں سے) یارو، ایک غریب حج کو جانا چاہتا ہے۔ حسب توفیق اس کی مدد کرو۔ جو جس کے پاس ہو، اسے دے دو۔

اتنا کہنا تھا کہ سب نے اپنی اپنی لوٹ کے روپے نکال کر سامنے رکھ دیے۔ ہیجڑے کو حیرت ہوئی۔ رومال پھیلا جلدی جلدی سمیٹنے لگا۔

شاہ میر: بس بھئی اب تو خوش ہوئے۔ لو سدھارو اور جا کر مولویوں سے فتویٰ بھی چاہے لے لو۔ اٹھو روانہ۔ پیر مغاں سے ہمارا بھی سلام کہہ دینا۔

چنانچہ اسی سال وہ حج کو گیا اور وہیں کا ہو رہا۔ ہر برس حاجی آ کر سناتے کہ ہیجڑے کی تو

تقدیر کھل گئی۔ روضۂ اقدس پر اپنے سر کے بالوں سے جھاڑو کرتا ہے۔

کیا شان دکھائی ہے اے سوختہ سامانی
اس شمع رسالت کا پروانہ بنا دیکھا

کوئل زنانہ نام سے ظاہر ہے کہ آبنوسی رنگ کا ہوگا۔ کوئل کو تو مرے ہوئے کم از کم چالیس برس ہوئے ہوں، شام گھٹا تو ابھی کوئی پندرہ برس ہوئے مرا ہے۔ حج کر کے خاصی صوفیوں اور مولویوں کی سی وضع اختیار کر لی تھی۔ کوئل کا رنگ اس سے زیادہ وارنشی تھا۔ لڑکپن کے زمانے کا کیا پوچھنا۔ زنانوں کی ٹولی میں جب پہلے پہل گایا ہے تو عاشق مزاجوں کے دلوں کا ستھراؤ کر دیا۔ دلّی کے ہیجڑا پرستوں کا اس کے کوٹھے پر رمنا لگ گیا۔ کہتے ہیں گپو کارخانہ دار کے بیٹھے سانولیا نے اسی پر افیم کھائی تھی۔ لال کنویں پر کئی دفعہ چاقو چلے تھے۔ ہیجڑوں کی وضع قطع، بولی ٹھولی تو دیکھی سنی ہوگی، کوئل کی رسیلی آنکھیں، چمکیلا رنگ، صاف ستھرا ناک نقشہ، پھر پھبن۔ اس بانکپن پہ کون نہ مرتا۔ اچھے اچھے ثقہ آنکھیں چرا چرا کر دیکھتے۔ صوفیوں کی دھویں میں بجلیاں چمکتی نظر آتیں۔ طور کا جلوہ دیکھتے۔ کنہا بن کر جس وقت وہ بانسری بجاتا، اس کی آواز پر ہزاروں برسوں کی بھٹکی ہوئی گوپیوں کی روحیں جمع ہو کر تھرکنے لگتیں۔

لیکن رہے نام سائیں کا۔ جوانی کا سایہ کیا اٹھا، روپ کیا ڈھلا کہ کوئل آندھی کا کوّا بن گئی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ چھجو شاہ ایک مجذوب فقیر نے اپنا کرشمہ دکھایا۔ یہ ان کے پاس اکثر جایا کرتا تھا۔ انھوں نے سر دھنتے دھنتے سونٹا زمین پر مار کر کہا، ''مانگ کیا مانگتا ہے؟ اس وقت چودہ طبق کھلے ہوئے ہیں۔ بول بادشاہ بنادوں یا اپنا بنا لوں؟'' انھیں یہ رٹ لگی ہوئی تھی اور کوئل حیران۔ جب چھجو شاہ کا جوش زیادہ بڑھا تو وہ سونٹا زمین پر مارتے مارتے کھڑے ہو گئے اور اس نے دیکھا کہ مجھے نہ پیٹنے لگیں تو دور بھاگ کر بولا، ''سائیں، نہ میں بادشاہ بننا چاہتا ہوں اور نہ تم جیسا۔ دعا کرو عمر بھر میاں کو رجھایا کروں۔ میاں ریجھ گئے تو بیڑا پار ہے۔''

اس روز کے بعد سے کوئل کی کایا پلٹ گئی۔ کیسا گانا بجانا، کہاں کا ناچنا تھرکنا، تالیاں پٹخارنا۔ کوئی ہفتہ بھر نہ گزرا ہوگا کہ کوٹھے پر سے بھی غائب، جتنے منھ اتنی باتیں۔ کوئی کہتا کسی کے ساتھ بھاگ گیا۔ کوئی کہتا بھاگنے کی رُت میں تو بھاگا نہیں۔ چھجو شاہ کو ہوا لگ گئی۔ دو ہفتے سے رنگ کچھ بدلا ہوا تھا۔ غرضیکہ یوں ہی تذکرے ہو ہو کر رہ گئے۔ شہروں میں ایسے بہتیرے واقعات

ہوتے ہیں۔کون ڈھنڈیا مچاتا ہے۔اس کے ساتھیوں کو البتہ صدمہ ہوا۔آخر وہ بھی بیٹھ رہے۔

پرانا قلعہ ان دنوں گوجروں کی بستی تھی اور سڑک کے دونوں طرف دلّی دروازے سے نظام الدین تک جنگل، نہ رات دن لاریاں موٹریں دوڑتی تھیں نہ تانگوں کا تانتا تھا۔کبھی کبھی اِکّے بہلیاں یا اونٹ گاڑیاں دکھائی جاتیں۔ پیدل جانے والے بھی صبح سے شام تک دس بیس ہی آتے جاتے نظر آتے۔ ہاں سترہویں کی عرس پر خوب چہل پہل ہو جاتی۔خوانچے والے خوانچے لیے، کھلونے والے اپنی اپنی چیزیں سروں پر رکھے، نانبائی، حلوائی، بھٹیارے اپنے اپنے ٹنڈیرے ٹھیلوں پر لادے چلے جا رہے ہیں۔ مجھولیاں، شکرمیں، پالکی گاڑیاں، یکّے بیلے سنورے گھڑ دوڑ لگا رہے ہیں۔تیس چالیس برس پہلے تک ہاندی شاہ کا مزار تو تھا مگر نہ یہ ہنڈوں کی نمائش تھی نہ چند اہل باطن کے سوا اس مزار پر کوئی فاتحہ پڑھتا، منتیں ماننا اور ہنڈیاں چڑھانا تو کیا؟ یہ جگہ تقریباً دلّی کے آدھوں آدھ رستے پر ہے۔ گرمی کے موسم میں مسافروں کو پانی کی بڑی تکلیف ہوتی۔ دھوپ کی شدت سے خاک کا اڑنا، خاص طور پر عرس کے دن لوگ کبھی کبھی پانی کے لیے پھڑک پھڑک جاتے۔کوئل نے شہر سے نکل یہیں کہیں کسی ٹوٹے پھوٹے مقبرے میں اپنا آشیانہ بنا لیا اور سڑک کے کنارے دو چار مٹکے رکھ کر سبیل لگا دی۔ بدلا ہوا روپ تھا۔ اول اول تو کسی نے پہچانا نہیں۔ آتے جاتے مسافر درختوں کے سائے میں بیٹھتے، منھ ہاتھ دھوتے، ٹھنڈے ہوتے، پانی پیتے، ستاتے اور اپنا راستہ لیتے۔سبیل لگانے والے کو کون پوچھتا۔ کسے اتنی پڑی تھی کہ اس کے حال کی کریدتا۔ڈر ہوتا کہ فقیر یا تکیے دار کچھ سوال نہ کر بیٹھے۔

پرانے قلعے کے شریر گوجروں کو اس سے بیر ہو گیا تھا، اس لیے کہ ان کی بٹ ماری میں فرق آ گیا۔سڑک پر ایک قسم کی چوکی لگ گئی تھی۔ بے چارے کے کبھی مٹکے پھوڑے جاتے، کبھی اس کے چبوترے پر لید گوبر ڈال دیتے۔ اپنے کنویں سے اس کا پانی بھرنا بند کر دیا۔غریب کو دور دور سے پانی لانا پڑتا۔ دن بھر مٹکوں کی چوکسی کرتا اور شام کو تھوڑی نیند لے کر پہلے پانی بھرتا، پھر اندھیری رات ہوتی تو اندھیرے میں، چاند نکلا ہوا ہوتا تو چاندنی میں اکیلا تالیاں بجا بجا کر خوب لہکتا، خوب مٹکتا اور صبح تک یہی سانگ رکھتا۔

اس کے چبوترے پر ایک دن عصر کے وقت دو چار نمازی مسافر بھی آ گئے اور انھوں نے اذان دے کر نماز پڑھی۔ کسی گوجر نے دیکھ لیا۔ اس نے جا اوروں سے کہہ دیا: ”ارے، اب تو ماہڑے پڑوس اَجان بھی ہونے لگی، نماج بھی لوگ باگ پڑھنے لگے، آج سورے کو مار گیرو۔“

آدھی رات کو دو چار مرد، دو چار عورتیں مل کر کوئل کے تکیے پر آئے تا کہ اس کا بکھیڑا صاف کر دیں۔ سڑک کے ابھی اس پار تھے کہ گانے کی آواز کانوں میں پڑی۔

ایک جاٹ: ارے یہ گائے کون ہے؟

دوسرا: واہ جی واہ، آواج بھنبیری ہے۔

ایک عورت: زنانوں کے گیت گائے ہے۔

پہلا جاٹ: تالیاں بھی ویسے ہی پیٹے ہے۔

دوسری عورت: ماہرا کیا بگاڑے ہے، کاہے کو ستاؤ ہو۔ آ جار ہے چھورے آ جا۔ جانے بھی دے۔

دوسرا: ہاں کا کا، غریب ہمارا کیا لے ہے۔ کہہ دیں گے کہ اَجان وجان، نماج و ماج نہ پڑھوائے اور ماہرے کسی کام میں نہ بولے۔

دوسری عورت: چل تو ابھی کہہ دے نا۔ پاس سے گانا بھی سن لیں گے۔

کوئل کی آنکھیں بند تھیں۔ ہاتھ مٹکا اور تالیاں پٹخار پٹخار کر مٹک رہا تھا۔ 'آ جا میرے سنولیا لوں تیری بلیّاں' کی دُھن بندھی ہوئی تھی۔ گوجر پہلے تو کھڑے تماشا دیکھتے رہے، پھر یکا یک انھیں ہنسی چھوٹی۔ گنواروں کا ہنسنا جیسے پہاڑی کے پتھر لڑھکے۔ کوئل کا دھیان بہکا اور وہ سہم کر لٹھ بند گنواروں کو دیکھنے لگا۔ دو منٹ بعد جب ذرا اوسان درست ہوئے تو بولا ''چودھری، آدھی رات کو کہاں سے آ رہے ہو؟''

گوجر: ارے تو گائے تو خوب ہے۔

کوئل: چودھری، میں نگوڑی گانا کیا جانوں، اپنے سنولیا کو رجھا رہی تھی۔

گوجر: ارے یہ تو زنانہ لگے ہے۔

کوئل: چودھری، میں نگوڑی گانا کیا جانوں، اپنے سنولیا کو رجھا رہی تھی۔

گوجر: ارے یہ تو زنانہ لگے ہے۔

عورت: جب ہی ایسا مٹکے تھا۔

گوجر: چلو رے گھروں کو چلو۔ رات بہت آئی۔ چھورے، اب نہ ستائیو اسے۔ گام (گاؤں) میں کہہ دیجیو کہ پانی بھرنے کو آئے تو کوئی نہ روکے۔

جان بچی لاکھوں پائے، مگر بستی میں سب جان گئے کہ تکیے والا زنانہ ہے۔ اب

سترہویں کا عرس آ گیا تھا، کوئل نے نئے کپڑے بنائے، کرتا سبز رنگا، گل انار دوپٹا، اس پر دھنک ٹانکی۔ چار مٹکے پہلے تھے، چار اور لایا۔ شاموں شام ان میں پانی بھرا۔ کپڑے بدلے، بال بکھیرے اور لہک لہک کر گانا شروع کیا۔ تھوڑی دیر میں دلّی والوں کی بھیڑ لگ گئی۔ زیادہ دنوں کی بات نہ تھی، اکثر نے پہچان لیا۔ آواز کسنے لگے۔ کوئی پھبتیاں اڑاا، کوئی گانے کی فرمائش کرتا،

''کوئل سنے ہوئے مدت ہوگی، 'خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں' سنادو۔''

''نہیں بھئی، 'میں اپنے مولا کی جوگن بنی' ہوجائے۔''

''ارے لنڈوری کو کیوں ستاتے ہو؟''

کوئل پہلے تو چپ بیٹھا رہا، پھر 'میں اپنے مولا کی جوگن بنی' گانے لگا۔ سماں بندھ گیا۔ رکشوں، اکّوں سے سڑک بھر گئی۔ اتنے میں ایک سیج گاڑی آئی۔ بھیڑ میں گھوڑے بدک گئے اور ایسے بدکے کہ قابو میں نہ آئے۔ سواریوں کو اترنا پڑا۔ رات کے کوئی آٹھ بجے ہوں گے۔ گاڑی میں ایک سفید لمبی داڑھی کے پیر صاحب تھے۔ مریدوں کی ٹولی ساتھ تھی۔

پیر صاحب: (مرید سے) یہاں لوگ اکٹھے ہیں؟

مرید: حضور کسی زنانے نے سبیل لگا رکھی ہے۔

پیر: لاحول ولاقوۃ۔ زنانہ!

مرید: کہتے ہیں یہاں کا پانی بڑا ٹھنڈا ہوتا ہے۔ نوش فرمائیں تو حاضر کروں؟

پیر: زنانے کا پانی پینا حرام ہے، مگر آؤ دیکھیں تو سہی، کم بخت گا بھی رہا ہے۔ (کوئل کی صورت دیکھ کر اور گانا سن کر) مردود ہے۔ شیطان نے کیا سوانگ بھرا ہے۔

کوئل: (پیر صاحب کی طرف دیکھ کر) میاں میں قربان، خفا کیوں ہوتے ہو۔ 'اپنے پیا کی جوگن بنی بروگن بنی۔'

پیر: مجسم شیطان ہے۔

کوئل: میاں، کوئل کی کوک سے ناراض نہ ہوں، میں اپنے میاں کو رجھا رہی ہوں۔

پیر: استغفراللہ، (مریدوں سے) شکرم کے گھوڑے ہو گئے؟

کوئل: میں صدقے، میں پانی لاؤں؟ کورے کورے سوندے سوندے مٹکوں کا پانی ہے۔ برف سے زیادہ ٹھنڈا۔

پیر صاحب نے نہایت غصے سے کوئل کو دیکھا۔

کوئل: میاں، اللہ کے نام کی سبیل ہے۔ لونڈی نے نہا دھو کر مٹکے بھرے ہیں اور کچھ نہیں تو منہ ہاتھ دھو لیجیے۔

یہ کہہ کر کوئل نے ایک کوری بدھنی بھری اور پیر صاحب کے پاس لے کر آیا۔ پیر صاحب کو طیش آ رہا تھا۔ جریب ہاتھ میں تھی۔ جریب سے جو ٹھوکا دیتے ہیں تو بدھنی کوئل کے ہاتھ سے چھوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔

پیر صاحب کا غصہ ذرا ٹھنڈا ہوا۔ کوئل کی مایوس شکل دیکھی تو کچھ ترس بھی شاید آ گیا۔ مگر زاہدانہ غرور کی شان بھی دکھانا چاہتے تھے۔ مریدوں سے جھلا کر کہنے لگے، ''عجب اتفاق ہے۔ پہلے ریل میں دیر لگی، اب شیطان نے رستہ روک لیا۔ ہماری زیارت کا بندھا ہوا وقت ہے۔ محبوب الٰہی کے دربار میں انتظار ہو گا۔ دیکھو بھئی، جلدی کرو، ایک روپیہ اس بدبخت کو بھی دے دو، اس کی بدھنی کا نقصان ہوا ہے۔''

کوئل: (مٹکتے ہوئے آگے بڑھ کر دور سے بلائیں لینے کے بعد) میں واری، یہ روپیہ میری طرف سے میاں پر نچھاور کر دینا۔

پیر صاحب: (غصے اور نفرت سے) دور ہو خبیث، مجھے بھی گنہگار کرتا ہے۔ نہ ہوا آج عالمگیر کا زمانہ، ابھی تھو تھے تیروں میں اڑوا دیا جاتا۔ ایک زنانہ گندگی کی پوٹ اور محبوب الٰہی کا نام۔

کوئل: (تھر تھر کانپ کر) حضور، میرا تو اس روپے کو ہاتھ تک نہیں لگا ہے۔ حضور ہی کی مایا ہے۔ میاں نے قبول نہ کیا تو خادموں کے کام آ جائے گا۔ میری کمائی کا تو نہیں۔

پیر صاحب کو نہ جانے کیا خیال آیا، خادم کے ہاتھ سے روپیہ لے کر اپنی جیب میں ڈال لیا۔ گھوڑے ٹھیک ہو گئے تھے۔ گاڑی کی طرف چلے۔

کوئل: (پکار کر) حضور، میاں سے کہنا کہ یہ کوئل زنانہ کی نذر ہے، اسے قبول کر لو۔ اور جب تک میاں کا ہاتھ لینے کو نہ نکلے، کسی کو دینا نہیں۔

پیر: پورا شیطان معلوم ہوتا ہے۔ مسخرے کی باتیں تو سنو۔ نعوذ باللہ۔

پیر صاحب مع مریدوں کے گاڑی میں بیٹھے۔ گاڑی روانہ ہو گئی۔

جنگل میں منگل تھا۔ درگاہ کے قریب سڑک سے اترتے ہی آدمیوں کی بھیڑ تھی۔ سودے والوں کا غل، دکانوں پر شامیانے تنے ہوئے، قصہ مختصر پیر صاحب گاڑی سے اترے۔ سامان

اتارا گیا۔ جو ملتا، پیر صاحب کے ہاتھ چومتا۔ آپ کی تمکنت، آپ کا تقدس، اللہ اللہ۔ نہایت تکلف کے ساتھ درگاہ شریف کے اندر داخل ہوئے۔ قوالی ہو رہی تھی۔ دو خادم آگئے، چار پیچھے، ہٹو بچو کرتے مزار مبارک کے حجرے میں پہنچے۔ اپنے طریق پر زیارت کی۔ فاتحہ پڑھی، چند منٹ مراقبے میں بیٹھے، اس کے بعد اٹھ کر باہر نکلنے ہی والے تھے کہ کوئل کا خیال آ گیا۔ پہلے تو اس گنہگار زندگی کا تصور کر کے ناک بھوں چڑھائی، پھر نہ جانے کس جذبے کے تحت جیب میں ہاتھ ڈالا، روپیہ نکالا اور تمسخرانہ لہجے میں آہستہ آہستہ کہ کوئی دوسرا نہ سن لے، اس کے الفاظ دہرائے تھے کہ حیرت کی انتہا نہ رہی۔ حجاب آنکھوں کے سامنے سے اٹھ گئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ مزار مقدس کو حرکت ہوئی، غلاف ہٹا اور اس میں سے ایک مرمریں ہاتھ باہر نکلا۔ ہاتھ کیا، چاند تھا۔ ساری شمعیں اس کے آگے ماند پڑ گئیں۔ مشک و عنبر کی لپٹوں سے تمام حجرہ معطر ہو گیا اور کانوں میں آواز آئی، ''ہماری کوئل کی نذر لاؤ۔''

پیر صاحب ششدر تھے۔ غرور و تمکنت سب غائب۔ ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ مٹھی خود بخود کھل گئی۔ روپیہ غائب ہو گیا، ہوش جاتے رہے۔ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ دیکھا، محبوب الٰہی کا دربار آراستہ ہے اور کوئل حضور کے سامنے بیٹھا 'اپنے پیا کی جوگن بنی' گا رہا ہے اور امیر خسرو داد دے رہے ہیں۔ آپ نے کچھ دیر کے بعد نظریں اٹھا کر پیر صاحب کی طرف دیکھا اور تیوری پر بل ڈال کر فرمایا، ''پیری سے میری نہیں ملتی۔ اپنی نسبتوں پر یہ غرور! 'خاک شو پیش ازاں کہ خاک شوی۔' یہ محبوب کا دربار ہے۔ عاشق بن کر آؤ۔ سگ لیلیٰ سے اس قدر نفرت!''

پیر صاحب کے جب ہوش ٹھکانے آئے تو ان کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔ پیری مریدی، عبادت و تقدس کا سارا طلسم ٹوٹ گیا تھا۔ رات بھر جالیوں سے لگے روتے اور تڑپتے رہے۔ بے تاب تھے کہ کسی طرح صبح ہو اور کوئل سے اپنی خطاؤں کی معافی مانگیں۔ خدا خدا کر کے رات گزری۔ غسل میں شریک ہوئے اور فوراً ہی چل پڑے۔ سورج ابھی پورا نکلا بھی نہ تھا کہ کوئل کی سبیل کے سامنے گاڑی رکوائی۔ کوئل حسب معمول جھاڑو بہار و دے، منہ ہاتھ دھو اپنے چبوترے پر بیٹھا گنگنا رہا تھا۔ پیر صاحب اپنے مریدوں کو گاڑی میں چھوڑ سیدھے کوئل کے سامنے پہنچے اور ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔

کوئل: (چونک کر) میں قربان، میاں کے لاڈلے آگئے، بڑے سویرے سویرے لوٹ آئے۔

پیرصاحب: (نیچی نگاہ کیے کیے) میاں کے لاڈلے تو تم ہو۔

کوئل: میں نگوڑی پاپن گندی، میاں کے دروازے کی کتیا۔

پیرصاحب: (آگے بڑھ کر کوئل کے قدموں کو چومنے کے ارادے سے) کوئل، اب تم مجھے کانٹوں میں نہ گھسیٹو۔ میں نے اپنی آنکھوں سے تمھارا مرتبہ دیکھ لیا۔

کوئل: (پیچھے ہٹتے ہوئے) واری جاؤں۔ میں تو ایک زنانہ ہوں۔ ساری عمر گناہوں میں گزری ہے۔ حرام کے لقمے کھائے ہیں۔ توبہ توبہ۔ آپ اور میرے پاؤں چھوئیں۔ دوزخ کا کندا نہ بنائیں۔ آپ کو میرے میاں نے سہاگن بنایا ہے۔ آپ ان کے پیارے ہیں۔ مجھے اپنے پیر چھونے دیجیے۔

پیرصاحب: (بھرائی ہوئی آواز میں) کوئل، عقیدت کا درجہ عبادت سے بہت اونچا ہے۔ یہ بھید آج کھل گیا۔ تقدس اور شرافت کے سارے کثیف و تاریک پردے اٹھ گئے۔ تم مجھے زنانے نہیں مردانوں کے دکھائی دے رہے ہو۔ آج میں سمجھا ہوں:

ذات پات پوچھے نہ کوئے
ہر کو بھجے سو ہر کا ہوئے

اور خدا کا پیار حاصل کرنے کا بھی جو ہم سمجھے ہیں وہ طریقہ نہیں۔ نہ جانے کیا ادا اسے بھا جائے۔ سچ تو یہ ہے کہ جسے پیا چاہے وہی سہاگن ہو کوئل تم۔ میاں کی زبان سے سن آیا ہوں۔

کوئل: (ایک عجب قسم کی مسرت کے ساتھ) میاں نے میرا نام لیا، سچ؟

پیرصاحب: ہاں کوئل، تمھارا نام۔

کوئل: میرا نام، ایک زنانے کا نام؟

پیرصاحب: تم ان کے سامنے بیٹھے لہک رہے تھے۔

کوئل: میں کتیا بھونک رہی تھی؟ اچھا کیا نام لیا تھا؟

پیرصاحب: سگ لیلیٰ۔

یہ سنتے ہی کوئل نے 'اپنے پیا کی جوگن بنی' کی ایک تان لگائی اور ہاتھوں کو اس طرح مٹکاتا ہوا جیسے کوئی سامنے ہو اور اس کی بلائیں لے رہا ہے، زمین پر گر گیا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور سر کے بالوں کی نقاب منھ پر۔ پیرصاحب نے بڑھ کر جو اٹھانا چاہا تو وہاں کیا رکھا تھا۔

اصلی جن

سعادت حسن منٹو

لکھنؤ کے پہلے دنوں کی یاد نواب نوازش علی، اللہ کو پیارے ہوئے تو ان کی اکلوتی لڑکی کی عمر زیادہ سے زیادہ آٹھ برس تھی۔ اکہرے جسم کی، بڑی دبلی پتلی، نازک، پتلے پتلے نقشوں والی، گڑیا سی۔ نام اس کا فرخندہ تھا۔

اس کو اپنے والد کی موت کا دکھ ہوا۔ مگر عمر ایسی تھی کہ بہت جلد بھول گئی۔ لیکن اس کو اپنے دکھ کا شدید احساس اس وقت ہوا جب اس کو میٹھا برس لگا اور اس کی ماں نے اس کا باہر آنا جانا قطعی طور پر بند کر دیا اور اس پر کڑے پردے کی پابندی عائد کر دی۔ اس کو اب ہر وقت گھر کی چار دیواری میں رہنا پڑتا۔ اس کا کوئی بھائی تھا نہ بہن۔ اکثر تنہائی میں روتی اور خدا سے یہ گلہ کرتی کہ اس نے بھائی سے اسے کیوں محروم رکھا اور پھر اس کا ابا میاں اس سے کیوں چھین لیا۔

ماں سے اس کو محبت تھی، مگر ہر وقت اس کے پاس بیٹھی وہ کوئی تسکین محسوس نہیں کرتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کوئی اور ہو جس کے وجود سے اس کی زندگی کی یک آہنگی دور ہو سکے۔ وہ ہر وقت اُکتائی اُکتائی سی رہتی۔ اب اس کو اٹھارواں برس لگ رہا تھا۔ سالگرہ میں دس بارہ روز باقی تھے کہ پڑوس کا مکان جو کچھ دیر سے خالی پڑا تھا، پنجابیوں کے ایک خاندان نے کرائے پر اٹھا لیا۔ ان کے آٹھ لڑکے تھے اور ایک لڑکی۔ آٹھ لڑکوں میں سے دو بیاہے جا چکے تھے۔ باقی اسکول اور کالج میں پڑھتے تھے۔ لڑکی ان چھیوں سے ایک برس بڑی تھی۔ بڑی تنومند، ہٹی کٹی، اپنی عمر سے دو اڑھائی برس زیادہ ہی دکھائی دیتی تھی۔ انٹرنس پاس کر چکی تھی، اس کے بعد اس کے والدین نے

یہ مناسب نہ سمجھا تھا کہ اسے مزید تعلیم دی جائے۔ معلوم نہیں کیوں؟

اس لڑکی کا نام نسیمہ تھا۔ لیکن اپنے نام کی رعایت سے وہ نرم و نازک اور سست رفتار نہیں تھی۔ اس میں بلا کی پھرتی اور گرمی تھی... فرخندہ کو اس مہین مہین مونچھوں والی لڑکی نے کوٹھے پر سے دیکھا، جب کہ وہ بے حد اکتا کر کوئی ناول پڑھنے کی کوشش کرنا چاہتی تھی۔

دونوں کوٹھے ساتھ ساتھ تھے... چنانچہ چند جملوں ہی میں دونوں متعارف ہو گئیں۔

فرخندہ کو اس کی شکل و صورت پہلی نظر میں قطعاً پر کشش معلوم نہ ہوئی لیکن جب اس سے تھوڑی دیر گفتگو ہوئی تو اسے اس کا ہر خد و خال پسند آیا۔ موٹے موٹے نقشوں والی تھی، جیسے کوئی جوان لڑکا جس کی مسیں بھیگ رہی ہیں۔ بڑی صحت مند، بھرے بھرے ہاتھ پاؤں، کشادہ سینہ مگر ابھاروں سے بہت حد تک خالی۔ فرخندہ کو اس کے بالائی لب پر مہین مہین بالوں کا غبار خاص طور پر بہت پسند آیا۔ چنانچہ ان میں فوراً دوستی ہو گئی۔

نسیمہ نے اس کے ہاتھ میں کتاب دیکھی تو پوچھا، ''یہ ناول کیسا ہے؟''

فرخندہ نے کہا، ''بڑا ذلیل قسم کا ہے... ایسے ہی مل گیا تھا۔ میں تنہائی سے گھبرا گئی تھی، سوچا کہ چند صفحے پڑھ لوں۔''

نسیمہ نے یہ ناول فرخندہ سے لیا، واقعی بڑا گھٹیا سا تھا۔ مگر اس نے رات کو بہت دیر جاگ کر پڑھا۔ صبح نوکر کے ہاتھ فرخندہ کو واپس بھیج دیا۔ وہ ابھی تک تنہائی محسوس کر رہی تھی اور کوئی کام نہیں تھا۔ اس لیے اس نے سوچا کہ چلو چند اوراق دیکھ لوں۔ کتاب کھولی تو اس میں سے ایک رقعہ نکلا جو اس کے نام تھا۔ یہ نسیمہ کا لکھا ہوا تھا۔

اسے پڑھتے ہوئے فرخندہ کے تن بدن میں کپکپیاں دوڑتی رہیں۔ فوراً کوٹھے پر گئی۔ نسیمہ نے اس سے کہا تھا کہ اگر وہ اسے بلانا چاہے تو اینٹ جو منڈیر سے اکھڑی ہوئی تھی زور زور سے کسی اور اینٹ کے ساتھ بجا دیا کرے۔ وہ فوراً آ جائے گی۔

فرخندہ نے اینٹ بجائی تو نسیمہ سچ مچ ایک منٹ میں کوٹھے پر آ گئی۔ شاید وہ اپنے رقعے کے جواب کا انتظار کر رہی تھی۔ آتے ہی وہ چار ساڑھے چار فٹ کی منڈیر پر مردانہ انداز میں چڑھی اور دوسری طرف کود کر فرخندہ سے لپٹ گئی اور چٹ سے اس کے ہونٹوں کا طول بوسہ لے لیا۔

فرخندہ بہت خوش ہوئی۔ دیر تک دونوں گھل مل کے باتیں کرتی رہیں۔ نسیمہ اب اسے اور زیادہ خوبصورت دکھائی دی۔ اس کی ہر ادا جو مردانہ طرز کی تھی، اسے بے حد پسند آئی اور وہیں

فیصلہ ہوگیا کہ وہ تادمِ آخر سہیلیاں بنی رہیں گی۔

سالگرہ کا دن آیا تو فرخندہ نے اپنی ماں سے اجازت طلب کی کہ وہ اپنی ہمسائی کو جو اس کی سہیلی بن چکی ہے بلا سکتی ہے۔ اس نے اپنے ٹھیٹ لکھنوی انداز میں کہا، ''کوئی مضائقہ نہیں، بلا لو... لیکن وہ مجھے پسند نہیں۔ میں نے دیکھا ہے لونڈوں کی طرح کدکڑے لگاتی رہتی ہے۔''

فرخندہ نے وکالت کی، ''نہیں امی جان... وہ تو بہت اچھی ہے۔ جب ملتی ہے بڑے اخلاق سے پیش آتی ہے۔''

نواب صاحب کی بیگم نے کہا، ''ہوگا، مگر بھئی مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں لڑکیوں کی کوئی نزاکت نہیں۔ لیکن تم اصرار کرتی ہو تو بلا لو۔ لیکن اس سے زیادہ ربط نہیں ہونا چاہیے۔''

فرخندہ اپنی ماں کے پاس تخت پر بیٹھ گئی اور اس کے ہاتھ سے سروتا لے کر چھالیاں کاٹنے لگی، ''لیکن امی جان! ہم دونوں تو قسم کھا چکی ہیں کہ ساری عمر سہیلیاں رہیں گی... انسان کو اپنے وعدے سے کبھی پھرنا نہیں چاہیے۔''

بیگم صاحبہ اصول کی پکی تھیں اس لیے انھوں نے کوئی اعتراض نہ کیا اور صرف یہ کہہ کر خاموش ہوگئیں، ''تم جانو... مجھے کچھ معلوم نہیں۔''

سالگرہ کے دن نسیمہ آئی۔ اس کی قمیص دھاری دار پوپلین کی تھی۔ چست پائجامہ جس میں سے اس کی مضبوط پنڈلیاں اپنی تمام مضبوطی دکھا رہی تھیں۔ فرخندہ کو وہ اس لباس میں بہت پیاری لگی۔ چنانچہ اس نے اپنی تمام نسوانی نزاکتوں کے ساتھ اس کا استقبال کیا اور اس سے چند ناز نخرے بھی کیے۔ مثال کے طور پر جب میز پر چائے آئی تو اس نے خود بنا کر نسیمہ کو پیش کی۔ اس نے کہا، ''میں نہیں پیتی'' تو فرخندہ رونے لگی۔ بسکٹ اپنے دانتوں سے توڑا تو اس کو مجبور کیا کہ وہ اس کا بقایا حصہ کھائے۔ سموسہ منھ میں رکھا تو اس سے کہا کہ وہ آدھا اس کے منھ کے ساتھ منھ لگا کر کھائے۔

ایک آدھ مرتبہ معمولی معمولی باتوں پر لڑائی ہوتے ہوتے رہ گئی، مگر فرخندہ خوش تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ نسیمہ ہر روز آئے۔ وہ اس سے چہل کرے اور ایسی نرم و نازک لڑائیاں ہوتی رہیں جن سے اس کی ٹھہرے پانی ایسی زندگی میں چند لہریں پیدا ہوتی رہیں۔ لہریں پیدا ہونا شروع ہوگئیں اور ان میں فرخندہ اور نسیمہ دونوں لہرانے لگیں۔ اب فرخندہ نے بھی اپنی امی سے اجازت لے کر نسیمہ کے گھر جانا شروع کر دیا۔ دونوں اس کمرے میں جو نسیمہ کا تھا دروازے بند کر کے گھنٹوں بیٹھی رہتیں۔ جانے کیا باتیں کرتی تھیں؟

ان کی محبت اتنی شدت اختیار کرگئی کہ فرخندہ جب کوئی چیز خریدتی تو نسیمہ کا ضرور خیال رکھتی۔ اس کی امی اس کے خلاف تھی۔

چونکہ اکلوتی تھی، اس لیے وہ اسے رنجیدہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ دولت کافی تھی اس لیے کیا فرق پڑتا تھا کہ ایک کے بجائے دو قمیصوں کے لیے کپڑا خرید لیا جائے۔ فرخندہ کی دس شلواروں کے لیے سفید ساٹن لی تو نسیمہ کے لیے پانچ شلواروں کے لیے لٹھا لے لیا جائے۔

نسیمہ کو ریشمی ملبوس پسند نہیں تھے۔ اس کو سوتی کپڑے پہننے کی عادت تھی۔ وہ فرخندہ سے یہ تمام چیزیں لیتی مگر شکریہ ادا کرنے کی ضرورت محسوس نہ کرتی، صرف مسکرا دیتی اور یہ تحفے تحائف وصول کر کے فرخندہ کو اپنی بانھوں کی مضبوط گرفت میں بھینچ لیتی اور اس سے کہتی، ''میرے ماں باپ غریب ہیں۔ اگر نہ ہوتے تو میں تمھارے خوبصورت بالوں میں ہر روز اپنے ہاتھوں سے سونے کی کنگھی کرتی، تمہاری سینڈلیں چاندی کی ہوتیں، تمہارے غسل کے لیے معطر پانی ہوتا، تمہاری بانھوں میں میری بانھیں ہوتیں اور ہم جنت کی تمام منزلیں طے کر کے دوزخ کے دہانے تک پہنچ جاتے۔''

معلوم نہیں وہ جنت سے جہنم تک کیوں پہنچنا چاہتی تھی۔ وہ جب بھی فردوس کا ذکر کرتی تو دوزخ کا ذکر ضرور آتا۔ فرخندہ کو شروع شروع میں تھوڑی سی حیرت اس کے متعلق ضرور ہوئی مگر بعد میں جب وہ نسیمہ سے گھل مل گئی تو اس نے محسوس کیا کہ ان دونوں میں کوئی زیادہ فرق نہیں۔ سردی سے نکل اگر آدمی گرمی میں جائے تو اسے ہر لحاظ سے راحت ملتی ہے اور فرخندہ کو یہ حاصل ہوتی تھی۔ ان کی دوستی دن بدن زیادہ استوار ہوتی گئی بلکہ یوں کہیے کہ بڑی شدت اختیار کر گئی جو نواب نوازش علی مرحوم کی بیگم کو بہت کھلتی تھی۔ بعض اوقات وہ یہ محسوس کرتی کہ نسیمہ اس کی موت ہے۔ لیکن یہ احساس اس کو باوقار معلوم نہ ہوتا۔

فرخندہ اب زیادہ تر نسیمہ ہی کے پاس رہتی۔ صبح اٹھ کر کوٹھے پر جاتی۔ نسیمہ اسے اٹھا کر منڈیر کے اس طرف لے جاتی اور دونوں کمرے میں بند گھنٹوں جانے کن باتوں میں مشغول رہتیں۔

فرخندہ کی دو سہیلیاں اور بھی تھیں، بڑی مردار قسم کی، یو پی کی رہنے والی تھیں، جسم چھچھڑا سا، دو پلی ٹوپیاں سی معلوم ہوتی تھیں۔ پھونک مارو تو اڑ جائیں۔

نسیمہ سے تعارف ہونے سے پہلے یہ دونوں اس کی جان و جگر تھیں مگر اب فرخندہ کو ان

سے کوئی لگاؤ نہیں رہا تھا۔ بلکہ چاہتی تھی کہ وہ نہ آیا کریں اس لیے کہ ان میں کوئی جان نہیں تھی۔ نسیمہ کے مقابلے میں وہ ننھی ننھی چوہیاں تھیں جو کترنا بھی نہیں جانتیں۔

ایک بار اسے مجبوراً اپنی ماں کے ساتھ کراچی جانا پڑا، وہ بھی فوری طور پر۔ نسیمہ گھر میں موجود نہیں تھی، اس کا فرخندہ کو بہت افسوس ہوا۔ چنانچہ کراچی پہنچتے ہی اس نے اس کو ایک طویل معذرت نامہ لکھا۔ اس سے پہلے وہ تار بھیج چکی تھی۔ اس نے خط میں سارے حالات درج کر دیے اور لکھا کہ تمھارے بغیر میری زندگی یہاں بے کیف ہے۔ کاش تم بھی میرے ساتھ آتیں۔

اس کی والدہ کو کراچی میں بہت کام تھے۔ مگر اس نے اسے کچھ بھی نہ کرنے دیا۔ دن میں کم از کم سو مرتبہ کہتی، ''میں اداس ہو گئی ہوں۔ یہ بھی کوئی شہروں میں شہر ہے۔ یہاں کا پانی پی کر میرا ہاضمہ خراب ہو گیا ہے... اپنا کام جلدی ختم کیجیے اور چلیے لاہور۔''

نواب نوازش علی کی بیگم نے سارے کام ادھورے چھوڑے اور واپس چلنے پر رضامند ہو گئی۔ مگر اب فرخندہ نے کہا، ''جانا ہے تو ذرا شاپنگ کر لیں... یہاں کپڑا اور دوسری چیزیں سستی اور اچھی ملتی ہیں۔''

شاپنگ ہوئی۔ فرخندہ نے اپنی سہیلی نسیمہ کے دس سلیکس کے لیے بہترین ڈیزائن کا کپڑا خریدا، واکنگ شو لیے، ایک گھڑی خریدی، جو نسیمہ کی چوڑی کلائی کے لیے مناسب و موزوں تھی... ماں خاموش رہی کہ وہ ناراض نہ ہو جائے۔

کراچی سے لاہور پہنچی تو سفر کی تکان کے باوجود فوراً نسیمہ سے ملی مگر اس کا منہ سوجا ہوا تھا۔ سخت ناراض تھی کہ وہ اس سے ملے بغیر چلی گئی۔ فرخندہ نے بڑی معافیاں مانگیں۔ ہر سطح سے اس کی دلجوئی کی مگر وہ راضی نہ ہوئی۔ اس پر فرخندہ نے زاروقطار رونا شروع کر دیا اور نسیمہ سے کہا کہ اگر وہ اسی طرح ناراض رہی تو وہ کچھ کھا کر مر جائے گی۔ اس کا فوری اثر ہوا اور نسیمہ نے اس کو اپنے مضبوط بازوؤں میں سمیٹ لیا اور اس کو چومنے پچکارنے لگی۔

دیر تک دونوں سہیلیاں کمرہ بند کر کے بیٹھی پیار محبت کی باتیں کرتی رہیں۔ اس دن کے بعد ان کی دوستی اور زیادہ مضبوط ہو گئی۔ مگر فرخندہ کی ماں نے محسوس کیا کہ اس کی اکلوتی بیٹی کی صحت دن بدن خراب ہو رہی ہے۔ چنانچہ اس نے اس کا گھر سے نکلنا بند کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرخندہ پر ہسٹیریا ایسے دورے پڑنے لگے۔

بیگم صاحبہ نے اپنی جان پہچان والی عورتوں سے مشورہ کیا تو انھوں نے یہ اندیشہ ظاہر کیا

کہ لڑکی کو آسیب ہو گیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں کوئی جن اس پر عاشق ہے جو اس کو نہیں چھوڑتا۔ چنانچہ فوراً ٹونے ٹوٹکے کیے گیے۔ جھاڑ پھونک کرنے والے بلائے گئے۔ تعویز گنڈے ہوئے مگر بے سود۔

فرخندہ کی حالت دن بدن غیر ہوتی گئی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ عارضہ کیا ہے۔ دن بدن دبلی ہورہی تھی۔ کبھی گھنٹوں خاموش رہتی۔ کبھی زور زور سے چلانا شروع کردیتی اور اپنی سہیلی نسیمہ کو یاد کرکے پہروں آنسو بہاتی۔ اس کی ماں جو زیادہ ضعیف الاعتقاد نہیں تھی، اپنی جان پہچان کی عورتوں کی اس بات پر یقین نہیں ہوا کہ لڑکی پر کوئی جن عاشق ہے۔ اس لیے کہ فرخندہ عشق و محبت کی بہت زیادہ باتیں کرتی تھی اور بڑے ٹھنڈے ٹھنڈے سانس بھرتی تھی۔

ایک مرتبہ پھر کوشش کی گئی۔ بڑی دور دور سے جھاڑنے والے بلائے گئے۔ دوا دارو بھی کیا مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ فرخندہ بار بار التجا کرتی کہ اس کی سہیلی نسیمہ کو بلایا جائے مگر اس کی ماں ٹالتی رہی۔

آخر ایک روز فرخندہ کی حالت بہت بگڑ گئی۔ گھر میں کوئی بھی نہیں تھا۔ اس کی والدہ جو کبھی باہر نہیں نکلی تھی برقعہ اوڑھ کر ایک ہمسائی کے ہاں گئی اور اس سے کہا کہ کچھ کرے۔ دونوں بھاگم بھاگ فرخندہ کے کمرے میں پہنچیں مگر وہ موجود نہیں تھی۔

نواب نوازش علی مرحوم کی بیگم نے چیخنا چلانا اور دیوانہ وار 'فرخندہ بیٹی، فرخندہ بیٹی' کہہ کر پکارنا شروع کردیا۔ سارا گھر چھان مارا مگر وہ نہ ملی، اس پر وہ اپنے بال نوچنے لگی۔ ہمسائی نے اس کے ہاتھ پکڑ لیے مگر وہ برابر واویلا کرتی رہی۔

فرخندہ نیم دیوانگی کے عالم میں اوپر کوٹھے پر کھڑی تھی۔ اس نے منڈیر کی اکھڑی ہوئی اینٹ اٹھائی اور زور زور سے اسے دوسری اینٹ کے ساتھ بجایا۔

کوئی نہ آیا۔

اس نے پھر اینٹ کو دوسری اینٹ کے ساتھ ٹکرایا۔ چند لمحات کے بعد ایک خوبصورت نوجوان جو نسیمہ کے چھ کنوارے بھائیوں میں سے سب سے بڑا تھا اور برساتی میں بیٹھا بی اے کے امتحان کی تیاری کررہا تھا، باہر نکلا۔ اس نے دیکھا منڈیر کے اس طرف ایک دبلی پتی نازک اندام لڑکی کھڑی ہے۔ بڑی پریشان حال، بال کھلے ہیں۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہیں، آنکھوں میں سیکڑوں زخمی امنگیں سمٹی ہیں۔ قریب آکر اس نے فرخندہ سے پوچھا، ''کسے بلارہی ہیں آپ؟''

فرخندہ نے اس نوجوان کو بڑے گہرے اور دلچسپ غور سے دیکھا، ''میں نسیمہ کو بلا رہی تھی۔''

نوجوان نے صرف اتنا کہا، ''اوہ چلو آؤ!'' اور یہ کہہ کر منڈیر کے اس طرف سے ہلکی پھلکی فرخندہ کو اٹھایا اور برساتی میں لے گیا جہاں وہ امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔ دوسرے دن جن غائب ہوگیا۔ فرخندہ بالکل ٹھیک تھی۔ اگلے مہینے اس کی شادی نسیمہ کے اس بھائی سے ہوگئی جس میں نسیمہ شریک نہ ہوئی۔

لحاف

عصمت چغتائی

جب میں جاڑوں میں لحاف اوڑھتی ہوں، تو پاس کی دیواروں پر اس کی پرچھائیں ہاتھی کی طرح جھومتی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور ایک دم سے میرا دماغ بیتی ہوئی دنیا کے پردوں میں دوڑنے بھاگنے لگتا ہے۔ نہ جانے کیا کچھ یاد آنے لگتا ہے۔

معاف کیجیے گا، میں آپ کو خود اپنے لحاف کا رومان انگیز ذکر بتانے نہیں جا رہی ہوں۔ نہ لحاف سے کسی قسم کا رومان جوڑا ہی جا سکتا ہے۔ میرے خیال میں کمبل کم آرام دہ سہی، مگر اس کی پرچھائیں اتنی بھیانک نہیں ہوتی جتنی جب لحاف کی پرچھائیں دیوار پر ڈگمگا رہی ہو۔

یہ تب کا ذکر ہے جب میں چھوٹی سی تھی اور دن بھر بھائیوں اور ان کے دوستوں کے ساتھ مار کٹائی میں گزار دیا کرتی تھی۔ کبھی کبھی مجھے خیال آتا کہ میں کم بخت اتنی لڑاکا کیوں ہوں۔ اس عمر میں جب کہ میری اور بہنیں عاشق جمع کر رہی تھیں میں اپنے پرائے ہر لڑکے اور لڑکی سے جوتم پیزار میں مشغول تھی۔

یہی وجہ تھی کہ اماں جب آگرہ جانے لگیں، تو ہفتے بھر کے لیے مجھے اپنی منھ بولی بہن کے پاس چھوڑ گئیں۔ ان کے یہاں اماں خوب جانتی تھی کہ چوہے کا بچہ بھی نہیں اور میں کسی سے لڑ بھڑ نہ سکوں گی۔ سزا تو خوب تھی! ہاں تو اماں مجھے بیگم جان کے پاس چھوڑ گئیں۔ وہی بیگم جان جن کا لحاف اب تک میرے ذہن میں گرم لوہے کے داغ کی طرح محفوظ ہے۔ یہ بیگم جان تھیں جن کے

غریب ماں باپ نے نواب صاحب کو اسی لیے داماد بنالیا کہ وہ پکی عمر کے تھے۔ مگر تھے نہایت نیک۔ کوئی رنڈی، بازاری عورت ان کے یہاں نظر نہیں آئی۔ خود حاجی تھے اور بہتوں کو حج کرا چکے تھے۔ مگر انھیں ایک عجیب وغریب شوق تھا۔ لوگوں کو کبوتر پالنے کا شوق ہوتا ہے، بٹیرے لڑاتے ہیں، مرغ بازی کرتے ہیں۔ اس قسم کے واہیات کھیلوں سے نواب صاحب کو نفرت تھی۔ ان کے یہاں تو بس طالب علم رہتے تھے۔ نوجوان گورے گورے پتلی کمروں کے لڑکے جن کا خرچ وہ خود برداشت کرتے تھے۔

مگر بیگم جان سے شادی کر کے تو وہ انھیں کُل ساز وسامان کے ساتھ ہی گھر میں رکھ کر بھول گیے اور وہ بے چاری دبلی پتلی نازک سی بیگم تنہائی کے غم میں گھلنے لگی۔

نہ جانے ان کی زندگی کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ وہاں سے جب وہ پیدا ہونے کی غلطی کر چکی تھی، یا وہاں سے جب وہ ایک نواب بیگم بن کر آئیں اور چھپر کھٹ پر زندگی گزارنے لگیں۔ یا جب سے نواب صاحب کے یہاں لڑکوں کا زور بندھا۔ ان کے لیے مرغن حلوے اور لذیذ کھانے جانے لگے اور بیگم جان دیوان خانے کے دراڑوں میں سے لچکتی کمروں والے لڑکوں کی چست پنڈلیاں اور معطر باریک شبنم کے کرتے دیکھ دیکھ کر انگاروں پر لوٹنے لگیں۔

یا جب سے، جب وہ منتوں مرادوں سے ہار گئیں، چلے بندھے اور ٹوٹکے اور راتوں کی وظیفہ خوانی بھی چت ہو گئی۔ کہیں پتھر میں جونک لگتی ہے؟ نواب صاحب اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئے۔ پھر بیگم جان کا دل ٹوٹ گیا اور وہ علم کی طرف متوجہ ہوئیں لیکن یہاں بھی انھیں کچھ نہ ملا۔ عشقیہ ناول اور جذباتی اشعار پڑھ کر اور بھی پستی چھا گئی۔ رات کی نیند بھی ہاتھ سے گئی اور بیگم جان جی جان چھوڑ کر بالکل ہی یاس وحسرت کی پوٹ بن گئیں۔

چولھے میں ڈالا ایسا کپڑا لتا۔ کپڑا پہنا جاتا ہے کسی پر رعب گانٹھنے کے لیے۔ اب نہ تو نواب صاحب کو فرصت کہ شبنمی کرتوں کو چھوڑ کر ذرا ادھر توجہ کریں اور نہ وہ انھیں آنے جانے دیتے۔ جب سے بیگم جان بیاہ کر آئی تھیں رشتہ دار آ کر مہینوں رہتے اور چلے جاتے مگر وہ بے چاری قید کی قید رہتیں۔

ان رشتہ داروں کو دیکھ کر اور بھی ان کا خون جلتا تھا کہ سب کے سب مزے سے مال اڑانے، عمدہ گھی نگلنے، جاڑوں کا ساز وسامان بنوانے آن مرتے اور وہ باوجود نئی روئی کے لحاف

کے بڑی سردی میں اکڑا کرتیں۔ ہر کروٹ پر لحاف نئی نئی صورتیں بنا کر دیوار پر سایہ ڈالتا مگر کوئی بھی سایہ ایسا نہ تھا جو انھیں زندہ رکھنے کے لیے کافی ہو۔ مگر کیوں جیے پھر کوئی؟ زندگی! بیگم جان کی زندگی جو تھی، جینا بدا تھا نصیبوں میں، وہ پھر جینے لگیں اور خوب جئیں!

ربو نے انھیں نیچے گرتے گرتے سنبھال لیا۔ چپ پٹ دیکھتے دیکھتے ان کا سوکھا جسم ہرا ہونا شروع ہوا۔ گال چمک اٹھے اور حسن پھوٹ نکلا۔ ایک عجیب وغریب تیل کی مالش سے بیگم جان میں زندگی کی جھلک آئی۔ معاف کیجیے گا، اس تیل کا نسخہ آپ کو بہترین سے بہترین رسالہ میں بھی نہ ملے گا۔

جب میں نے بیگم جان کو دیکھا تو وہ چالیس بیالیس کی ہوں گی۔ افوہ کس شان سے وہ مسند پر نیم دراز تھیں اور ربو ان کی پیٹھ سے لگی بیٹھی کمر دبا رہی تھی۔ ایک اودے رنگ کا دوشالہ ان کے پیروں پر پڑا تھا اور وہ مہارانی کی طرح شاندار معلوم ہو رہی تھیں۔ مجھے ان کی شکل بے انتہا پسند تھی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ گھنٹوں بالکل پاس سے ان کی صورت دیکھا کروں۔ ان کی رنگت بالکل سفید تھی۔ نام کو سرخی کا ذکر نہیں اور بال سیاہ اور تیل میں ڈوبے رہتے تھے۔ میں نے آج تک ان کی مانگ ہی بگڑی نہ دیکھی۔ مجال ہے جو ایک بال ادھر اُدھر ہو جائے۔ ان کی آنکھیں کالی تھیں اور ابرو پر کے زائد بال علیحدہ کر دینے سے کمانیں سی کھچی رہتی تھیں۔ آنکھیں ذرا تنی ہوئی رہتی تھیں۔ بھاری بھاری پھولے ہوئے پپوٹے، موٹی موٹی آنکھیں۔ سب سے زیادہ جوان کے چہرے پر حیرت انگیز جاذب نظر چیز تھی، وہ ان کے ہونٹ تھے۔ عموماً وہ سرخی سے رنگے رہتے تھے۔ اوپر کے ہونٹوں پر ہلکی ہلکی مونچھیں سی تھیں اور کنپٹیوں پر لمبے لمبے بال۔ کبھی کبھی ان کا چہرہ دیکھتے دیکھتے عجیب سا لگنے لگتا تھا۔ کم عمر لڑکوں جیسا!

ان کے جسم کی جلد بھی سفید اور چکنی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کسی نے کس کر ٹانکے لگا دیے ہوں۔ عموماً وہ اپنی پنڈلیاں کھجانے کے لیے کھولتیں، تو میں چپکے چپکے ان کی چمک دیکھا کرتی۔ ان کا قد بہت لمبا تھا اور پھر گوشت ہونے کی وجہ سے وہ بہت ہی لمبی چوڑی معلوم ہوتی تھیں لیکن بہت متناسب اور ڈھلا ہوا جسم تھا۔ بڑے بڑے چکنے اور سفید ہاتھ اور سڈول کمر، تو ربو ان کی پیٹھ کھجایا کرتی تھی۔ یعنی گھنٹوں ان کی پیٹھ کھجاتی۔ پیٹھ کھجوانا بھی زندگی کی ضروریات میں سے تھا بلکہ شاید ضرورت زندگی سے بھی زیادہ۔

ربو کو گھر کا اور کوئی کام نہ تھا۔ بس وہ سارے وقت ان کے چھپر کھٹ پر چڑھی کبھی پیر،

کبھی سر اور کبھی جسم کے دوسرے حصے کو دبایا کرتی تھی۔ کبھی تو میرا دل بول اٹھتا تھا جب دیکھو ربو کچھ نہ کچھ دبا رہی ہے یا مالش کر رہی ہے۔ کوئی دوسرا ہوتا تو نہ جانے کیا ہوتا۔ میں اپنا کہتی ہوں، کوئی اتنا چھوئے بھی تو میرا جسم سڑ گل کے ختم ہو جائے۔

اور پھر یہ روز روز کی مالش کافی نہیں تھی۔ جس روز بیگم جان نہاتیں۔ یا اللہ بس دو گھنٹہ پہلے سے تیل اور خوشبودار ابٹنوں کی مالش شروع ہو جاتی اور اتنی ہوتی کہ میرا تو تخیل سے ہی دل ٹوٹ جاتا۔ کمرے کے دروازے بند کر کے انگیٹھیاں سلگتیں اور چلتا مالش کا دور اور عموماً صرف ربو ہی رہتی۔ باقی کی نوکرانیاں بڑبڑاتیں دروازے پر سے ہی ضرورت کی چیزیں دیتی جاتیں۔

بات یہ بھی تھی کہ بیگم جان کو کھجلی کا مرض تھا۔ بے چاری کو ایسی کھجلی ہوتی تھی کہ ہزاروں تیل اور اُبٹن ملے جاتے تھے مگر کھجلی تھی کہ قائم۔ ڈاکٹر حکیم کہتے ''کچھ بھی نہیں، جسم صاف چٹ پڑا ہے۔ ہاں کوئی جلد کے اندر بیماری ہو تو خیر''۔ ''نہیں بھئی یہ ڈاکٹر تو موئے ہیں پاگل۔ کوئی آپ کے دشمنوں کو مرض ہے؟ اللہ رکھے خون میں گرمی ہے۔'' ربو مسکرا کر کہتی اور مہین مہین نظروں سے بیگم جان کو گھورتی۔ اوہ یہ ربو!... جتنی یہ بیگم جان گوری تھیں اتنی ہی یہ کالی تھی۔ جتنی یہ بیگم جان سفید تھیں، اتنی ہی یہ سرخ۔ بس جیسے تپا ہوا لوہا۔ ہلکے ہلکے چیچک کے داغ۔ گٹھا ہوا ٹھوس جسم۔ پھرتیلے چھوٹے چھوٹے ہاتھ، کسی ہوئی چھوٹی سی توند۔ بڑے بڑے پھولے ہوئے ہونٹ، جو ہمیشہ نمی میں ڈوبے رہتے اور جسم میں سے عجیب گھبرانے والی بو کے شرارے نکلتے رہتے تھے۔ اور یہ ننھے ننھے پھولے ہوئے ہاتھ کس قدر پھرتیلے تھے، ابھی کمر پر، تو وہ لیجیے پھسل کر گئے کولھوں پر۔ وہاں سے رپٹے رانوں پر اور پھر دوڑے ٹخنوں کی طرف۔ میں تو جب کبھی بیگم جان کے پاس بیٹھتی یہی دیکھتی کہ اب اس کے ہاتھ کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔

گرمی جاڑے بیگم جان حیدرآبادی جالی کار گے کے کرتے پہنتیں۔ گہرے رنگ کے پاجامے اور سفید جھاگ سے کرتے اور پنکھا بھی چلتا ہو، پھر بھی وہ ہلکی دلائی ضرور جسم پر ڈھکے رہتی تھیں۔ انھیں جاڑا بہت پسند تھا۔ جاڑے میں مجھے ان کے یہاں اچھا معلوم ہوتا۔ وہ ہلتی جلتی بہت کم تھیں۔ قالین پر لیٹی ہیں۔ پیٹھ کھج رہی ہے۔ خشک میوے چبا رہی ہیں اور بس۔ ربو سے دوسری ساری نوکرانیاں خار کھاتی تھیں۔ چڑیل بیگم جان کے ساتھ کھاتی، ساتھ اُٹھتی بیٹھتی اور ماشااللہ ساتھ ہی سوتی تھی۔ ربو اور بیگم جان عام جلسوں اور مجموعوں کی دلچسپ گفتگو کا موضوع تھیں۔ جہاں ان دونوں کا ذکر آیا اور قہقہے اٹھے۔ لوگ نہ جانے کیا کیا چٹکلے غریب پر اڑاتے۔ مگر

وہ دنیا میں کسی سے ملتی ہی نہ تھیں۔ وہاں تو بس وہ تھیں اور ان کی کھجلی۔

میں نے کہا کہ ’’اس وقت میں کافی چھوٹی تھی اور بیگم جان پر فدا۔ وہ مجھے بہت ہی پیار کرتی تھیں۔ اتفاق سے اماں آگرے گئیں۔ انھیں معلوم تھا کہ اکیلے گھر میں بھائیوں سے مار کٹائی ہوگی۔ ماری ماری پھروں گی۔ اس لیے وہ ہفتے بھر کے لیے بیگم جان کے پاس چھوڑ گئیں۔ میں بھی خوش اور بیگم جان بھی خوش۔ آخر کو اماں کی بھابھی بنی ہوئی تھیں۔

سوال یہ اٹھا کہ میں سوؤں کہاں؟ قدرتی طور پر بیگم جان کے کمرے میں۔ لہٰذا میرے لیے بھی ان کے چھپر کھٹ سے لگا کر چھوٹی سی پلنگڑی ڈال دی گئی۔ دس گیارہ بجے تک باتیں کرتے رہے، میں اور بیگم جان تاش کھیلتے رہے اور پھر میں سونے کے لیے اپنے پلنگ پر چلی گئی اور جب میں سوئی تو ربو ویسی ہی بیٹھی ان کی پیٹھ کھجا رہی تھی۔ ’’بھنگن کہیں کی...‘‘ میں نے سوچا۔ رات کو میری ایک دم سے آنکھ کھلی تو مجھے عجیب طرح کا ڈر لگنے لگا۔ کمرہ میں گھپ اندھیرا اور اس اندھیرے میں بیگم جان کا لحاف ایسے ہل رہا تھا جیسے اس میں ہاتھی بند ہو۔ ’’بیگم جان...‘‘ میں نے ڈری ہوئی آواز نکالی، ہاتھی ہلنا بند ہو گیا۔ لحاف نیچے دب گیا۔

’’کیا ہے، سو رہو۔‘‘ بیگم جان نے کہیں سے آواز دی۔

’’ڈر لگ رہا ہے۔‘‘ میں نے چوہے کی سی آواز سے کہا۔

’’سو جاؤ۔ ڈر کی کیا بات ہے۔ آیت الکرسی پڑھ لو۔‘‘

’’اچھا...‘‘ میں نے جلدی جلدی آیت الکرسی پڑھی مگر ’یَعْلَمُ مَا بَیْنَ‘ پر دفعتاً آ کر اٹک گئی۔ حالاں کہ مجھے اس وقت پوری یاد تھی۔

’’تمھارے پاس آجاؤں بیگم جان۔‘‘

’’نہیں بیٹی سو رہو۔‘‘ ذرا سختی سے کہا۔ اور پھر دو آدمیوں کے کھسر پھسر کرنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ ہائے رے یہ دوسرا کون، میں اور بھی ڈری۔

’’بیگم جان... چور تو نہیں۔‘‘

’’سو جاؤ بیٹا کیسا چور۔‘‘ ربو کی آواز آئی۔ میں جلدی سے لحاف میں منھ ڈال کر سو گئی۔

صبح میرے ذہن میں رات کے خوفناک نظارے کا خیال بھی نہ رہا۔ میں ہمیشہ کی وہمی ہوں۔ رات کو ڈرنا، اٹھ اٹھ کر بھاگنا اور بڑبڑانا تو بچپن میں روز ہی ہوتا تھا۔ سب تو کہتے تھے کہ مجھ پر بھوتوں کا سایہ ہو گیا ہے۔ لہٰذا مجھے خیال بھی نہ رہا۔ صبح کو لحاف بالکل معصوم نظر آ رہا تھا مگر

دوسری رات میری آنکھ کھلی تو ربو اور بیگم جان میں کچھ جھگڑا بڑی خاموشی سے چھپر کھٹ پر ہی طے ہو رہا تھا اور مجھے خاک سمجھ نہ آیا، اور کیا فیصلہ ہوا۔ ربو ہچکیاں لے کر روئی۔ پھر بلی کی طرح سپڑ سپڑ رکابی چاٹنے جیسی آوازیں آنے لگیں... اونھ میں تو گھبرا کر سوگئی...

آج ربو اپنے بیٹے سے ملنے گئی ہوئی تھی۔ وہ بڑا جھگڑالو تھا۔ بہت کچھ بیگم جان نے کیا۔ اسے دکان کرائی، گاؤں میں لگایا مگر وہ کسی طرح مانتا ہی نہ تھا۔ نواب صاحب کے یہاں کچھ دن رہا۔ خوب جوڑے بھاگے بھی بنے۔ پر نہ جانے کیوں ایسا بھاگا کہ ربو سے ملنے بھی نہ آتا۔ لہٰذا ربو ہی اپنے کسی رشتہ دار کے یہاں اس سے ملنے گئی تھی۔ بیگم جان نہ جانے دیتی مگر ربو بھی مجبور ہو گئی۔

سارا دان بیگم جان پریشان رہیں۔ اس کا جوڑ جوڑ ٹوٹتا رہا۔ کسی کا چھونا بھی انھیں نہ بھاتا تھا۔ انھوں نے کھانا بھی نہ کھایا اور سارا دن اداس پڑی رہیں۔

''میں کھجا دوں بیگم جان...'' میں نے بڑے شوق سے تاش کے پتے بانٹتے ہوئے کہا۔ بیگم جان مجھے غور سے دیکھنے لگیں۔

''میں کھجا دوں... سچ کہتی ہوں...'' میں نے تاش رکھ دیے۔

میں تھوڑی دیر کھجاتی رہی اور بیگم جان چپکی لیٹی رہیں۔ دوسرے دن ربو کو آنا تھا مگر وہ آج بھی غائب تھی۔ بیگم جان کا مزاج چڑچڑا ہوتا گیا۔ چائے پی پی کر انھوں نے سر میں درد کر لیا۔

میں پھر کھجانے لگی ان کی پیٹھ... چکنی میز کی تختی جیسی پیٹھ... میں ہولے ہولے کھجاتی رہی۔ ان کا کام کر کے کیسی خوشی ہوئی تھی۔

''ذرا زور سے کھجاؤ... بند کھول دو...'' بیگم جان بولیں۔

ادھر... اے ہے ذرا شانے سے نیچے... ہاں... واہ بھئی واہ... ہا... ہا...

وہ سرور میں ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں لے کر اطمینان کا اظہار کرنے لگیں۔

''اور ادھر...'' حالاں کہ بیگم جان کا ہاتھ خوب جا سکتا تھا مگر وہ مجھ سے ہی کھجوا رہی تھیں اور مجھے الٹا فخر ہو رہا تھا ''یہاں... اوئی... تم تو گدگدی کرتی ہو... واہ...'' وہ ہنسیں۔ میں باتیں بھی کر رہی تھی اور کھجا بھی رہی تھی۔

''تمھیں کل بازار بھیجوں گی... کیا لوگی... وہی سوتی جاگتی گڑیا۔''

''نہیں بیگم جان... میں تو گڑیا نہیں لیتی... کیا بچہ ہوں اب میں؟''

''بچہ نہیں تو کیا بوڑھی ہو گئی۔'' وہ ہنسیں ''گڑیا نہیں تو ببوا لینا... کپڑے پہنانا خود...

میں دوں گی تمھیں بہت سے کپڑے... سنا؟'' انھوں نے کروٹ لی۔

''اچھا!'' میں نے جواب دیا۔

''ادھر... '' انھوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر جہاں کھجلی ہورہی تھی، رکھ دیا۔ جہاں انھیں کھجلی معلوم ہوتی وہاں میرا ہاتھ رکھ دیتیں اور میں بے خیالی میں بوئے کے دھیان میں ڈوبی مشین کی طرح کھجاتی رہی اور وہ متواتر باتیں کرتی رہیں۔

''سنوتو... تمھاری فراکیں کم ہوگئی ہیں۔ کل درزی کو دے دوں گی کہ نئی سی لائے۔ تمھاری اماں کپڑے دے گئی ہیں۔''

''وہ لال کپڑے کی نہیں بنواؤں گی، چماروں جیسا ہے... '' میں بکواس کر رہی تھی اور میرا ہاتھ نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچا۔ باتوں باتوں میں مجھے معلوم بھی نہ ہوا۔ بیگم جان تو چت لیٹی تھی... ارے... میں نے جلدی سے ہاتھ کھینچ لیا...

''اوئی لڑکی... دیکھ کر نہیں کھجاتی... میری پسلیاں نوچے ڈالتی ہے... '' بیگم جان شرارت سے مسکرائیں اور میں جھینپ گئی۔

''ادھر آ کر میرے پاس لیٹ جا... '' انھوں نے مجھے بازو پر سر رکھ کر لٹا لیا۔

''اے ہے کتنی سوکھ رہی ہے... پسلیاں نکل رہی ہیں۔'' انھوں نے پسلیاں گننا شروع کر دیں۔

''اوں... '' میں منمنائی۔

''اوئی... تو کیا میں کھا جاؤں گی... کیسا تنگ سویٹر بُنا ہے!''

''گرم بنیان بھی نہیں پہنا تم نے۔'' میں کلبلانے لگی۔

''کتنی پسلیاں ہوتی ہیں؟'' انھوں نے بات بدلی۔

''ایک طرف نو اور ایک طرف دس۔'' میں نے اسکول میں یاد کی ہوئی ہائی جین کی مدد لی۔ وہ بھی اوٹ پٹانگ۔

''ہٹا تو ہاتھ... ہاں، ایک... دو... تین...''

میرا دل چاہا کسی طرح بھاگوں اور انھوں نے زور سے بھینچا۔

''اوں... '' میں مچل گئی... بیگم جان زور زور سے ہنسنے لگیں۔ اب بھی جب کبھی میں ان کا اس وقت کا چہرہ یاد کرتی ہوں تو دل گھبرانے لگتا ہے۔ ان کی آنکھوں کے پپوٹے اور وزنی ہو

گئے۔ اوپر کے ہونٹ پر سیاہی گھری ہوئی تھی۔ باوجود سردی کے پسینے کی ننھی ننھی بوندیں ہونٹوں پر اور ناک پر چمک رہی تھیں۔ ان کے ہاتھ ٹھنڈے یخ تھے۔ مگر نرم نرم جیسے ان پر کی کھال اتر گئی ہو۔ انھوں نے شال اتار دی اور کارگے کے مہین کرتے میں ان کا جسم آٹے کی لوئی کی طرح چمک رہا تھا۔ بھاری جڑاؤ سونے کے بٹن گریبان کی ایک طرف جھول رہے تھے۔ شام ہوگئی تھی اور کمرے میں اندھیرا گھپ ہو رہا تھا۔ مجھے ایک نامعلوم ڈر سے وحشت سی ہونے لگی۔ بیگم جان کی گہری گہری آنکھیں۔ میں رونے لگی... دل میں۔ وہ مجھے ایک مٹی کے کھلونے کی طرح بھینچ رہی تھیں۔ ان کے گرم گرم جسم سے میرا دل بولانے لگا۔ مگر ان پر تو جیسے بھتنا سوار تھا اور میرے دماغ کا یہ حال کہ نہ چیخا جائے اور نہ رو سکوں۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ پست ہو کر نڈھال لیٹ گئیں۔ ان کا چہرہ پھیکا اور بدرونق ہو گیا اور لمبی لمبی سانسیں لینے لگیں۔ میں سمجھی کہ اب مریں یہ اور وہاں سے اٹھ کر سرپٹ بھاگی باہر...

شکر ہے کہ ربو رات کو آ گئی اور میں ڈری ہوئی جلدی سے لحاف اوڑھ کر سو گئی مگر نیند کہاں۔ چپ گھنٹوں پڑی رہی۔

اماں کسی طرح آ ہی نہیں چکی تھیں۔ بیگم جان سے مجھے ایسا ڈر لگتا تھا کہ میں سارا دن ماماؤں کے پاس بیٹھی رہی مگر ان کے کمرے میں قدم رکھتے ہی دم نکلتا تھا۔ اور کہتی کس سے اور کہتی ہی کیا کہ بیگم جان سے ڈر لگتا ہے۔ بیگم جان جو میرے اوپر جان چھڑکتی تھیں۔

آج ربو میں اور بیگم جان میں پھر اَن بن ہو گئی۔ میری قسمت کی خرابی کہیے یا کچھ اور مجھے ان دونوں کی اَن بن سے ڈر لگا کیوں کہ فوراً ہی بیگم جان کو خیال آیا کہ میں باہر سردی میں گھوم رہی ہوں اور مروں گی نمونیے میں۔

''لڑکی کیا میرا سر منڈوائے گی۔ جو کچھ ہو ہوا گیا تو اور آفت آئے گی۔'' انھوں نے مجھے پاس بٹھا لیا۔ وہ خود منہ ہاتھ سلفچی میں دھو رہی تھیں، چائے تپائی پر رکھی تھی۔

''چائے تو بناؤ... ایک پیالی مجھے بھی دینا...'' وہ تولیے سے منہ خشک کر کے بولیں ''ذرا کپڑے بدل لوں۔''

وہ کپڑے بدلتی رہیں اور میں چائے پیتی رہی۔ بیگم جان نائن سے پیٹھ ملواتے وقت اگر مجھے کسی کام سے بلواتیں، تو میں گردن موڑے موڑے جاتی اور واپس بھاگ آتی۔ اب جو انھوں نے کپڑے بدلے، تو میرا دل اُلٹنے لگا۔ منہ موڑے میں چائے پیتی رہی۔

''ہائے اماں...'' میرے دل نے بے کسی سے پکارا، ''آخر ایسا میں بھائیوں سے کیا لڑتی ہوں جو تم میری مصیبت...'' اماں کو ہمیشہ سے میرا لڑکوں کے ساتھ کھیلنا ناپسند ہے۔ کہو بھلا لڑکے کیا شیر چیتے ہیں جو نگل جائیں گے ان کی لاڈلی کو۔ اور لڑکے بھی کون؟ خود بھائی اور دو چار سڑے سڑائے ذرا ذرا سے ان کے دوست۔ مگر نہیں، وہ تو عورت ذات کو سات تالوں میں رکھنے کی قائل اور یہاں بیگم جان کی وہ دہشت کہ دنیا بھر کے غنڈوں سے نہیں۔ بس چلتا، تو اس وقت سڑک پر بھاگ جاتی، پر وہاں نہ ٹکتی۔ مگر لاچار تھی۔ مجبوراً کلیجہ پر پتھر رکھے بیٹھی رہی۔

کپڑے بدل کر سولہ سنگھار ہوئے۔ اور گرم گرم خوشبوؤں کے عطر نے اور بھی انھیں انگارا بنا دیا اور وہ چلیں مجھ پر لاڈ اتارنے۔

''گھر جاؤں گی...'' میں نے ان کی ہر رائے کے جواب میں کہا اور رونے لگی۔

''میرے پاس تو آؤ... میں تمھیں بازار لے چلوں گی... سنو تو...''

مگر میں کلی کی طرح پھسل گئی۔ سارے کھلونے، مٹھائیاں ایک طرف اور گھر جانے کی رٹ ایک طرف۔

''وہاں بھیا ماریں گے... چڑیل۔'' انھوں نے پیار سے مجھے تھپڑ لگایا۔

''پڑیں ماریں... میں نے سوچا اور روٹھی اکڑی بیٹھی رہی۔

''کچی امیاں کھٹی ہوتی ہیں بیگم جان...'' جلی کٹی ربو نے رائے دی اور پھر اس کے بعد بیگم جان کو دورہ پڑ گیا۔ سونے کا ہار جو وہ تھوڑی دیر پہلے مجھے پہنا رہی تھیں، ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ مہین جالی کا دوپٹہ تار تار اور وہ مانگ جو میں نے کبھی بگڑی نہ دیکھی تھی، جھاڑ جھنکاڑ ہو گئی۔

''اوہ... اوہ... اوہ... اوہ...'' وہ جھٹکے لے لے کر چلانے لگیں۔ میں رپٹی باہر۔

بڑے جتنوں سے بیگم جان کو ہوش آیا۔ جب میں سونے کے لیے کمرے میں دبے پیر جا کر جھانکی، تو ربو ان کی کمر سے لگی جسم دبا رہی تھی۔

''جوتی اتار دو۔'' اس نے ان کی پسلیاں کھجاتے ہوئے کہا اور میں چوہیا کی طرح لحاف میں دبک گئی۔

سر سر پھٹ کچ... بیگم جان کا لحاف اندھیرے میں پھر ہاتھی کی طرح جھوم رہا تھا۔

''اللہ! آں...'' میں نے مری ہوئی آواز نکالی۔ لحاف میں ہاتھی پھدکا اور بیٹھ گیا۔ میں بھی چپ ہو گئی۔ ہاتھی نے پھر لوٹ مچائی۔ میرا رواں رواں کانپا۔ آج میں نے دل میں ٹھان لیا

کہ ضرور ہمت کر کے سرہانے لگا ہوا بلب جلا دوں۔ ہاتھ پھڑ پھڑا رہا تھا اور جیسے اکڑوں بیٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ چپڑ چپڑ کچھ کھانے کی آواز آ رہی تھیں۔ جیسے کوئی مزے دار چٹنی چکھ رہا ہو۔ اب میں سمجھی! یہ بیگم جان نے آج کچھ نہیں کھایا اور ربو مردوئی تو ہے سدا کی چٹو۔ ضرور یہ تر مال اڑا رہی ہے۔ میں نے نتھنے پھلا کر سوں سوں ہوا کو سونگھا۔ سوائے عطر صندل اور حنا کی گرم گرم خوشبو کے اور کچھ محسوس نہ ہوا۔

لحاف پھر اُمنڈنا شروع ہوا۔ میں نے بہیترا چاہا کہ چپکی پڑی رہوں۔ مگر اس لحاف نے تو ایسی عجیب عجیب شکلیں بنانی شروع کیں کہ میں ڈر گئی۔ معلوم ہوتا تھا غوں غوں کر کے کوئی بڑا سا مینڈک پھول رہا ہے اور اب اچھل کر میرے اوپر آیا۔

''آں... اماں...'' میں ہمت کر کے گنگنائی۔ مگر وہاں کچھ شنوائی نہ ہوئی اور لحاف میرے دماغ میں گھس کر پھولنا شروع ہوا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے پلنگ کے دوسری طرف پیر اتارے اور ٹٹول ٹٹول کر بجلی کا بٹن دبایا۔ ہاتھی نے لحاف کے نیچے ایک قلابازی لگائی اور پچک گیا۔ قلابازی لگانے میں لحاف کا کونہ فٹ بھر اٹھا۔

اللہ! میں غڑاپ سے اپنے بچھونے میں...

پھسلن

محمد حسن عسکری

جمیل کا تو اس طرف خیال تک نہ گیا تھا، مگر ذاکر کے غیر متوقع طرزِ عمل نے اس کے دل میں بھی دلچسپی، ورنہ کم سے کم کھرچن سی تو ضرور پیدا کردی۔ وہ ہوا یوں کہ ایک دن مردانے میں ذاکر جمیل کی کمر میں ہاتھ ڈالے پلنگ پر بیٹھا تھا کہ یکایک اندر سے نذر و نمودار ہوا۔ اس نے ایک لمحے کے لیے ٹھٹک کر کمرے کے باشندوں کا جائزہ لیا، اور پھر شانے چوڑے کیے، سینہ اٹھائے، اپنی موٹی میلی سوتی بنیان کی، جس کے مختلف رنگ عرصے کے استعمال سے گھل مل کر اب ایک چتیوں دار بھوری رنگت میں تبدیل ہو چکے تھے، آدھی آستینوں سے نکلی ہوئی بانہوں اور ٹخنوں سے اونچی دھاری دار تہمد ہلاتا، بغیر کسی طرف دیکھے اپنے گلے کے سیاہ ڈورے کو ہاتھ سے گھماتا ہوا لاپروائی سے سیدھا میز کی طرف چل دیا۔ نذرو کے داخل ہوتے ہی ذاکر کی بھنوئیں اوپر اٹھ گئی تھیں، اور اس کی آنکھیں نذرو کے چہرے پر گڑ چکی تھیں۔ نذرو کے چلنے کے ساتھ ساتھ ذاکر کی آنکھیں بھی اس کے پیچھے پیچھے چلیں اور جمیل کے کندھے کو جھٹکا دے کر بایاں ہاتھ اپنے گھٹنے پر فیصلہ کن انداز سے رکھتے ہوئے ایک بھوں اوپر چڑھا کر اور دوسری نیچ کھینچ کر ترچھی سلوٹوں سے جتے ہوئے ماتھے اور طنز سے مسکراتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ پوچھا: ''یہ کون صاحب ہیں بھئی؟''

''ارے! تمھیں نہیں معلوم؟'' اور اس کے یہاں ذاکر کی آمدورفت کی تعداد کو دیکھتے ہوئے جمیل کا تعجب بے جا بھی نہ تھا۔ ''یہ نوکر ہے ہمارا نیا... نذرو... کمال ہے یار، تمھیں اب تک خبر نہ ہوئی... ہیں؟''

اس سوال کے جواب کی اہمیت پر غور کیے بغیر، ذاکر نے کہا ''یعنی آپ کو بھی یہ شوق ہوا۔ یہ کب سے؟ کیا ارادے ہیں آخر؟'' اس کی شک وشبہ سے بھری ہوئی آنکھوں کی تیزی اور چمک، اور ان کے جھکے ہوئے کناروں کے ساتھ اب دو ہونٹ بھی ہنسنے کے لیے کھل چکے تھے۔

جمیل کا دل نہ چاہتا تھا کہ اس گفتگو کو محض مذاق سے زیادہ وقعت دے، مگر اس نقطۂ نظر کے انوکھے پن نے اسے ایسا مجبور کر دیا کہ شام تک جتنی مرتبہ بھی نذرو اس کے سامنے آیا، اس نے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھ کر اس نظریہ کی صداقت معلوم کرنے کی کوشش کی، مگر ہر دفعہ یہی فیصلہ کرنا زیادہ خوشگوار معلوم ہوا کہ ذاکر صرف اسے چڑا رہا تھا۔ تاہم اسے اپنے نئے نوکر کی شخصیت کچھ عجیب و غریب، اجنبی اور پر رمز ضرور معلوم ہو رہی تھی، آج سے نہیں بلکہ پہلے ہی دن سے۔ وہ آ کر بڑے لاابالیانہ پن سے ہاتھوں کو پیٹ کے اوپر ایک دوسرے پر رکھ کر دھوپ میں جا کھڑا ہوا تھا۔ اور ہاں، اس نے کسی کو سلام تک نہ کیا تھا۔ جب اس سے نوکری کرنے کو پوچھا گیا تو اس نے پورے اعتماد کے ساتھ کہا تھا ''ہاں ہاں جی! کیوں نہ کریں گے؟'' اسے دعویٰ تھا کہ وہ ہر کام کر سکتا ہے۔ جب اس سے تنخواہ کے متعلق سوال کیا گیا تو اس نے اپنا زردی مائل بے رنگ لمبا صافہ اتارا، اور اسے جھاڑ کر دوبارہ باندھتے ہوئے ایسے انداز میں کہا گویا تنخواہ آخری چیز تھی جس سے اسے دلچسپی ہو سکتی تھی۔ ''اجی، جو بھی دل چاہے دے دینا''۔ اور اس نے تین روپے پر کوئی اعتراض کیا بھی نہیں۔ دو دن تک وہ بہت خاموشی اور سستی سے اپنا کام کرتا رہا، مگر تیسرے دن اس نے بالکل غیر متوقع طرز گفتگو اختیار کیا۔ جب جمیل اسکول جانے سے پہلے باورچی خانہ میں بیٹھا کھانا کھا رہا تھا تو نذرو نے نہایت رازدارانہ لہجے میں کہا ''اجی آج ایک سالی عجیب بات ہوئی... سناؤں میں جمیل میاں، وس کو تمھیں؟'' نذرو کے تنے ہوئے کان، گول گول پھرتی ہوئی آنکھیں، ہنسی میں کھلے ہوئے ہونٹ، اس کی ناک کے دونوں طرف سرخی کی جھلک، اور گالوں میں پڑے ہوئے گڑھے کو دیکھ کر جمیل ہچکچایا اور اس کے منھ سے نوالے میں سے پھنستی پھنساتی ایک نیم رضامند 'ہوں' نکلی۔ نذرو کو اس کی ضرورت بھی نہ تھی۔ ''یہ جو برابر میں لالہ رہتے ہیں نا، اجی یہی دیوار تلے''۔ نذرو ہر شخص اور ہر چیز کی بہن کے بارے میں اپنے فاسد خیالات کا بلا جھجک اظہار کیا کرتا تھا اور اس وقت بھی وہ اسے چھپا نہ رہا تھا۔ ''تو آج جو میں ذرا کوٹھے پہ گیا جمیل میاں، تو کیا دیکھا کہ وس کی بیوی سالی، بس بالکل ویسے ہی بیٹھی تھی... بس ایک ساڑھی لپیٹ رکھی تھی وس نے۔ اور اب کیا بتاؤں بھئی لو... لاحول بلا... لاحول بلا۔ سب دکھائی دے رہا تھا تو جی، اتنے میں وس کا میاں... لالہ۔'' نذرو اور قریب کھسک آیا تھا اور جمیل کا سارا چہرہ گلابی ہو گیا تھا، اور وہ جلدی جلدی نوالے توڑ رہا تھا۔ ''تو جی وس نے آتے ہی وس کے لے کے پلنگ...''

جمیل کے پھندا لگ گیا اور وہ کھانستا ہوا گھڑوں کی طرف بھاگا، اور پانی پی کر سیدھا چل دیا۔ اس کے کسی نوکر نے کبھی اس سے ایسا ذکر نہ کیا تھا۔ اس چیز نے اسے شش و پنج میں ڈال رکھا تھا۔ اور پھر آج کی ذاکر کی باتیں۔ وہ نہایت مضبوط دلیلوں اور مثالوں سے اس سب کی اہمیت کم کرنے اور اسے کوئی غیر معمولی چیز نہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا، مگر پھر اسے اپنے فیصلوں پر اعتبار نہ آتا تھا۔

اگلے دن تک یہ بات اسکول میں پہنچ گئی۔ درمیانی وقفے میں جب نویں کلاس کے لڑکے نیم کے پیڑ کے نیچے جمع ہوئے تو ایک پوری ٹولی نے جمیل کو گھیر لیا۔

''اونچے جا رہے ہیں بھئی جمیل بھی آج کل۔''

''خیر میاں شکر کرو، یہ اس قابل تو ہوئے۔''

''ابے ہٹا۔ یہ! اس مرے یار سے آتا ہی کیا ہے سوائے گھوٹنے کے، کسی کے سامنے بات تو کر نہیں سکتا، بڑا بنا ہے کہیں کا وہ۔''

''مکھیاں مارو گے بیٹا۔'' مرزا بیدار بخت نے نصیحت کی۔ ''سب بھول جاؤ گے یہ فرسٹ ورسٹ آنا۔''

جمیل ان سب کے جواب میں جھینپ جھینپ کر روکھی ہنسی ہنس رہا تھا اور خالی نگاہوں سے ان کے چہرے دیکھ رہا تھا۔ لیکن وہ اسے وقتی تفریح سمجھ کر ٹلا نہ سکتا تھا۔ اور شبہوں کے ساتھ ساتھ اس کی دلچسپی بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ ان چیزوں سے بھی واقف ہونا چاہتا تھا جس کا یہ سب لوگ ذکر کر رہے تھے اور جس کا تخیل اس کے دماغ میں نہایت غیر واضح سا تھا۔ وہ بھی علی بابا کے غار میں داخل ہونا چاہتا تھا۔

اسی دن دوپہر کو مرزا بیدار بخت ذاکر کو ساتھ لے کر جمیل کے یہاں نمودار ہوئے۔ انھوں نے اس کا پہلے ہی سے اعلان کر دیا تھا۔ مرزا جی کو بڑی پیاس لگی ہوئی تھی۔ نذرو انھیں پانی کا گلاس دے کر کھڑا ہو گیا اور اپنا سر کھجانے لگا۔ مرزا جی نے پانی کا گلاس واپس نہیں دیا۔ وہ دو منٹ تک اس کا جائزہ لیتے رہے اور پھر بولے۔ ''کہو دوست کیا نام ہے تمھارا؟''

''ہمارا نام؟ کیا کرو گے پوچھ کے ہمارا نام؟'' اس نے بے توجہی سے کہا۔

''کچھ برائی ہے پوچھنے میں؟''

''ہمارا نام ہے سید نذیر علی!'' نذرو نے بتلایا۔

''اور نذرو؟'' مرزا جی نے پوچھ لیا۔

''اب ہم غریب آدمی ہیں، چاہے جو کہہ لو۔''

''رہنے والے کہاں کے ہو تم؟ اچھا بیٹھو، بیٹھو، باتیں کرنی ہیں تم سے۔''

نذرو پلنگ کے قریب کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ یوں تو کبھی کبھی اسے کرسی پر بیٹھنے میں جمیل کا لحاظ نہ ہوتا تھا۔ لیکن اس وقت اس کی نشست بتا رہی تھی کہ وہ اپنے آپ کو مواخذے سے مامون سمجھ رہا ہے۔

اس نے ماتھے اور سر پر اپنا چوڑا اور موٹا ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا، ''اجی کیا پوچھو ہو... ہم غریبوں کا رہنا رہوانا۔''

''ابے سالے؟'' مرزا جی نے پہلو بدل کر ڈانٹا۔ ''اکڑ گیا کرسی پہ بیٹھ کے! بتاتا ہے کہ کی جائے قانونی کاروائی تیرے ساتھ۔''

نذرو ایک دم ہنس پڑا۔ اس کا ہاتھ سر سے گھٹنے پر آ گیا۔ پیچھے کھسک کر اس نے مانوس اور مصالحانہ انداز میں ٹانگیں پھیلا لیں، اور بغیر کسی مزید، گو متوقع، سوال کے اپنی پوری سوانح حیات سنا ڈالی۔ ''رہنے والے تو ہم ہیں عنایت پور کے۔ ہمارے والد ہیں سید مقبول احمد۔ دیکھا ہوگا آپ ہے۔ بہت آتے ہیں وہ تو شیر۔'' مرزا جی کے انکار سے مایوس ہوئے بغیر اس نے اور زیادہ اعتماد کے ساتھ دوسری شہادت پیش کی۔ ''اچھا، تو یہ ہیں نا سید اشفاق علی۔ یہ بزار کے نکڑ پر جو رہویں ہیں... موٹے سے... بڑی بڑی مونچھیں فوٹو گراف کے رکاٹ بغل میں دبائے جو پھرتے ہیں۔ یہی تو ہیں ہمارے خالو... سگے خالو ہیں یہ ہمارے... تو ابا جو تھے ہمارے... وہ تھے اس قدر کے ظالم کے بس۔ جب میں پڑھنے نہ جاتا تو مار دیویں تھے ایسی بودی کہ دس سال کا تھا میں وس وخت۔ ایک دن جو مارا انھوں نے مجھے، تو مجھے آیا بڑا غصہ، میں بھاگ کر بدلو جلاہے کی پھلیج پہ جا بیٹھا۔ وس نے مس سے کہا چل بے دلی... شیشے کے کرخانے میں۔ میں وسی کے ساتھ چل دیا۔ بس جی وہ دن ہے اور آج کا دن۔ قسم لے لو مس سے جو پھر گھر میں جھانکا بھی ہوں۔ پانچ سال ہو گئے اور پھر والد نے کی بھی بڑی کوشش، لیکن میں ون کے نہ آیا جھانسے میں... دلی میں میں شیشے کے کرخانے میں نوکر ہو گیا تھا۔ کرخانے والا بس بیٹے کے برابر سمجھتا تھا مجھے، جو چیز چاہے اٹھاؤں چاہے رکھوں۔ اور پیسوں کے معاملے میں بچارے نے کبھی مجھ سے نا نہیں کی۔ بڑی محبت تھی وسے مس سے۔ ایک دن میں رانگ آگ پہ رکھ کے ذرا نیچے بزار میں اتر گیا۔ وہاں ایک لونڈا سالا کرنے لگا مجاخ، بس اسی میں دیر ہو گئی۔ آ کے جو دیکھ میں نے تو رانگ الٹا پڑا تھا۔ کرخانے والا بہت بگڑا مجھ پہ۔ خیر ایسی بات کا تو میں برا بھی نہ مانتا، پر وہ مجھے گالی دے بیٹھا۔ وخت کی بات آگ لگ گئی میرے بدن میں۔ میں وس سے لڑ کے نکل گیا۔ کئی دن پھرا وہ میرے پیچھے پیچھے۔ خوشامد کرتا وا کہ چل، چل، اتی سی بات کا برا مان گیا۔ پر ساب، یہ دیکھ لو کہ میں نے ہی نہ سنی وس کی بات۔ سید ٹھہرے پھر ہم بھی۔ کوئی رعیت تھے وس کی۔ وس سے کہہ دیا

میں نے کہ لے تیری خاطر ہم نے دلی بھی چھوڑی۔بس میں وہاں سے یہاں چلا آیا۔

اس دن سے مرزا جی، اور خصوصاً ذاکر کی آمد ورفت پہلے کی نسبت بہت بڑھ گئی۔لیکن جمیل محسوس کرر ہا تھا کہ اس کی کمر کے گرد ذاکر کے ہاتھ کی گرفت بہت کمزور پڑ گئی ہے۔ان دونوں کو آتے ہی پانی یا پان کی ضرورت پیش آتی تھی اور جتنی دیر وہ بیٹھتے، اس کا زیادہ حصہ نذرو سے دل کے بازاروں، گلیوں، کارخانوں، اور سڑکوں کے متعلق معلومات حاصل کرنے میں گزرتا۔نذرو کی وہ پہلے والی کسالت، سستی اور خاموشی سرے سے غائب ہو چکی تھی۔اب اس کی چال میں پھرتی آ چکی تھی، اور وہ دن میں تین چار بار منھ ہاتھ دھونے لگا تھا۔اس کا صافہ اب باورچی خانے کی کھڑکی میں پڑا رہتا تھا اور اس کے چھوٹے گھنگریالے بال، جن پر پہلے خشکی جمی رہتی تھی، کڑوے تیل سے سیاہ اور چمکدار نظر آنے لگے تھے۔وہ اپنے بنیائن اور تہمد کو بھی ایک دفعہ کنوئیں پر پچھاڑ چکا تھا۔اس کی ٹین کی ڈبیا اب کبھی بیڑیوں سے خالی نہیں نظر آتی تھی بلکہ اس کے گلے کا ڈورا بھی ریشمی ہو گیا تھا۔باتونی بھی وہ اس بلا کا ہو گیا تھا کہ اس کے دلی کے متعلق قصے کبھی ختم نہ ہوتے معلوم ہوتے تھے۔لیکن مرزا جی اور ذاکر اسے دو اچھے سامعین مل گئے تھے۔اور ان دونوں سے تو اس کے تعلقات ترقی کر کے دوستانے کے لگ بھگ پہنچ گئے تھے۔انھیں نذرو کے منھ کی جھوٹی بیڑیاں پینے میں ذرا تامل نہ ہوتا تھا۔وہ اسے یار دوستوں کی سی گالیاں بھی دے لیا کرتے تھے، حالانکہ وہ ایک مرتبہ جمیل کے 'گدھا' کہہ دینے پر بھڑک اٹھا تھا۔جب وہ مرزا جی کے جوتے چھپا دیتا تو مرزا جی اسے پکڑ کر فرش پر گرا دیتے اور اس کے گالوں اور سینے پر چٹکیاں لیتے، یہاں تک کہ وہ جوتوں کا پتا بتا دیتا۔جمیل نے اکثر اندر سے نکلتے ہوئے ذاکر کی بانہوں کو نذرو کے گلے میں دیکھا تھا، مگر وہ اس کے سامنے آتے ہی ہٹالی جاتی تھیں۔نذرو نے جمیل کا کہنا ماننا بالکل چھوڑ دیا تھا۔وہ اس کی بات کو ان سنی کر دیتا تھا۔جب جمیل پڑھتا ہوتا تو وہ سامنے چارپائی پر الٹا لیٹ کر اونچی جھنجھناتی آواز میں گانے لگتا: 'میری جاں جلف کے پھندے بنانا کس سے سیکھے ہو'۔ یا 'جانی جبنا پہ اتنا نہ اترایا کرو'۔وہ جمیل کے منع کرنے پر بھی نہ مانتا، اور ہنس ہنس کر دوسرا گیت شروع کر دیتا، 'وہ چلے پھٹک کے چاول مری منگنی اور بیاہ کے'۔جب جمیل ضبط کی آخری حد پر پہنچنے کے بعد غصے میں دانت کچکچاتا، جوتا لے کر سیدھا کھڑا ہو جاتا تو وہ جوتا چھین کر بھاگ جاتا اور پھر ہاتھ نہ آتا۔آخر جمیل روانکھا ہو جاتا اور پھر اس سے نہ پڑھا جاتا۔وہ تہیہ کر لیتا کہ آج ضرور وہ نذرو کو ابا کے سامنے مارے گا اور گھر سے نکال دے گا۔لیکن جب تھوڑی دیر بعد نذرو آ کر لجاجت سے کہتا ''جمیل میاں، مجاخ کا بڑا امان گئے۔'' تو وہ اپنے ارادے میں ترمیم کر لیتا اور نذرو کے سر پر دو تین تھپڑ جما کر، جس میں شاید اس کی باریک انگلیوں کو ہی زیادہ تکلیف

پہنچتی ہوگی، اپنا غصہ بھلا دیتا۔ مگر اس سب کے معنی یہ نہیں ہیں کہ نذرو کو جمیل کا خیال نہیں تھا۔ بغیر کہے ہی وہ جمیل کا ہر کام تیار رکھتا تھا۔ اس کے جوتے کبھی میلے نہیں رہتے تھے، اور نہ اس کے کمرے میں گرد کا نشان۔ نذرو اس کا سرپرست اور محافظ بن گیا۔ وہ ہمیشہ جمیل کو کتابیں صاف رکھنے میں، اندھیرے میں گھر سے باہر نکلنے میں، غرض ہر بات میں بزرگانہ ہدایتیں اور نصیحتیں کیا کرتا۔ وہ مرزا جی اور ذاکر کو بھی اسے زیادہ تنگ نہ کرنے دیتا تھا۔ جمیل کو نذرو کی یہ حیثیت جو اس نے قائم کر لی تھی، گراں تو ضرور گزرتی تھی، اور وہ اب اپنے دوستوں کے سامنے نذرو کی موجودگی میں اپنے آپ کو ایک کم اہمیت والی شخصیت محسوس کرنے لگا تھا لیکن اس کے دل میں کبھی کبھی صرف ایک ہلکی اور غیر واضح جھنجھلاہٹ سی محسوس ہو کر رہ جاتی تھی۔ چنانچہ اس نے نہایت آسانی سے نذرو کو اپنے اوپر مسلط ہو جانے دیا۔ مرزا جی اور ذاکر کے نذرو کی طرف متوجہ ہو جانے سے اب وہ اسے پریشان نہ کرتے تھے، اور وہ اپنے آپ کو کچھ ہلکا سا پاتا تھا۔ نذرو کی خبر گیری اور توجہ سے اس کے کام بغیر کسی تکلیف کے ہو جاتے تھے اور اب اسے اپنی کتابوں اور رسالوں کے رومانی افسانوں میں وقت گزارنے کا پہلے سے بہت زیادہ موقع ملنے لگا تھا، اس لیے اس نے نذرو اور اس کے برتاؤ کو بغیر کوئی اہمیت دیے یا بغیر کسی تشویش کے یوں ہی چلنے دیا اور اپنے پہلے استعجاب کو تحلیل ہو جانے دیا۔

لیکن اس کا استعجاب دوبارہ زندہ ہوا۔ وہ اس وقت جب مرزا جی اور ذاکر کی آمد و رفت بڑھنے کے بعد پھر گھٹتے گھٹتے بہت کم رہ گئی تھی۔

اس کے ملنے والوں کے دو گروہ تھے۔ ایک تو اس کے ساتھی، نویں کلاس کے کچھ لڑکے، یہ سب اس سے کافی بڑے تھے اور سب اپنے اپنے استروں کا انتخاب کر چکے تھے۔ یہ جمیل کی طرح دبلے پتلے کمزور اور منحنی نہ تھے، بلکہ ان کی چوڑی ہڈیاں، اٹھے ہوئے کندھے اور بھرے ہوئے ڈنڈ تھے۔ یہ لوگ جب آتے تو اس سے الگ ہو کر بیٹھنا تو جانتے ہی نہ تھے۔ وہ کبھی تو اس کی گردن میں ہاتھ ڈالتے، کبھی اسے سینے سے لپٹا کر بھنیچتے، یہاں تک کہ اس کا چہرہ سرخ ہو جاتا اور اس کی پسلیاں ٹوٹنے سی لگتیں۔ کوئی اسے گود میں بٹھاتا، کوئی اس کے سینے کی کھال کھینچ کھینچ کر لال کر دیتا، کوئی اس کے بال بکھیر دیتا۔ اور پھر ان لوگوں کی چمکتی ہوئی آنکھوں اور پھڑکتے ہوئے نتھنوں اور پھیلے ہوئے ہونٹوں سے معلوم ہوتا کہ ان کی تسکین نہیں ہوئی ہے۔ ان کے جانے کے بعد وہ تھک کر بالکل چور ہو جاتا، اس کے دماغ سے ہر قسم کے خیالات غائب ہو جاتے اور وہ افسردگی سے چارپائی پر پڑا رہتا۔ بعض دفعہ تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے گالوں پر ایسا لیس دار تھوک لپ جاتا کہ اس کی کھال کھینچتی ہوئی معلوم ہونے لگتی۔ دو دو تین تین مرتبہ منھ دھونے کے بعد بھی اسے محسوس ہوتا کہ یہ نجاست

اس کے چہرے پر اسی طرح نمایاں ہے اور وہ غسل خانے سے نکل کر گھر والوں کی نظروں سے بچتا ہوا سیدھا اپنے کمرے میں چلا جاتا۔ اتنے لوگوں کو اپنا مداح پا کر اسے ایک گونہ تسلی تو ضرور ہوتی تھی مگر اسے ان کی یہ حرکات عجب مہمل اور لغو نظر آتی تھیں۔ ان کا مقصد اس کے لیے مبہم اور مشکوک سا تھا، اور نہ اس کی متانت نے ان لوگوں کو ان حرکات کی غرض و غایت کو زیادہ واضح کرنے دیا تھا۔ جب وہ جاتے تو اس کے لیے بس اتنا چھوڑ کر جاتے، تھکا ماندہ جسم، دکھتی ہڈیاں، نچے ہوئے گال، گرم کنپٹیاں، درد کرتا ہوا سر اور چڑچڑا مزاج۔ اور پھر ان سے بچنا بھی خوشگوار نتائج پیدا نہ کر سکتا تھا۔ یہ ممکن تھا کہ وہ اندر سے کہلوا دیا کرے کہ وہ گھر پر موجود نہیں ہے، لیکن اس نے خود دیکھا تھا کہ ایک مرتبہ شمس الدین نے شرط بد کر گھونسے سے کرسی کا تختہ توڑ دیا تھا اور عنایت علی کے ہاتھ کی قوت تو خود اس کی انگلیاں پنجہ لڑانے میں محسوس کر چکی تھیں۔

ملنے والوں کے دوسرے گروہ میں نیچی کلاسوں کے لڑکے تھے۔ چھٹی سے لے کر آٹھویں تک۔ یہ سب جمیل کے ہم عمر یا اس سے کچھ چھوٹے تھے۔ یہ لوگ پہلے گروہ کی غیر موجودگی میں آتے تھے اور انھی میں جمیل کو زیادہ کھل کر ہنسنے بولنے اور تفریح کرنے کا موقع ملتا تھا۔ پھر ان پر اس کا رعب بھی خاصا تھا۔ اگر وہ کبھی ذرا ناراضگی کا اظہار کرتا تو سب کی ہنسی رک جاتی تھی اور وہ مجرمانہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگتے تھے۔ تاہم وہ بڑی حد تک ان کے مذاق کا برا بھی نہ مانتا تھا۔ بعض بعض دن تو جب وہ دوپہر کی گرمی اور خاموشی میں بے چینی سے اکیلا کروٹیں بدلتا ہوتا اور کہیں ساتویں کلاس والا مظہر آ نکلتا تو اس کا دل تیزی سے حرکت کرنے لگتا۔ اپنی قمیص کے دامن کو ہاتھوں سے ٹانگوں کے قریب تھامے ہوئے وہ مظہر کو کسی بہانے کونے کی طرف لے جاتا اور اس کا کندھا پکڑ کر ہچکچاتے ہوئے جلدی سے اس کے گال پر اپنے ہونٹ رکھ دیتا اور فوراً پیچھے ہٹا لیتا۔ گال ٹھنڈا، چکنا اور پھیکا سا ہوتا، مگر اسے محسوس ہوتا کہ اس کی بے چینی یک لخت مدھم پڑ گئی، اسے اپنی یہ حرکت کچھ بے معنی اور احمقانہ سی معلوم ہونے لگتی۔ وہ دل ہی دل میں حیرت سے ہنستا۔ پھر کچھ شرما کر بیٹھ جاتا۔ اور مظہر سے اس کی پڑھائی کے بارے میں پوچھنے لگتا۔

غرض اسی گروہ نے جمیل کو دوبارہ نذرو کی طرف مستفسرانہ نظروں سے دیکھنے پر مجبور کیا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ ان لوگوں میں بھی نذرو کے بارے میں چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔ ایک دن نذرو کی موجودگی میں، مشتاق نے مذاق اور قہقہوں اور چیخوں کے درمیان اپنی آواز کو بلند کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ''بھئی آج یہ طے کرو کہ دونوں میں سے کون اچھا ہے، مالک یا نوکر؟'' اپنے نوکر کو اس نئی روشنی میں دیکھے جانے کے خوف سے جمیل کی ناک کے دونوں طرف سرخی جھلک آئی اور اسے

اپنی کھال سکڑتی ہوئی معلوم ہونے لگی۔ مگر اس نے اس ترکیب میں اپنی آخری امید سمجھتے ہوئے مسرور کو زور سے دھکا دیا۔ ''ابے، میرے اوپر گرا ہی پڑتا ہے''۔ اسے توقع سے زیادہ کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ مسرور کے دھکے سے میز گر پڑی، اور اس نے سب کو کتابیں چننے میں لگا دیا۔

اب جمیل کی آنکھیں زیادہ تجسس سے اور شک آمیز حیرت سے نذرو کے چہرے اور جسم کو ٹٹولا کرتی تھیں۔ مشتاق نے ایسا ذکر چھیڑ کر اس کے جذبہ افتخار کو ایک بے پناہ ٹھیس لگا دی تھی۔ اس نے اپنے دوستوں کے دوسرے گروہ سے بھی ملنا اب بہت کم کر دیا تھا کیوں کہ اسے ان کے متفقہ فیصلے کا، جو ممکن تھا اس کے خلاف ہوتا بہت ڈر تھا۔ مگر وہ اس خیال کو اپنے دل سے کسی طرح دور نہ کر سکا۔ اسی لیے وہ اپنے خطروں کو دلیلوں سے دور کرنے کی پیہم کوشش کرتا کہ ایک نفرت آمیز 'ہنھ' کے ساتھ اس کی ہر طرف سے نظریں پھیر لے۔ نذرو کی انگلیاں، وہ سوچا کرتا، کیسی موٹی موٹی گنواروں کی سی ہیں اور اسی طرح اس کے بھدے پیر، بغیر بالوں والی پنڈلیاں کیلے کے پیڑ جیسی ہیں، بیچ میں سے مڑا ہوا، ایک دانت آدھا ٹوٹا، ادرک کی گانٹھ جیسے کان، چھوٹی اور گھنی گردن، پھیلا ہوا پیٹ، گالوں میں ہنسی کے وقت گڑھے پڑ جاتے ہیں جیسے بازاری عورتوں کیا یک نفرت آمیز 'ہنھ!' لیکن اس 'ہنھ' کے باوجود وہ اسے دوسری دفعہ دیکھنے پر مجبور ہوتا۔ اس کے گندمی رنگ میں سفیدی کی چھینٹ ہے۔ آنکھوں کے نیچے ہڈیوں پر تو ذرا سی سرخی بھی جھلکتی ہے، کھال تنی ہوئی ہے مگر چکنی اور چمک دار۔ ٹھوڑی کیا گول ہے! چال کے لاابالیہ پن میں نہ معلوم یہ ہلکی سی کشش کیوں ہے۔ آنکھیں گول مٹول سہی، مگر متجسس اور چمکتی ہوئی۔ اس کی گردن پر ذرا میل نہیں جمتا۔ بازوؤں کی مچھلیاں کیسی حرکت کرتی ہیں۔ چہرہ گولائی لیے ہوئے ہے۔ جمیل خود اپنی رائے سے بھی خوف زدہ ہو جاتا اور فوراً کوئی کتاب اٹھا لیتا۔ جو دس منٹ سے زیادہ اس کی مدد نہ کر سکتی۔ آستینیں اوپر کھینچ کر وہ اپنی بانہوں کو اوپر سے نیچے تک دیکھتا، گندمی رنگ، پتلی پتلی لکڑیاں سی، ہلکے ہلکے بال۔ کچھ مطمئن ہو کر وہ اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتا۔ ایک نرم، نہایت نرم، روئی کی طرح... اور چکنی سطح پر اس کی انگلیاں پھسلتیں۔ یقین کو عین الیقین بنانے کے لیے وہ آئینہ اٹھا لیتا۔ بڑی بڑی سیاہ، بادامی، لمبی پلکوں والی آنکھیں آئینے میں سے دیکھ کر اس کی طرف جھانکتیں۔ اسے ایسی خوشی ہوتی گویا اس نے کوئی نئی دریافت کی ہے۔ دودھ جیسے سفید اور بلند ماتھے پر سیاہ چمک دار بالوں کی، جن میں پیچھے کی طرف ہلکا سنہرا رنگ جھلکتا تھا، کوئی لٹ پڑی ہوتی، زردی مائل سفید رنگ میں آنکھوں کے نیچے کافی دور تک سیب کی سی سرخی ملی ہوئی ہے۔ ناک لمبی مگر پتلے ہونٹ خاصا نعم البدل ہیں۔ کانوں کے لمبان کو بال چھپا لیتے ہیں۔ تھوڑی چپٹی ہے... ہے تو ہوا کرے، رنگ تو گورا ہے۔ چہرہ گول نہیں ہے... آنہہ... گول چہرے ہی میں کون سی

خوبصورتی لگی ہوئی ہے۔ اوپر کے ہونٹ پر ہلکے ہلکے بال نظر آنے لگے ہیں... مگر ایسا رواں تو جمیل نے کئی عورتوں کے بھی دیکھا تھا... اپنی پتلی کمر کی بدولت وہ اپنے دبلے پن کو بھی معاف کر سکتا تھا۔

یہ نظریے اطمینان بخش تو ضرور تھے، مگر موازنے کا خیال جمیل کے سامنے ایک ایسے گھناؤنے عفریت کی شکل میں آتا تھا جو اپنی زہرناک حاسدانہ نظروں سے ناک اور کانوں کو کھینچ کھینچ کر دگنا لمبا کر دیتا۔ ٹھوڑی کو پھیلاتے پھیلاتے دہلیز بنا دیتا۔ چہرے کو ہر طرف سے پیٹ پیٹ کر کانیں نکال دیتا۔ اس کے رنگ کو ہلدی کی طرح دکھلاتا اور اس کی سیب کی سی سرخی کو دھندلا دیتا۔ اوپر کے ہونٹ کے ہلکے ہلکے بال گہرے اور گھنے ہونے شروع ہو جاتے اور جمیل پیچ و تاب سے تنگ آ کر انھیں ناخنوں سے کھینچنے لگتا۔

مگر نذرو کا طرزِ عمل بدل رہا تھا۔ اب وہ پہلے سے زیادہ اس کا خیال رکھنے لگا تھا۔ اب وہ اس کا کہنا ماننے سے انکار نہ کرتا تھا اور کم سے کم جمیل کے پڑھتے وقت وہ بالکل نہ گاتا تھا بلکہ اب تو اس کی غزالوں کا انتخاب بھی اصلاح پذیر تھا اور اس کا دل پسند گانا اب یہ تھا 'کرے گا کیا ارے صیاد تو جنجیر کے ٹکڑے'۔ اب وہ جمیل کے کمرے کی طرف زیادہ رہنے لگا تھا۔ جمیل پڑھتا رہتا اور وہ ایک طرف کرسی پر بیٹھا اپنا سر کھجایا کرتا اور بعض اوقات تو اونگھنے بھی لگتا۔ نہ معلوم اسے کیا سما گئی تھی کہ وہ اپنی عمر جمیل سے کم ثابت کرنے کے لیے بہت بے قرار رہتا تھا، بیٹھے بیٹھے وہ جمیل کو پڑھنے سے روک کر کہتا ''ذرا حساب تو لگانا جمیل میاں، کہ میں کتنے برس کا ہوا... جب میں پڑھنے بیٹھا ہوں تو آٹھ سال کا تھا۔ میں تو آٹھ اور دو دس اور پانچ پندرہ۔ چھوٹا ہی ہوا نا میں تم سے؟''

جمیل چڑ سا جاتا، اسے محسوس ہوتا کہ نذرو اپنی برتری جتانا چاہتا ہے۔ ایک دوسری چیز بھی جمیل کو بہت ناگوار گزرتی تھی۔ جب وہ اپنی کتاب میں غرق لیٹا ہوتا تو نذرو اس کے پیر میں گدگدی کیے بغیر کبھی نہ مانتا۔ حالانکہ اس کے بدلے میں اسے لاتیں اور چانٹے کھانے پڑتے تھے۔ نذرو کی ایک اور عادت یہ تھی کہ وہ جمیل کے سرہانے بیٹھ جاتا اور اس کے بالوں میں ہلکے ہلکے انگلیاں پھرایا کرتا۔ اس سے جمیل کے تھکے ہوئے اور خشک دماغ میں ایسا معلوم ہوتا گویا سکون اترتا چلا جا رہا ہے اور وہ گردن کو ڈھیلا چھوڑ کر کتاب سے توجہ ہٹا لیتا۔ شروع شروع میں تو اس نے نذرو کو بھگا بھگا دیا، مگر جب وہ کسی طرح باز نہ آیا تو آخر اس نے نذرو کو یہاں تک اجازت دے دی کہ وہ کنگھا لے کر بیٹھ جائے اور جس طرح چاہے اس کے بال بنائے اور پھر بگاڑے، اور پھر بنائے اور پھر بگاڑے۔

اخیر اکتوبر کی رات کے نو بجے تھے، کچھ خنکی سی ہو رہی تھی۔ جمیل کوٹھے پر دالان میں اکیلا لیٹا تھا۔ نذرو آیا اور اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا ''جمیل میاں ایک بات کہوں تم سے، برا تو نہیں مانو گے؟''

جمیل دھک سے رہ گیا۔ اس کے دل کی حرکت رکتی ہی معلوم ہوئی اور ٹانگیں سنسنانے لگیں۔ کئی دن سے نذرو کا انداز ظاہر کر رہا تھا کہ وہ کوئی بات کہنی چاہتا ہے۔ جمیل کو شبہ تھا کہ وہ بات غیر معمولی ضرور ہے۔ اس نے ارادہ کرلیا کہ وہ ایسی بات سننے سے جس کی نوعیت سے وہ بالکل بے خبر ہے، انکار کر دے گا۔ لیکن اسے حیرت بھی ہو رہی تھی۔ آخر کچھ سوچ کر اس نے رکتے ہوئے کہا ''ہاں، کہہ۔''

نذرو نے بات کہنے کا انداز بنانا شروع کیا ہی تھا کہ قدموں کی آواز آئی۔

یہ بات کئی دفعہ قدموں کی آواز سے ملتوی ہو ہو گئی۔ لیکن آخر ایک دن ایسا آیا کہ نذرو نے نہ صرف بات کہنے کا انداز بنالیا بلکہ بات بھی شروع کر دی، اور کوئی آواز نہ سنائی دی۔ اس نے پراسرار آواز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اجی کیا بتاؤں میں نے کیسا عجیب خواب دیکھا... عجیب خواب تھا سالا... کیا بتاؤں، جمیل میاں، کیا خواب تھا وہ۔''

''ہاں، کیا خواب تھا وہ؟'' جمیل نے بے تابی، مگر شبہ سے پوچھا۔

''اجی، کیا بتاؤں... کیا خواب تھا وہ... میں جب سے وسی کو سوچ رہا ہوں برابر۔''

''ابے تو کچھ کہے گا بھی؟''

''ہاں ہاں تو جی، وہ خواب... برا تو نہیں مانو گے، جمیل میاں۔''

''تو کہہ تو کسی طرح۔''

لمبا سانس لے کر نذرو نے سنایا، ''برا مت ماننا، جمیل میاں، دیکھو وہ خواب... ہنسی آوے ہے مجھے اس خواب پہ۔''

جمیل نے پھر ڈانٹا۔

''ہاں تو میں نے یہ دیکھا خواب میں، جمیل میاں، کہ... کہ... میں اور تم ایک پلنگ پر لیٹے ہیں۔''

بم کا گولہ پھٹا۔ مگر چوں کہ جمیل نے اسی نوعیت کی کوئی بات سننے کے لیے اپنے آپ کو پہلے سے تیار کرلیا تھا، اس لیے اس دھکے کا مقابلہ کرنے میں اس کی کوشش زیادہ کامیاب رہی۔ اس سب کو ختم کر دینے کے لیے جمیل نے اس لفظ کو انتخاب کیا 'اچھا'۔ اور اس لفظ کو اس نے ایسی آواز میں ادا کرنے کی کوشش کی جس میں کسی جذبے کی آمیزش نہ ہو۔

نیچے سے کسی نے نذرو کو پکار کر جمیل کی مدد کی۔ اس نے جانے کے لیے اٹھتے ہوئے تمسخرانہ انداز میں آنکھیں گھما کر کہا۔ ''جمیل میاں، ویسے چاہو جتنا چاہے دق کرلو، خواب میں تو مت تنگ کیا کرو۔''

اب جمیل نذرو کی نگاہوں سے کچھ سہما سہما سا رہنے لگا۔ نذرو نے بھی اس کے کمرے میں آنا بہت کم کر دیا تھا لیکن وہ اکثر جمیل کے سامنے مسکرا پڑتا تھا جس سے جمیل شرمندہ سا ہو جاتا۔ گویا وہ چوری کرتا پکڑا گیا ہے۔ جب تک نذرو اس کے کمرے میں رہتا، اسے سوئیاں سی چبھتی معلوم ہوتیں اور اس کا دل چاہتا کہ چادر اوڑھ کر اپنے آپ کو نذرو کی نگاہوں سے بچا لے۔ کبھی ایسا ہوتا کہ لیٹے لیٹے وہ کسی چیز کو اپنے پیروں کے قریب محسوس کرتا۔ کتاب سامنے سے ہٹا کر دیکھنے پر معلوم ہوتا کہ نذرو اس کے پیر سے اپنا چہرہ لگائے بیٹھا ہے۔ وہ نفرت اور غصے سے پیر کھینچ لیتا، مگر اب وہ نذرو کی مسکراہٹ اور آنکھوں کی چمک کے خوف سے اس کے لات نہ مارتا تھا۔ اب چاہے اس کے سر میں درد ہی کیوں نہ ہو، وہ کبھی نذرو سے سر ملنے کو نہیں کہتا تھا اور اس کے بالوں سے نذرو کی دلچسپی بھی جیسے زائل سی ہو گئی تھی۔

رفتہ رفتہ یہ سب معمول سا ہو گیا اور جمیل نے نذرو کی طرف زیادہ خیال کرنا چھوڑ دیا لیکن ایک واقعہ سے اس کی جھینپ اور ڈر، جواب کم ہو چلے تھے، نفرت اور کراہت میں تبدیل ہو گئے۔ پہلی مرتبہ قوالی سننے کا شوق جمیل کو عرس میں لے گیا اور رات کے خیال سے نذرو بھی اس کے ساتھ کر دیا گیا۔ جگہ تو خیر بیچ میں مل گئی، مگر کھچ پچ اتنی تھی کہ کروٹ بدلنے کا موقع نہ ملتا تھا۔ تالیوں اور ڈھول کے گھٹاکے، قوالوں کی منجھی ہوئی بے روک آوازوں کے ساتھ مل کر اپنا کام کر چکے تھے۔ ایک گیروا لباس اور لمبی داڑھی اور بالوں والے صاحب نے اپنی وارفتگی کا اظہار، آنکھیں بند کر کے جھونٹے کھانے سے بڑھ کر، اپنے مسلک کی روایتی خوش ادائی سے کرنا شروع کر دیا تھا۔ ان کے لیے میدان خالی کر دیا گیا اور 'جہاں پیدا ہوا شیر خدا معلوم ہوتا ہے' کی تکرار ہونے لگی۔ ان کی ہر فلک شگاف 'اللہ ہو' پر ان کے سر کو اپنی طرف بڑھتا ہوا دیکھ کر نذرو 'اجی! اجی!' کہہ کر پیچھے ہٹتا جاتا تھا اور جمیل کے اوپر گرا پڑ رہا تھا۔ وہ بے چینی سے جمیل کا بازو کھینچ کھینچ کر کہہ رہا تھا ''اجی جمیل میاں، مجھے تو ڈر لگے ہے۔'' لوگ ہنسنے لگے۔ جمیل کے کان سرخ اور گرم ہو گئے اور اس کی کنپٹیاں جل اٹھیں۔ اس دن سے جمیل کی جھجک نکل گئی اور اب وہ نذرو کی نگاہوں کا بے خوف ہو کر مقابلہ کر سکتا تھا۔ لیکن اب اس نے نذرو کو ایسی حقارت اور نفرت سے دیکھنا شروع کر دیا تھا جیسے اس کالے پیلے مینڈک کو، جو برسات میں نالیوں پر سے رینگتا ہوا بستر پر آ چڑھے۔

اپریل آ گیا... گنگا اور جمنا کے دوآبے کا رنگ اور افسردہ اپریل۔ موسم کی خشکی، گرمی، ہوا، خاک، دھول، سالانہ امتحان کی تیاریوں، مایوسیوں اور امیدوں نے اضمحلال اور گم گشتگی کی ایک مستقل فضا پیدا کر دی تھی... روح پر ایک ناقابل برداشت لیکن لازمی بوجھ کی طرح۔ دوپہر کا وقت تھا۔ ہوا کمرے کے کواڑوں کو ہلائے ڈالتی تھی اور گرد نے روشن دانوں میں سے آ آ کر چہرے اور

بالوں کو بھورا بنا دیا تھا۔ باہر تو دھوپ کا جو کچھ بھی حال ہو، مگر کمرے میں، جہاں جمیل لیٹا تھا، گرمی کا اس قدر اثر ضرور تھا کہ اس کے جسم کو تھکا ہوا اور دماغ کو گٹھل بنا دیا تھا۔ باوجود درختوں کے ہلنے کے ایک پر رمز اور گراں بار خاموشی مسلط معلوم ہوتی تھی جس میں دور سے کسی خوانچے والے کی آواز وحشت کا اضافہ کر دیتی تھی۔ گھڑی کی ٹک ٹک ایک جانکاہ ہتھوڑے کی طرح کان کے پردے پر پڑ رہی تھی۔ اور ہری مکھی کی بھنبھناہٹ تیز لمبی سلاخوں کی طرح دماغ میں گھس کر اسے بے حس کر چکی تھی۔ جماہیاں ٹوٹی پڑتی تھیں اور آنکھوں سے پانی ڈھلکنے لگا تھا۔ کروٹوں پر کروٹیں بدلنے اور سر کے بال نوچنے پر بھی نیند نہ آ رہی تھی۔ کچھ ایسا احساس ہو رہا تھا گویا موسم کی سختیوں نے ہر چیز کو برباد کر دیا ہے۔ خاتمہ کر دیا ہے۔ سکون کا بھی اور نیند کا بھی۔ ٹانگیں پتھر کی ہو گئی تھیں۔ اور رانوں میں ٹیسیں سی اٹھ رہی تھیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد جمیل خاموش سیدھا لیٹ جاتا، ہاتھ پھیلا کر اوپر کی طرف، اور ٹانگیں اکڑا کر نیچے کی طرف کھینچتا، اور پھر ڈھیلا چھوڑ دیتا۔ وہ رانوں کو مضبوطی سے پکڑ کر خوب رگڑتا، گویا وہ آج انھیں گھس کر ختم کر دینے پر تلا ہوا ہے۔ جب اس سے بھی اسے چین نہ آتا تو وہ گھٹنے پٹی پر اور بانہہ آنکھوں پر رکھ کر خاموش لیٹ جاتا... تھوڑی دیر سے نذرو کھڑا دلچسپی سے اس کی حالت دیکھ رہا تھا۔ وہ پائینتی کی طرف آیا اور ایک منٹ تک آنکھیں گھما گھما کر دیکھتا رہا اور پھر یک لخت ہنس کر کہنے لگا ''جمیل میاں! تمھارے پاس بیٹھ جاؤں؟''

جمیل کے پیروں میں سے خون بھاگا اور رانوں میں سنسنی پھیلاتا ہوا تیزی سے دماغ میں جا کر کھوپڑی سے کھٹ سے ٹکرایا۔ دل دھڑ دھڑ چلنے لگا۔ کنپٹیوں کی رگیں ابھر آئیں اور درد کرنے لگیں... معلوم ہوتا تھا اس کے جسم کی ہر ہر رگ بغاوت پر اٹھ کھڑی ہوئی ہے۔ خون کے دوران نے اس کی سوچنے کی قوتوں کو معطل کر دیا تھا۔ وہ 'ہاں' کہنے والا تھا کہ باہر سے کسی نے پکارا ''جمیل!''

امتحان کے اندیشوں اور دغدغوں کی جگہ اب چھٹیوں کی بے فکری اور بے خیالی نے لے لی۔ گرمیاں جم چکی تھیں۔ گرمی اب بھی پڑتی تھی، ہوا اب اور تیز ہو گئی تھی مگر نئے موسم کا کسل اور بیگانگی ختم ہو چکی تھی۔

آدھی رات کا وقت تھا کہ کسی چیز کے اس کی ٹانگ کے قریب حرکت کرنے سے جمیل کی آنکھ کھلی۔ وہ چھت پر سو رہا تھا۔ چاند آسمان پر بیچوں بیچ میں تھا اور ہر طرف روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ صحن کے دوسرے کونے سے خالو کے تیز خراٹوں کی متواتر آواز آ رہی تھی، لیکن یہ دیکھ کر اسے تعجب ہوا کہ نذرو کا پلنگ جو شام دور بچھا تھا، اب اس سے ایک گز کے فاصلے پر آ گیا ہے۔ اس نے اپنے پلنگ پر ہر طرف ٹٹولا۔ مگر کوئی چیز نہ دکھائی دی۔ اس نے پھر چادر سے منھ ڈھک لیا۔ تھوڑی دیر خاموش لیٹے

رہنے سے اسے پسینہ آتا معلوم ہوا اور اس نے چادر کو سینے تک کھینچ لیا۔ نیند ایک دفعہ اچٹی تو بس پھر غائب ہی ہوگئی۔ کچھ دیر تو وہ چاند کو آسمان پر کھسکتے ہوئے دیکھتا رہا، اور پھر اس سے اُکتا کر خالو کے خراٹوں پر دل ہی دل میں ہنسنے لگا۔ کیسی آواز نکل رہی ہے۔ اس نے سوچا، جیسے بلیاں لڑ رہی ہوں... یہ تشبیہ اس نے اپنی خالہ سے سیکھی تھی۔ دفعتاً اسے نذرو کی آنکھیں چمکتی ہوئی دکھائی دیں۔

''ابے جاگ رہا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

گاڑھے کی موٹی چادر میں سے نکلے ہوئے منھ نے جواب دیا۔ ''ہاں!''

''یہاں کیسے آ گیا ہے تو؟'' کچھ نہ کچھ کہنے کی غرض سے جمیل نے پوچھ لیا۔

''تو کچھ ہرج ہے؟''

جمیل نے اتنی رات گئے اس کا جواب چانٹے سے دینا مناسب خیال نہ کیا مگر یہ جواب گفتگو کو آگے بڑھانے میں بھی مددگار نہ ہوسکا۔ تھوڑی دیر تک دونوں خاموش لیٹے اپنی پلکیں جھپکاتے رہے۔

نذرو کا ہاتھ اور سینہ بھی چادر سے باہر نکل آیا۔ اس نے کہا ''اجی، کیا چاندنی ہو رہی ہے۔''

''ہوں'' جمیل نے جواب دیا مگر چاہتا وہ بھی تھا کہ اگر نیند نہیں آتی تو کم سے کم باتیں کر کے ہی وقت ٹالا جائے۔

''بڑی سیریں کی ہیں ہم نے بھی دلی میں چاندنی میں۔''

جمیل نے ایسا موضوع تلاش کرنے کی کوشش میں، جس میں کچھ دیر تک باتیں ہوسکیں، ہمیشہ سے زیادہ بے تکلفی سے کہا، ''بڑی بدمعاشیاں کی ہوں گی سالے تم نے دلی میں۔''

''اجی ہم نے؟'' نذرو ہنسا۔ ''اجی ہاں... نہیں... تمھیں تو جمیل میاں کچھ شوق ہی نہیں۔''

''ابے، مجھے شوق! کس بات کا؟''

''یہی سیر ویر، دل لگی۔'' نذرو اپنی کہنی کے سہارے اٹھا اور اس کا ہاتھ جمیل کے پلنگ کی پٹی پر آ گیا۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ ''لاؤ ٹانگیں دبا دوں جمیل میاں۔''

''کیوں، کیا میں کوئی تھکا ہوا ہوں۔''

نذرو کا ہاتھ اس کی ٹانگ کے قریب آ گیا، ''نا ویسے ہی۔''

''ہونھ!'' جمیل نے جھینپتے ہوئے کہا۔ لیکن جب نذرو کا ہاتھ اس کی ران پر پہنچ گیا تو اس نے کوئی اعتراض کیا بھی نہیں اور چپ لیٹا رہا۔

ہاتھ ران پر آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ جمیل کی ٹانگوں پر چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی معلوم ہوئیں اور

نذرو کی انگلیوں کے ساتھ ساتھ اس کا خون بھی جلنے لگا۔ جب انگلیاں زیادہ سریع الحس حصوں پر پہنچیں تو اس کے گدگدی ہونے لگی۔ اور اس نے نذرو کا ہاتھ ہلکے سے پکڑ کر، بغیر اسے ہٹانے کی کوشش کے 'ابے' کہا مگر ہاتھ اسی طرح چلتا رہا۔

خالو کے خراٹے رک گئے۔ ہاتھ کھینچ لیا گیا۔

پھر وہی خرخرخرخر... ران پھر سہلائی جانے لگی۔

یک لخت نذرو نے ہاتھ کھینچ لیا اور چادر سے اپنے جسم کو کندھوں تک ڈھک کر سیدھا لیٹ گیا۔ اس کا بدن تیر کی طرح کھنچا ہوا تھا۔ نتھنے پھڑ پھڑا رہے تھے اور پلکیں جلدی جلدی جھپک رہی تھیں۔ اگر جمیل اس کا چہرہ چھو کر دیکھتا تو اسے معلوم ہوتا کہ وہ کتنا گرم ہے۔

''ابے یہ کیا؟''

''اجی تم کیا جانو، تم نے کیا کر دیا''۔ نذرو نے رکتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

جمیل حیرت زدہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ دس منٹ بعد نذرو پھر سیدھا ہوا۔ اب اس کے چہرے سے ایسا سکون ظاہر ہوتا تھا گویا کوئی طوفان چڑھ کر اتر گیا ہو۔

جمیل کی ران پھر سہلائی جانے لگی... جمیل کے بدن میں کھلبلی سی ہوئی۔ سر چکرا سا گیا۔ سارا جسم پھنکنے لگا۔ اسے ایک پھریری سی آئی اور وہ نذرو کا ہاتھ الگ پھینک کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے جلدی سے نالی پر جا کر پیشاب کیا۔ پانی پی کر اس نے تھوکا اور اب سونے کے ارادے سے چادر تان کر لیٹ گیا۔ خالو کے خراٹوں سے اس پر جلدی ہی غنودگی طاری ہوگئی۔

اس کی ٹانگ پر کوئی چیز ہلی۔ اس نے چادر سے سر نکال کر دیکھا، نذرو کا ہاتھ تھا۔ نذرو اپنے پلنگ پر سے آگے جھکا ہوا تھا، اور اس کی آنکھیں گول گول گھوم رہی تھیں۔

نذرو نے کہا، ''آ جاؤں؟''

جمیل کے پیٹ میں ایک ہیجان سا پیدا ہوا جو بجلی کی سرعت سے تمام جسم میں پھیل گیا۔ اس کا سر گھوما۔ آنکھوں کے سامنے دھند سی پھیل گئی اور سائبان کے کھمبے اور ان کے لمبے سائے ناچتے ہوئے معلوم ہونے لگے۔ اس کے رُکے ہوئے حلق سے پھنسے ہوئے صرف دو لفظ نکل سکے ''ابے ہٹ!''

انگڑائی

ممتاز شیریں

''آپا، گلنال آپا! وہ دیکھو مجھ فنا...'' جاوید ننھے ننھے ہاتھوں سے میری ساری کھینچ رہا تھا۔

''ارے ہٹ بھی۔ جب دیکھو آپا آپا... دیکھ تو میری ساری کا ناس کیے دے رہا ہے۔ سفید ساری کل ہی تو پہنی تھی۔ اور یہ دھول میں اٹے ہوئے ہاتھ! مٹی سے کھیل رہا تھا کیا بدتمیز!'' میں نے غصہ سے اس کے ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔ اس نے رونی صورت بنالی۔ ''نیں تو آپا... مچھ فنا نچھ ہمالے لوڈ پل...'' اس نے سسکتے ہوئے کہا۔ ''انھیں بلاؤ نا... مچھ فنا نچھ کتنی اچھی ہیں۔ اچھ دن مجھے کیک دیا تھا اول کوکو... کچھی اچھی کوکو... آپا انھیں بلالو اچھی آپا۔''

''ارے!'' میں چونک پڑی۔ ''مس فنانس یہاں!'' میں نے دریچہ کی طرف نگاہ ڈالی، ہاں وہ سچ مچ کچھ دور پر کسی عورت سے باتیں کرتی ہوئی آ رہی تھیں۔ ''تو انھیں بلالوں؟'' میں نے سوچا۔ پھر جلدی سے کمرہ کا جائزہ لینے لگی۔ کتابیں بکھری ہوئی اور فرنیچر! ایک کرسی دیوار کی طرف منھ کیے کونے میں پڑی ہے۔ تو ایک کمرے کے عین بیچ میں، گویا اپنی پالش سے بے نیازی پر نازاں بیٹھی ہو۔ اور صوفہ! ہونھ، یہ بڑا سا سوراخ اور اس میں سے میلی میلی روئی جھانکتی ہوئی... ٹیبل کلاتھ؟ اس پر تو جاوید نے بڑے ہی خوشنما نقش بنا رکھے ہیں۔ اور سیاہی کے برتنے میں تو بڑی فیاضی دکھائی ہے۔ میرے اللہ! ایک چیز بھی سلیقہ کی ہے؟ اُف کس بدتمیز نے فرش پر کاغذ بکھیرے ہیں؟ ایسے شریر بچے بھی کسی کے ہوتے ہیں؟ اور یہ دھول کی ایک انچ موٹی تہہ! یہ

کریمن بھی کہاں مرگئی؟ کم بخت سے یہ بھی نہیں ہوتا کہ صبح صبح کمروں میں جھاڑو دے دیا کرے۔

''کریمن! او کریمن ذرا جھاڑن لیتی آنا! کیا تم نے یہ دھول بیچنے کے لیے جمع کر رکھی ہے؟''

''آئی بی بی! ابھی آئی۔ ذرا توے سے روٹی تو اتارلوں، جل جائے گی۔'' بھاڑ میں جائے وہ اور اس کی روٹی۔ کمبخت ہر وقت چولھے میں گھسی رہتی ہے... آخر میں کیوں اتنا جل رہی تھی۔ مجھے خود شرم آنے لگی۔ بے چاری غریب کیا کرے ایک ہی تو تھی اور گھر کا سارا کام اسی کے سر۔ ہم ایسے کوئی امیر تو نہ تھے کہ دس نوکر رکھتے۔ ایک بھی غنیمت ہے۔

میں نے جلدی سے ٹیبل کلاتھ بدلا اور کرسیوں کو اپنی اپنی جگہ گھسیٹ کر فرش پر بکھرے ہوئے کاغذ سمیٹنے لگی۔ سمیٹتے سمیٹتے اٹھ کر کھڑکی پر نظر ڈالی تو میری سانس جیسے رک گئی۔ اُف مس فنانس کتنی نزدیک آ گئی تھیں! ''ذکیہ! زبیدہ!'' میں حلق پھاڑ چلائی، جواب ندارد! دروازے میں جا کر دیکھا تو بس جل ہی گئی۔ دونوں آنگن میں موجود! ذکیہ جاوید کو اٹھائے کھڑی تھی تو زبیدہ گیٹ پر چڑھی ہوئی گردن بڑھا بڑھا کر مس فنانس کو دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''ذکیہ! کچھ مدد بھی کرو گی؟ شرم نہیں آتی تمھیں یوں باہر کھڑی ہو۔''

''خفا کیوں ہوتی ہو آپا! میں ہمیشہ گیٹ میں تھوڑے ہی کھڑی ہوتی ہوں؟ یونھی آج''... پھر وہ میرے پھولے ہوئے چہرہ کو دیکھ کر ہنسی پڑی۔''اخاہ، آپا! آج تو آپ کے غصہ کا پارہ سوڈگری پر چڑھا ہوا ہے۔ اہاہا، ابھی اُتارے دیتی ہوں۔ اپنی آپا کا ٹمپریچر۔ دیکھو نا، ایسے مزے کی بات بتاؤں گی۔'' منھ بنا کر تالی بجاتے ہوئے،''بتادوں آپا؟... او... اوں... مس فنانس یہاں سے گزر رہی ہیں۔''

''یہ تو معلوم ہی ہے، اچھا آؤ ذرا کمرے کو صاف کرنے میں مدد دو، تمھیں تو بس باتیں ہی آتی ہیں۔'' میں نے بے پروائی سے کہا۔

''تو آپا مس فنانس کو بلاؤ گی؟'' اس نے خوشی سے اُچھلتے ہوئے کہا۔ زبیدہ بھی ناچ رہی تھی۔ اوہ! ابھی تک یہ بچے مس فنانس کو اتنا چاہتے ہیں!

ذکیہ پھر دروازے کی جانب تکنے لگی۔ میں بھنا گئی۔ کاغذ سارے کمرے میں پھیلے پڑے تھے۔

''ہونھ! میں نہیں بلاؤں گی! دیکھوتو گھر کتنا صاف ہے۔''میں نے جھنجھلا کر سمیٹتے ہوئے کاغذوں کو زمین پر دے مارا۔

''کیا کہہ رہی ہو آپا؟ ذکیہ تعجب سے میرا منھ تکنے لگی۔ میں نے اس کی طرف توجہ کیے بغیر زبیدہ کو پکارنا شروع کیا، ''زبیدہ! آجاؤ اندر۔''

''کیوں آپا؟'' زبیدہ نے اندر آتے ہوئے پوچھا۔

''آجاؤ! اگر مس فنانس تمھیں دیکھ لیں تو انھیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ ہمارا ہی گھر ہے اور وہ یقیناً مجھ سے ملنے آئیں گی۔''میں نے جاوید کو بھی اندر گھسیٹتے ہوئے جواب دیا۔

''یہ تو اور اچھا ہوگا، وہ کیوں نہ آئیں آپا؟''

''گو یا تم نے گھر کو بہت اچھی طرح سجا رکھا ہے!''

''ہم ابھی سب ٹھیک کر دیں گے انھیں آنے دو آپا!'' دونوں نے نہایت اشتیاق سے التجا کی۔

''کہہ جو دیا کہ نہیں بلائیں گے۔''

''اور آپا! مس فنانس! اور اتنے دنوں کے بعد انھیں دیکھنا نصیب ہوا۔ آخر تمھیں کالج چھوڑے ہوئے دو تین ماہ ہو گئے نا؟ اتنے دنوں بعد اتفاقاً وہ خود ہمارے شہر میں آئیں، ہمارے گھر پر سے گذریں اور تم!... تم انھیں نہ بلاؤ۔ آپا تم تو مس فنانس پر،'' ذکیہ سنجیدہ لہجہ میں کہتی کہتی یکا یک زور سے ہنس پڑی اور شرارت آمیز نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

''ہوں! اچھا میں جان گئی... جب سے پرویز بھیا...''

''اری چپ! بہت باتیں بنانے لگی ہے۔''میں نے زور سے اس کے ایک چٹکی لی۔

''ہونھ آپا! تم بہت بنتی ہو۔ ابھی دیکھو نا پرویز کا نام آتے ہی کیسے شرما گئیں۔'' میں یونھی شرماتی لجاتی، سمٹی سمٹائی سب کچھ بھول کر وہیں کھڑی رہی گویا اس نام نے مجھ پر جادو کر دیا ہو۔ کیسا حسین نام ہے۔ کتنا پیارا نام ہے! پرویز!

میں اس شیریں تصور سے چونکی تو سامنے کیا دیکھتی ہوں، دروازے کے کواڑ کھلے پڑے ہیں، پردہ ہوا سے اُڑا جا رہا ہے اور مس فنانس ہمارے گھر کے بالکل مقابل میں کھڑی مجھے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی ہیں۔ جوں ہی میں نے انھیں دیکھا وہ مسکرا کر ہمارے گھر کی طرف بڑھنے لگیں۔

''یا اللہ! اب کیا کیا جائے؟'' میں ذکیہ کو جھنجوڑنے لگی۔ ''اب تم ہی سب کچھ دیکھ لو۔ دیکھو وہ آرہی ہیں۔'' میں بے تحاشا وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی اور اپنے کمرے میں جا کر دم لیا۔ کچھ دیر کے بعد میں نے جھانک کر دیکھا مس فنانس برآمدنے کے بازو والے کمرے میں کرسی پر بیٹھی تھیں اور ذکیہ ایک خوشنما برتن میں کیلے اور سنگترے لیے ہوئے ان کے پاس کھڑی تھی۔ ''گلنار کو بلاؤنا'' مس فنانس کہہ رہی تھیں، اچانک انھوں نے مجھے جھانکتے ہوئے دیکھ لیا، اور مسکرا کر آواز دی، ''گلنار!'' میں شرما کر دروازے کی اوٹ میں ہوگئی... میرے یوں شرما جانے سے وہ کیا سمجھی ہوں گی؟ یہی نا کہ میرے جذبات ان کی طرف اب بھی ایسے ہی ہیں۔ ہونھ! انھیں کیا معلوم کہ میں اب... مگر انھیں یہ غلط فہمی ضرور ہوگی۔ میں پہلے تو ان کے سامنے یوں ہی شرمایا کرتی تھی۔ جب وہ کہیں سے آنکلتیں تو میں بھاگ کر کہیں جا چھپتی۔ وہ میری طرف دیکھتیں تو دونوں ہاتھوں میں منھ چھپا لیتی، گو دل تو یہی چاہتا کہ وہ یوں ہی دیکھتی رہیں۔ عجیب لڑکی تھی کچھ سال پہلے! رفتہ رفتہ میں ان سے کھل کر بات کرنے لگی تھی۔ پھر بھی جب کبھی ان سے اچانک مڈبھیڑ ہوجاتی تو میری بدحواسی نہ پوچھیے۔ وہ دن بھی کیا دن تھے! چھٹی ہونے پر کالج کے برآمدے میں گھنٹوں ان کا انتظار کرنا میرا معمول تھا۔ ہفتہ بھر میں جس دن ان کا گھنٹہ نہ ہوتا، وہ دن کس قدر منحوس دکھائی دیتا تھا! ہاں میں ان پر مرتی تھی، انھیں دیوانگی کی حد تک چاہتی تھی۔ اور لڑکیاں کیسے مجھے تنگ کرتی تھیں ''گلنار! نہ جانے تم کیوں مس فنانس پر مرتی ہو، وہ کون سی ایسی حسین ہیں کہ بلکہ انھیں بدصورت بھی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔'' جی چاہتا ان چڑیلوں کے منھ نوچ لوں۔ انھیں کیا معلوم کہ وہ مجھے کیسی حسین نظر آتی تھیں! دوسری لڑکیاں تو کیا میں زرینہ سے بھی اس دن خفا ہوکر روٹھ گئی تھی گو زرینہ میری سب سے پیاری سہیلی تھی۔ ہاں اس دن میں نے کالی ساڑھی پہن رکھی تھی، اور پربھا سے سادو مانگ کر سیاہ، بوٹو، بھی لگا یا تھا۔ میں اور زرینہ ہاسٹل کے کامپاؤنڈ میں ٹہل رہے تھے۔ اندرا بھی کہیں سے آنکلی۔ ''اہا۔ آج تو تم بلا کی حسین نظر آرہی ہو گلنار!''

مس فنانس کی سی؟'' میرے منھ سے بے اختیار نکل گیا تھا۔

''ہونھ! مس فنانس!'' زرینہ نے طنز سے کہا تھا۔ ''مس فنانس! وہ تین دفعہ مر کر جنم لیں تو شاید تمھارا حسن انھیں نصیب ہو!'' مجھے کتنا غصہ آیا تھا اس پر۔

''اوہ روٹھ گئی گل؟ اچھا بھئی وہ تجھ سے پانچ گنا زیادہ حسین ہیں! خوش ہوگئی اب تو؟'' پھر وہ قہقہہ پر قہقہہ لگانے لگی۔ اور اندرا بھی مسکرانے لگی۔ جی میں آیا زرینہ سے لڑ پڑوں، آخر وہ

کون ہوئی مس فنانس کی توہین کرنے والی! یہاں میرا جی جل رہا ہے اور وہ یوں کھڑی ہنس رہی ہے! اگر ایک بات بھی ان کے خلاف کہی جاتی تو میں زرینہ سے تو کیا کالج بھر کی لڑکیوں سے لڑنے کے لیے تیار تھی۔ بھلا میں ایک ہی تھی، کئی لڑکیاں میرا ساتھ دیتیں۔ اور بھی تو بہت سی لڑکیاں انھیں چاہتی تھیں۔ للیتا، غریب لڑکی وہ تو مجھی کو ان کی محبت کا حق دار سمجھتی۔ میرے راستے میں کوئی رکاوٹ نہ پیدا کرتی بلکہ مس فنانس کو مجھ سے محبت کرتے دیکھ کر اور خوش ہوتی۔ کیسی بے لوث لڑکی تھی! اس کے برخلاف وہ لکشمی! حسد کی پتلی! کیا کیا جتن نہ کرتی تھی کہ مس فنانس کی توجہ میری بجائے اس پر ہو۔ نہ جانے کہاں سے لاتی تھی ایسی خوبصورت ساریاں اور انھیں کس سلیقہ سے پہننے کی کوشش کرتی۔ جھوٹے موتیوں سے طرح طرح کے زیور بنا کر پہنا کرتی اور بعد میں تو اس نے برقی مشین سے اپنے بالوں کو گھنگھریالے بھی بنا لیا تھا، ہونھ۔ ان سب جتنوں سے کیا ہوتا وہ حسین تو تھی نہیں۔ مس فنانس مجھی کو دیکھا کرتیں۔ وہ جل مرتی۔ مس فنانس کے خاص سبجیکٹ پر تو وہ دنیا بھر کی کتابیں پڑھتی۔ مگر کہیں مجھ سے اچھا لکھ سکتی تھی! مجھ سے زیادہ نمبر بھی کبھی لیے تھے؟ آخر کچھ بن نہ پڑتا تو مجھ سے خوب جلا کرتی اور ہمیشہ اسی کوشش میں لگی رہتی کہ ایسی باتیں کرے جن سے میرے دل کو ٹھیس لگے، یہ دیکھ کر کہ میں حسین سمجھی جاتی تھی وہ کیسے کڑھتی تھی۔ کہا کرتی ''ہونھ! سرخ وسفید رنگ کے بغیر بھی کوئی حسین کہا جا سکتا ہے۔ دراز قد اور چھریرا بدن تو حسن کے ضروری جزو ہیں۔'' وہ خود بھی گوری تو نہ تھی لیکن تھی دراز قد اور دبلی پتلی مگر اس کے چھریرے بدن میں خاک بھی حسن نہ تھا۔ وہ ایسے دکھائی دیتی تھی گویا ایک لانبی سی لکڑی کو تراش کر صاف کر دیا گیا ہو، نہ وہ بدن کے دلکش نشیب و فراز، نہ کوئی لچک، نہ کوئی ادا، چپٹی بے جان لکڑی! جی چاہتا منھ توڑ جواب دوں۔ ''ہونھ! خوبصورتی کے لیے دلکش نقش صبیح رنگ سے زیادہ ضروری ہیں اور بھرا ہوا گول بدن اتنا ہی خوبصورت ہوتا ہے جتنا نازک جسم بلکہ اس سے کہیں زیادہ دلکش۔'' مگر مسکرا کر چپ ہو رہتی اور یہ ظاہر نہ ہونے دیتی کہ میں اس کے طعن کو سمجھ گئی ہوں۔ کبھی وہ کسی کی گوری رنگت والی لڑکی کو دکھا کر کہتی، ''دیکھو گلنار وہ لڑکی کیسی حسین ہے۔'' اور اس کی بتائی ہوئی لڑکی، اتنی بدصورت، اتنی کریہہ صورت ہوتی کہ میں بے اختیار ہنس پڑتی؛ نکٹی ناک، پھیلے ہوئے نتھنے، بے حد موٹے ہونٹ، بھدا جسم، مگر ہاں سفید رنگت! میں ہنس کر کہتی، ''تمھاری حسن شناسی کی داد دیتی ہوں۔'' جب ان باتوں سے کام نہ چلتا تو سیدھی ذاتیات پر اتر آتی اور بار بار مجھے 'کالی' کہتی حالاں کہ میرا رنگ اچھا خاصہ گندمی تھا... اور زینت وہ تو مس فنانس کے پیچھے ہی لگی رہتی تھی۔ کیسی

سادگی سے شکایت کرتی تھی، ''گلنار! مس فنانس توتمھیں کو زیادہ چاہتی ہیں۔'' اور وہ بیحد موٹی لڑکی، لڑکی نہیں بلکہ عورت... وہ بھی تو انھیں کا دم بھرا کرتی تھی! اور اپنی محبت کیسی عجیب طرح سے جتایا کرتی تھی۔ مس فنانس کو بھی بے اختیار ہنسی آجاتی اور نلینی...

''گلنار بی بی!''

''کیا ہے کریمن؟''

''بیگم نے میٹھے ٹکڑے اور سموسے بنانے کے لیے کہا ہے۔ وہ جو کوئی مس صاحب آئی ہیں نا!''

''بہت کام ہے بیٹی، ذرا اس روٹی کے ٹکڑے تو کاٹ لو۔ اچھی بیٹی عمر بھر دعا دیتی رہوں گی۔''

میں نے کواڑ کھولے اور آہستہ آہستہ سے جھانک کر دیکھا کہ کہیں مس فنانس ادھر دیکھ تو نہیں رہی ہیں؟ امی بھی پاس ہی بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ امی سے باتیں کرنے میں مشغول تھیں۔ میں نظر بچا کر جلدی سے باورچی خانہ میں چلی آئی۔ چاقو کو اچھی طرح صاف کرکے روٹی کاٹنے بیٹھ گئی۔ کریمن نے گلا ہوا قیمہ چولھے پر رکھا اور اس میں نمک مرچ پیاز ڈال کر بھوننے لگی... تو یہ میٹھے ٹکڑے پکائے جا رہے ہیں۔ یہ انھیں بہت مرغوب تھے نا! اور میں نے کتنی دفعہ میٹھے ٹکڑے اپنے ہاتھوں سے پکا کر انھیں بھیجے تھے۔ ان دنوں وہ یہیں کالج میں پروفیسر تھیں اور جب ان کا ٹرانسفر ہوا تھا تو میں کتنا روئی تھی! وہ منا رہی تھیں، تسلی دے رہی تھیں اور میں روتی جاتی تھی... پھر میں نے رودھو کر ابا کو مجھے اسی جگہ بھیجنے پر رضامند کرلیا جہاں مس فنانس کام کر رہی تھیں اور ان سے جا ملی تھی۔ دیکھتے دیکھتے دو سال یونہی گذر گئے۔ مجھے اس کالج کا آخری امتحان دینا تھا اور اس کے بعد مس فنانس سے دائمی جدائی! میں اس کا خیال بھی نہ کرسکتی تھی۔ کاش اس کالج میں ایم۔اے کا کورس بھی ہوتا اور میں دو اور سال ان کے ساتھ رہ سکتی! پھر میں نے اس مرتبہ فیل ہونے کی ٹھان لی تھی۔ ایک ایسی لڑکی کے لیے جو جماعت میں ہمیشہ اول آیا کرتی ہو، فیل ہونا کتنی شرم کی بات تھی۔ اس بات کا مجھے خیال تک نہ آتا تھا۔ پروفیسروں نے مجھ سے کتنی امیدیں باندھ رکھی تھیں، میں کانوکیشن میں بہت سے تمغے اور انعامات حاصل کروں گی۔ سب لڑکیوں میں اول آنا تو میرا معمول تھا، اس کے الگ تمغے ملیں گے۔ سوشیالوجی اور انگریزی میں تو ریاست بھر میں اول رہوں گی۔ لڑکے دیکھتے کے دیکھتے رہ جائیں گے۔ اور کالج کا نام کیسے چمکے گا، ان کی امیدوں پر

پانی پھرنے کی مجھے پروا نہ تھی۔
آخر وہ دن آ گیا جب امتحان ختم ہو چکا تھا اور میں مس فنانس سے آخری بار ملی تھی۔ انھیں خدا حافظ کہہ کر جب ہاسٹل لوٹی تو سیدھے اپنے کمرے میں جا کر بستر پر گر پڑی اور تکیوں میں منھ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اتنا کہ آنکھیں سرخ ہو گئیں اور تکیہ پوش بھیگ گیا۔ پھر جب زرینہ آئی تو اس نے مجھے گلے لگا لیا اور تسلی دینی شروع کی۔ وہ جتنا مناتی تھی میں اور زیادہ روتی جاتی تھی۔ اس رات زرینہ کتنی دیر تک میرے پاس بیٹھی سمجھاتی رہی یہاں تک کہ میری آنکھیں جو رونے کی وجہ سے بری طرح جل رہی تھیں، نیند کے غلبے سے بند ہونے لگیں۔ کتنی محبت کرنے والی لڑکی تھی زرینہ!

''تو تم نے ٹکڑے کاٹ لیے بیٹی؟ ادھر لاؤ انھیں میں گھی میں بھون دوں اور اچھی بیٹی ذرا ان پوریوں میں قیمہ بھر کے سموسے بنا لینا۔ بیگم نے جلدی تیار کرنے کا حکم دیا۔ کیا کروں بیٹی! تم دیکھتی ہو بہت بوڑھی ہو گئی ہوں۔ ہاتھ سے زیادہ کام نہیں بن پڑتا۔ ورنہ میں تمھیں کام کرنے کو کہتی، توبہ توبہ اس بوڑھے منھ میں کیڑے نہ پڑ جاتے یہ نازک نازک ہاتھ جو صرف قلم پکڑتے تھے، ان کو میں، موئی نوکرانی، کام کرتے دیکھتی! آنکھیں نہ پھوٹ جاتیں!'' بوڑھی کریمن خوشامد کرنے لگی، میں بغیر جواب دیے، قیمہ بھر کر سموسے بنانے لگی۔

وہ خود بھی مجھے کتنا چاہتی تھیں۔ کئی بار انھوں نے مجھے اپنے گھر پر بلایا تھا اور کتنا اصرار کرتی تھیں کہ میں ان کے ساتھ سیر کو جایا کروں۔ اس دن ان کی آواز میں کیسی التجا تھی، ''صرف ایک بار آ جاؤ گلنار! میں تمھیں اپنی کار میں گھما لاؤں گی۔ فلاں فلاں گارڈن لے جاؤں گی۔'' میں نے بصد ناز ان کی التجا کو ٹھکرا دیا تھا... اور اپنے پرچوں میں مجھے کتنے زیادہ مارکس دے دیتی تھیں، اسی پچاسی فیصدی! یہ دیکھ کر لڑکیاں مجھ سے بہت جلتیں، کہا کرتیں، ''آخر تم تو ان کی فیوریٹ ہو نا! ہمیں کہاں سے ملیں اتنے نمبر''... میرا نام اس چٹخارے سے لیتی تھیں گویا ان کے منھ میں لذیذ مٹھائی رکھی ہو۔ جب میری طرف دیکھ کر مسکراتی تھیں تو ان کا تبسم کتنا محبت آمیز ہوتا تھا۔ میرے دل میں بے اختیار یہ خواہش پیدا ہوتی کہ انھیں مس فنانس کی بجائے 'اینجلنا' کہا کروں یا کم از کم ایک بار چپکے سے کہہ دوں 'میری اینجلنا'۔ مگر مجھے کبھی جرأت نہ ہوئی تھی۔ ان کے سامنے کہتی نہیں تھی تو کیا خطوں میں تو جو جی میں آیا لکھ دیتی تھی۔ میرے دل کی ملکہ، میری جان، ملکۂ حسن، میری آسمانی، اینجلنا، اور کیا کچھ نہیں لکھا کرتی تھی۔ عجیب رومان بھرے خط لکھا کرتی تھی میں تو! اور وہ

کبھی خفا نہ ہوتی تھیں۔ انھوں نے بھی تو ایک دن... اس دن میں اور للتا ان کے ساتھ کار کی پچھلی سیٹ میں بیٹھی تھیں، باتوں میں للتا نے پوچھا تھا، ''مس فنانس آپ گھوڑے کی سواری جانتی ہیں؟''

''نہیں،'' انھوں نے جواب دیا۔ ''مگر بہت دنوں سے سیکھنے کی خواہش ہے۔ اور اس کے لیے رائڈنگ سوٹ بھی سلانے والی ہوں۔'' اور پھر اچانک میری طرف مخاطب ہو کر کہا، ''کوٹ اور پتلون گلنار!'' اس انداز سے کہا تھا کہ میں شرم سے پانی پانی ہوگئی تھی۔ ''میں تو اس سوٹ میں بالکل مرد معلوم ہوں گی نا؟'' میں دونوں ہاتھوں میں منھ چھپائے بیٹھی رہی۔ ہاں ان میں کچھ کچھ مردانہ جھلک بھی تو تھی۔ بہت دراز قد، چوڑا چکلا سینہ، اور ایسی نظروں سے دیکھتی تھیں کہ میں بے اختیار شرما جاتی۔ خواہ وہ کتنی ہی لڑکیوں کی بھیڑ میں کھڑی ہوں، وہ باتیں تو اور لڑکیوں سے کر رہی ہوتیں مگر نظر مجھی پر جمی ہوتی اور نارنجی ساری میں وہ کیسی بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ شاید ساری کی عکس کی وجہ سے چہرہ کا رنگ سنہری ہو جاتا اور رخساروں پر ہلکی سرخی جس میں کچھ نیلاہٹ کی آمیزش بھی ہوتی... اور دور سے تو چیچک کے داغ بھی دکھائی نہیں دیتے تھے۔

میں نے سموسوں کی سینی کریمن کے آگے رکھ دی۔ کریمن انھیں تلنے لگی۔ اب کہیں فرصت ملی ان کاموں سے! اتنی دیر چولھے کے پاس بیٹھنے سے بہت گرمی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے ٹھنڈے پانی سے منہ ہاتھ دھوئے، ساری کے آنچل سے انھیں خشک کرتے ہوئے پھر اس کمرے کی طرف نگاہ دوڑائی جہاں مس فنانس بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہی ساحرانہ مسکراہٹ جو مجھ پر جادو سا کر دیتی تھی۔ اب میں بخوشی ان کے پاس جانے کو تیار تھی۔ دفعتاً میری نظر ساری پر پڑی۔ جگہ جگہ مٹی لگی ہوئی تھی۔ اور جاوید کے ہاتھوں کے نشان صاف نظر آرہے تے۔ میں یہ ساری پہن کر کیسے جاسکوں گی؟ اتنے میں زبیدہ آنکلی۔

''زبیدہ!'' میں نے آواز دی۔ توجہ کیے بغیر بھاگی جارہی تھی۔ ''زبیدہ ادھر تو آؤ۔''

''ہونھ! نہیں آؤں گی مجھے مس فنانس کے پاس جانا چاہیے۔''

''میری اچھی منی مان لے گی اپنی آپا کی بات۔ چاکلیٹ دوں گی منی کو!''

''کیا ہے آپا؟'' چاکلیٹ دیکھ کر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

''اچھی منی مجھے الماری میں سے ایک ساری لا دو نا! دیکھو یہ کیسی میلی ہو رہی ہے۔ مس فنانس کے پاس یہ پہن کر کیسے جاؤں۔ یہ لو الماری کی کنجیاں!''

''ہاں آپا، جلدی جاؤ مس فنانس بار بار تمھیں یاد کر رہی ہیں۔''

تو وہ اب بھی مجھے چاہتی ہیں؟ ہاں شاید دو ماہ پہلے میں نے ایک لڑکی کے ذریعہ انھیں خط بھیجا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا تھا نا کہ وہ خط پا کر کیسے خوش ہوگئی تھیں اور اس دن بھی تو وہ خوشی سے دیوانی ہوئی جا رہی تھیں نا جب میں اطلاع دیے بغیر اچانک اس کالج میں آ گئی تھی جہاں وہ اب کام کر رہی تھیں۔ میں ایک ایسی جگہ چھپ گئی تھی جہاں سے میں تو انھیں دیکھ سکتی تھی مگر وہ مجھے نہ دیکھ سکتی تھیں۔ اور ایک لڑکی کو ان کے پاس بھیجا تھا کہ انھیں اطلاع کر دے۔ میں اس کالج میں داخلے کے لیے آئی ہوں۔ انھوں نے فرطِ مسرت سے کئی بار میرا نام دہرایا تھا۔ ''گلنار! گلنار! گلنار! یہاں! سچ کہو۔'' لڑکی نے انھیں یقین دلایا۔ ''وہ کہاں ہیں بتاؤ نا؟'' لڑکی انھیں بتا رہی تھی میں کس جگہ ہوں مگر وہ دیکھے بغیر ''گلنار! گلنار، تم کہاں ہو؟'' کہتی ہوئی ہر طرف گھوم رہی تھیں۔ انھیں یوں بے تاب دیکھنے میں بڑا ہی مزہ آیا تھا۔

''لو اللہ اللہ کر کے سب چیزیں تیار ہو گئیں اب میں اس بوڑھے جسم کو ذرا آرام تو دے لوں۔''

کم بخت بوڑھی جب دیکھو بڑبڑاتی رہتی ہے۔ میں جھلا کر رہ گئی۔

''خدا بھلا کرے گلنار بی بی کا مجھ بوڑھی کی کتنی مدد کرتی ہے۔'' کریمن باورچی خانہ میں ٹاٹ بچھا کر وہیں لیٹ گئی۔ ''اہا بیٹی تم یہیں ہو۔ ابھی ابھی یاد کر رہی تھی۔ دیکھا بہت دراز عمر ہوگی۔ میری بی بی کی! اور بیٹی تمہارے لیے کتنی ہی دعائیں میرے منھ سے نکلتی ہیں۔ جھوٹ نہیں کہتی۔ کتنی ہی جگہ کام کیا، پر نا بابا ایسی بچی کہیں نہ دیکھی۔ ذرا سے لونڈے تک مجھے ڈانٹ بتاتے تھے۔ میری بی بی نے تو اب تک ایک سخت لفظ بھی نہ کہا۔ اب تو میرے کام کرنے کے دن گئے۔ اسی لیے تو تمھارے ہاں بھی کام چھوڑ دیا تھا۔ سچ کہتی ہوں بیٹی۔ صرف تمھاری شادی کی خبر سن کر آئی۔ تمھیں ان آنکھوں سے دلہن بنی دیکھوں۔ بہت دنوں سے یہی ارمان ہے۔ خدا کرے بہت اچھا دولہا نصیب ہو۔''

بھلا پرویز سے اچھا دولہا بھی کوئی ہوگا؟ ایک ہلکی سی مسکراہٹ میرے لبوں تک آ گئی۔ میں نے جلدی سے منھ پھیر لیا کہ کہیں کریمن دیکھ نہ لے۔

پھر جیسے دماغ خیالات سے یکلخت خالی ہو گیا ہو۔ اور ان کی جگہ پرویز! پرویز! پرویز! پرویز! اور میں ایک حسین دنیا میں جا پہنچی، جذبات کی ایک رنگین دنیا، ہاں نہایت حسین، کالج اور

مس فنانس والی دنیا سے کہیں زیادہ حسین!

کبھی میں یہ سوچا کرتی تھی کہ میری شادی ہوجائے تو میں اپنے شوہر سے محبت بھی کرسکوں گی۔ ایک دفعہ زرینہ نے جو پامسٹری جانتی تھی میرا ہاتھ دیکھ کر کہا تھا، ''تمھارے شوہر کو تم سے بے حد محبت ہوگی۔'' تو مجھے اپنے اس ہونے والے شوہر پر کتنا رحم آیا تھا کہ میں اس کی محبت کا جواب نہ دے سکوں گی اور اب؟ اب تو میں اپنے پرویز کو دیوانہ وار چاہوں گی۔

''آپا ساری لے لو۔'' میں نے زبیدہ سے ساری لے کر میز پر رکھ دی، اور بال بنانے لگی۔

آخر میں مس فنانس کو کیسے بھلا سکی؟ وہ بھی تو مجھے بہت چاہتی تھیں۔ ہونھ! چاہتی ہوں گی۔ کبھی انھوں نے زبان سے اس کا اظہار بھی کیا تھا؟ میں ساتھ ہوتی تھی تو ڈر کے مارے مری جاتی تھیں۔ ''گلنار! لڑکیاں کیا کہتی ہوں گی؟ گلنار اگر پرنسپل دیکھ لیں تو؟''

لڑکیاں دیکھیں تو دیکھیں کیا ہم نے کوئی جرم کیا تھا کہ یوں ڈریں، اُف رے بزدلی! اور جب ہمارے مضامین کی کاپیاں تصحیح کر کے کلاس میں لاتی تھیں تو میرے لکھے ہوئے نظریوں اور نکتوں کی تو بہت تعریف کرتیں۔ مگر کبھی لڑکیوں کو بتایا بھی تھا کہ یہ میرے پیش کیے ہوئے نکتے ہیں۔ جوابات کے پرچے واپس کرتے ہوئے تو کبھی بھولے سے بھی میرا نام لیا تھا... مگر وہ مجھی کو سب سے زیادہ نمبر دیتی تھیں۔ ہونھ! یہ بھی کوئی بات ہوئی؟ میں تو ہر پرچہ میں اول آتی تھی لیکن کوئی استانی اتنے نمبر نہیں دیتی تھیں۔ مس فنانس تو اسی پچاسی دے دیتی تھیں۔ ہونھ! صرف زیادہ نمبر دے دیے تو کیا ہوا۔ مجھے کتنی خوشی ہوتی اگر وہ کلاس میں لڑکیوں کے سامنے میری تعریف کرتیں اور کہتیں، دیکھو گلنار نے کتنے نمبر لیے ہیں۔ فلاں نمبر نے اتنے مارکس لیے ہیں، فلاں نمبر نے یہ کیا ہے، وہ کیا ہے، فلاں نمبر، فلاں نمبر، میں تو بس 'فلاں نمبر' ہی ہوکر رہ گئی تھی اور وہ مس جونس تھیں آکسفورڈ کی ایم۔اے، وہ تو آدھ آدھ گھنٹے تک میرے مضمون کی تعریف کرتی تھیں۔ گو ان کے جانچنے کا معیار بہت ہی اعلیٰ تھا۔ اور مسز سوشیل! سروجنی نے کہا تھا کہ وہ میرا پرچہ لیے بھاگی بھاگی پھر رہی تھیں۔ ''ماشاءاللہ گلنار نے تو اس دفعہ کمال ہی کر دیا۔ کتنے اچھے جواب ہیں۔ میں نے تو اس پرچہ کو کئی مرتبہ پڑھا۔'' وہ دوسری ٹیچرس اور لڑکیوں کے سامنے ہمیشہ میری تعریف کرتی رہتی تھیں۔ اور مس کملابائی بھی۔ لیڈی ٹیچرس تو کیا مرد پروفیسر بھی میری ذہانت اور قابلیت کی داد دیتے تھے! فقط تھیں تو مس فنانس جو تعریف میں ایک لفظ بھی کہنا شاید اپنی شان کے خلاف سمجھتی

تھیں۔ ہونہہ!

اور میرا دل کیسے چاہتا تھا کہ وہ میرے حسن کی تعریف کریں۔ ہمیشہ نہ سہی کبھی کبھی بے تابی سے کہہ دیں، ''گلنار! تم کتنی حسین ہو!'' کم از کم ایک دفعہ بے اختیار ان کے منھ سے نکل جائے، ''آج تو تم بہت خوبصورت نظر آ رہی ہو گلنار!'' یا یہی سہی، ''یہ ساری تو تمھیں بہت سجتی ہے۔'' میں اس کے لیے کتنے ہی جتن کرتی تھی۔ جس دن ان کا گھنٹہ ہوتا وہی ساریاں پہنتی جو مجھے بھاتی تھیں۔ بالوں کو خاص توجہ سے سنوارتی۔ کبھی کبھی بوٹو لگاتی۔ اچھی اچھی خوش رنگ چوڑیاں پہنتی اور مجھے اپنی کلائیوں اور انگلیوں پر بہت ہی ناز تھا۔ میں اپنے ہاتھ میز پر اس انداز سے ٹیکے رہتی کہ چوڑیاں جم کر کلائیوں پر آ پڑیں۔ اور مس فنانس کی سیٹ سے انگلیوں کی خوبصورتی کا اچھی طرح جائزہ لیا جا سکے... مگر یہ تو ظاہر تھا کہ وہ مجھے حسین سمجھتی تھیں ورنہ یوں نہ تکتی رہتیں۔ اور جب کبھی مجھے محسوس ہوتا کہ آج خصوصیت سے اچھی نظر آ رہی ہوں ایسے موقعوں پر تو وہ مجھے بہت ہی توجہ سے دیکھ رہی ہوتیں۔ ان کی نگاہ مجھ پر سے ہٹتی ہی نہ تھی... اچھا یوں ہی سہی۔ لیکن کیا میں ایک پتھر کا مجسمہ تھی یا نقاش کی کھینچی ہوئی تصویر تھی کہ یوں خاموش داد ملتی۔ آخر میں ایک انسان تھی۔ ایک سترہ سالہ نوخیز لڑکی رومانی اور جذباتی! کبھی تعریف کر دیتیں تو ان کا خزانہ کھو جاتا؟ مانا بھی کہ وہ پروفیسر تھیں، مسز سوشیل بھی تو پروفیسر ہی تھیں۔ کیا وہ میری صورت کی تعریف نہ کرتی تھیں۔ اس دن جب مجھے ایک ٹیابلو میں حصہ لینا تھا جس میں یہ بتایا جانے والا تھا کہ ملکہ نور جہاں رقص اور موسیقی سے لطف اندوز ہو رہی ہے۔ مسز سوشیل میرا میک اپ کرتی ہوئی کیسے سراہتی جاتی تھیں، ''گلنار! نور جہاں کی تمثیل کے لیے تم ہی موزوں ہو۔'' ''تم کیسی اچھی انگریزی لکھتی ہو۔ مسٹر سوشیل بھی تمہارے ہی گن گاتے رہتے ہیں، وہ بھی تمہارے ٹیچر رہ چکے ہیں نا؟'' پوڈر، لپ اسٹک، روج لگا چکنے کے بعد انھوں نے کہا۔ ''اب آنکھیں اوپر اٹھاؤ ان کا میک اپ بھی کر دوں۔'' اور میں نے آنکھیں اٹھائیں تو واللہ کتنی خوبصورت آنکھیں!!'' اور کس شدت سے میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی تھی کہ کاش مسز سوشیل کی بجائے مس فنانس ہوتیں! آخر میں مسز سوشیل کو ہی کیوں نہ چاہتی تھی؟ مس فنانس میں کون سے سرخاب کے پر لگے تھے؟ اور زرینہ بھی تو میری آنکھوں کی تعریف کرتے تھکتی ہی نہ تھی! اور للیتا! وہ تو اشعار لکھا کرتی تھی میری آنکھوں پر! زینی بھی کہا کرتی تھی نا۔ ''گلنار، تم چشمہ نہ پہنا کرو۔ یہ تمھاری حسین آنکھوں کو چھپا دیتا ہے۔'' سبھی تعریف کرتی تھیں۔ اسی لیے تو میں اس کا خاص خیال رکھتی تھی کہ مس فنانس

میری آنکھوں کو دیکھیں اوران کی کلاس میں چشمہ بھی تو اتار کر رکھ دیتی تھی۔

گو مجھے بورڈ پر لکھی ہوئی تحریر پڑھنے میں بہت دقت ہوتی۔ ہونھ! اس بے حس پر کچھ اثر بھی ہوتا تھا؟ مگر پرویز، پرویز کی حسن شناس نگاہیں پہلی ہی نظر میں میری آنکھوں کا حسن دیکھ لیں گی۔ وہ بے اختیار کہہ اٹھیں گے، ''تمھاری آنکھیں، غزالی آنکھیں، کتنی سیاہ! کیسی مدھ بھری!'' کالج ڈے میں، میں نے صرف اس لیے ڈرامہ میں پارٹ کیا تھا کہ مس فنانس دیکھیں 'سینٹ جون' (Saint Joan) کا انتخاب ہوا تھا۔ اور میں جون بنی تھی۔ مجھے کیسی اچھی طرح سنوارا گیا تھا۔ میں خود آئینہ میں اپنی صورت دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ پھر مجھے ہنسی بھی آ گئی۔ جون، ایک دیہاتی لڑکی، پھر ایک قیدی جو کورٹ میں لائی جا رہی تھی۔ کیا اس وقت وہ بنی سنوی ہوگی۔ لیکن یہاں کے فلموں اور اسٹیجوں پر تو صرف یہی خیال رکھا جاتا ہے کہ جو لڑکی ہیروئن کا پارٹ کرے، وہ خوبصورت ہو اور اسے اچھی طرح سنوارا جائے۔ لیکن یہ تو مسز سوشیل اور مس جونس کی غلطی نہ تھی۔ انھوں نے میرا ٹھیک ہی میک اپ کیا تھا۔ مس جونس نے اپنی خاکی رنگ کا رائڈنگ سوٹ مجھے پہنایا تھا۔ خاکی کوٹ اور خاکی پتلون۔ اور میرے لانبے بال پنوں میں لپیٹ کے شانوں پر ڈال دیے گئے تھے۔ بالوں میں کنگھی تک نہ کی تھی۔ بال پیشانی پر اور رخساروں پر نہایت بے ترتیبی سے بکھیر دیے گئے تھے۔ غلطی تو وید یہی کی تھی جس نے ڈیوک اوف وارک کا پارٹ کیا تھا۔ وہ اپنے لبوں پر لپ سٹک لگا رہی تھی۔ ڈرامے کا وقت ہو گیا تھا۔ مجھے جاتی دیکھ کر اس نے ہاتھ پکڑ کر مجھے کھینچ لیا۔ ''ہائے گلنار! یہ کیا؟ تم تو ہیروئن ہو، نہ روز نہ لپ سٹک!'' اس نے جلدی سے میرے ہونٹوں پر لپ سٹک لگا دیا اور گالوں پر روژ مل دیا۔ اور جاتے ہوئے میں نے آئینہ پر نظر ڈالی تو خود ہی ٹھٹک گئی۔ بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے روکھے بال تو اور بھی اچھے لگ رہے تھے۔ مجھے یقین تھا مس فنانس آج میری تعریف ضرور کریں گی بلکہ تعریف کرنے پر مجبور ہو جائیں گی۔ ڈرامے کے اختتام پر مسز سوشیل، مس جونس، مسز ڈینیل، دوڑی ہوئی اسٹیج پر چڑھ آئیں اور پردے کے پیچھے آ کر بڑی گرم جوشی سے میرا ہاتھ دباتے ہوئے مجھے مبارک باد دی کہ میں نے جون کے سے مشکل پارٹ کو بہت اچھی طرح نبھایا تھا۔ سب میری اداکاری پر عش عش کر رہے تھے۔ یہ سب کچھ اور مس فنانس؟ انھوں نے حاضرین میں شامل ہو کر ڈرامہ دیکھا تک نہیں۔ پردے کے پیچھے کھڑی ہو کر اداکار لڑکیوں کو ہدایات دیتی رہیں۔ میں نے کتنی التجا کے ساتھ کہا تھا کہ حاضرین میں بیٹھ کر ڈرامہ دیکھیں۔ ان کے دونوں شانے پکڑ کر نہایت ملتجی نگاہوں سے

انھیں دیکھا تھا۔ میری یہ ملتجی نگاہیں تو پتھر سے دل کو پگھلا دیتیں۔ لیکن وہ تو شاید پتھر سے بھی زیادہ بے حس تھیں۔ ''گلنار کیا کروں میں نے اپنے ذمہ یہ کام لیا ہے تو مجھے کرنا ہی ہوگا، واہ رے تمھارا کام! تاہم انھوں نے پردے کے پیچھے سے تو دیکھا تھا۔

اس رات مجھے ہاسٹل لوٹنے میں بہت دیر ہوگئی تھی گو ہاسٹل کالج ہی کے کمپاؤنڈ میں تھی۔ لڑکیاں قدم قدم پر مجھے گھیرے لیتی تھیں۔ گلنار! تم نے تو کمال ہی کر دیا، تمھاری اداکاری کے کیا کہنے۔ ''تم اسٹیج پر کیسی حسین نظر آرہی تھیں گلنار!'' ان سب سے پیچھا چھڑا کر تھکی ہاری ہاسٹل لوٹی۔ زرینہ باہر کھڑی میرا انتظار کر رہی تھی۔ وہ دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ ''میری اچھی گلنار! تم بال کٹوا کر یونہی میک اپ کیا کرونا۔ آج تو تم پری معلوم ہو رہی ہو۔ لیکن بھئی، جون کے لیے تمھارا میک اپ ٹھیک نہ تھا۔ انکویزیٹر (Inquisitor) کہہ رہا تھا۔ "Joan you look very pale today" اور تمھارے گالوں سے شفق پھوٹ رہی تھی!'' ہم دونوں ہنسنے لگے۔ اور ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہم دوڑتے ہوئے ڈائننگ ہال پہنچے۔ سب لڑکیاں کھانے پر بیٹھ چکی تھیں۔ میرے جاتے ہی سبھوں نے تعریفوں کی بوچھار کر دی۔ اور اس رات میں کیسی خوش خوش بستر پر جالیٹی تھی۔ نیند ہی نہ آتی تھی۔ ہونھ! ان سب تعریفوں کی مجھے کیا پروا؟ کل میں اپنی مس فنانس اپنی اینجلنا سے ملوں گی تو وہ یہ کہیں گی۔ یوں تعریف کریں گی۔ دوسری صبح ان اُمنگوں اور امیدوں کو لیے ہوئے گئی تو اپنی اینجلنا کے پاس کیا رکھا تھا؟ ایک جذبات سے عاری چہرہ اور پھیکی بے مزہ باتیں۔ زرینہ سچ کہتی تھی۔ ''گلنار تم اتنی رومانوی لڑکی اور مس فنانس کی سی بے حس اور سرد مہر کہیں تمھارا جوڑ بھی ہے۔ تم تو آگ ہو اور وہ برف۔ ہاں وہ ضرور جذبات سے بالکل عاری تھیں۔ بے حس اور مردہ دل۔ پتھر کا مجسمہ برف کا تودہ! بھلا پرویز سے ان کی کیا مناسبت؟ میرے پرویز کی رگ رگ میں زندگی ہے، بجلی ہے۔ تصویر ہی میں وہ کتنے رومانٹک معلوم ہوتے تھے اور میں نے اس دن چوری سے جھانک کر انھیں دیکھ بھی لیا تھا نا! جب ابا نے انھیں سلامی دینے (نذرانہ پیش کرنے کے لیے) کھانے پر مدعو کیا تھا۔ اس دن بھی زرینہ آئی ہوئی تھی اور جین بھی۔ ''دولہا بھائی آ گئے۔'' زبیدہ کی آواز آئی اور میرا دل کیسے دھڑکنے لگا۔ زرینہ اور جین بھاگ کر کھڑکی میں جا کر کھڑی ہوئیں۔ زرینہ مجھے بھی گھسیٹنے لگی۔ اٹھو گلنار! تم بھی اپنے دولہا کو دیکھ لو نا۔'' میں پہلے تو جھجکی۔ گو میرا جی بے اختیار چاہ رہا تھا کہ انھیں ایک نظر دیکھ لوں۔ ''امی کیا کہیں گی؟'' ''اری امی کی بچی اُٹھ۔ ایسا زریں موقع کھودے گی۔'' زرینہ نے آخر مجھے کھینچ ہی لیا۔ وہ ابا کے سامنے

کیسے شرمائے شرمائے کھڑے تھے۔ پھر جب وہ ہال میں آئے تو ہم نے دروازے کے سوراخوں میں سے جھانکنے کی کوشش کی۔ کمبخت سوراخ کتنے چھوٹے تھے! آخر ہمیں ایک ترکیب سوجھ ہی گئی۔ جین نے ہمارے کمرے کی روشنی گل کردی تاکہ باہر والے ہمیں دیکھ نہ سکیں۔ اور زرینہ نے آہستہ سے چٹخنی کھول کر ایک کواڑ کو ذرا سا کھول دیا۔ پھر کیا تھا جین اور زرینہ دونوں ٹوٹ پڑیں مگر میں جانے کیوں پیچھے ہٹ گئی۔

''بڑا خوبصورت نوجوان ہے گل!'' زرینہ نے فرطِ مسرت سے گلے لگالیا۔ میں نے شرما کر آنکھیں جھکالیں۔ ''میری گل!'' ایسا اچھا جوڑ ہے تیرا اور اس کا''، وہ میرے ٹھوڑی پکڑ کر چہرہ اوپر اٹھاتے ہوئے بولی۔ اس کی آنکھوں سے کیسی محبت ٹپک رہی تھی! وہ پھر جھانکنے لگی۔ فارم بھی بہت اچھا ہے، اور آنکھیں کیسی حسین ہیں۔ ''اِدھر آ تو گل! بڑی آئی کہیں کی امی سے ڈرنے والی۔'' زرینہ مجھے پھر گھسیٹنے لگی۔ ''دیکھا تو نے اپنے پرویز کی آنکھوں کو؟ بخدا تیری آنکھوں کا جواب ہیں وہ تو!'' ہاں میں نے دیکھا سب کچھ دیکھا۔ اس خوبصورت چہرہ کو، ان تبسم آمیز ہونٹوں کو، ان حسین آنکھوں کو جن میں شوخی اور بے تابی کوٹ کوٹ کر بھری تھی... ''اری بڑا رومانٹک معلوم ہوتا ہے گل! تجھ پر دیوانہ نہ ہوجائے تو میرے ذمہ! ابھی سے کہے دیتی ہوں گل، وہ تجھے آنکھوں میں بٹھائے گا، گلے کا ہار بنا لے گا۔'' اور میں وفورِ جذبات سے پھنکی جارہی تھی۔ اس کے بازوؤں میں گر پڑی۔ ''دیوانی، مس فنانس پر مری جاتی تھی۔ آخر تو نے کیا امیدیں باندھ رکھی تھیں اس پتھر کی سی بے حس عورت سے۔ مسرت ہو یا رنج، غصہ ہو یا بے تابی، وہی پھیکا چہرہ، وہی بے نور آنکھیں! پرویز کو دیکھ کتنا اکسپریشن ہے اس کے چہرہ پر، گویا جذبات کی شعاعیں پھوٹ رہی ہیں۔'' ہاں وہ اس وقت مجسم اضطراب نظر آرہے تھے۔ ان کی آنکھیں کس بے تابی سے ادھر اُدھر گھوم رہی تھیں۔ کیوں؟ شاید اس لیے کہ کہیں میں نظر آجاؤں؟

جی بے اختیار چاہ رہا تھا کہ دروازے توڑ دوں، سب کی موجودگی کو فراموش کرتے ہوئے ان کے سامنے جا کھڑی ہوجاؤں... کاش میں کسی پردہ کی آڑ ہی میں کھڑی ہوتی، ایک لمحہ کے لیے پردہ کھسک جاتا اور میں ان کی طرف شوخ نظروں سے دیکھ کر مسکرا دیتی۔ پھر جلدی سے نظریں جھکا کر شرما جاتی اور انھیں دم بخود کردیتی! ہاں وہ ضرور دم بخود ہوجاتے۔ میں اس نیلی جارجٹ کی نقرئی بارڈر والی ساری میں بہت دلکش نظر آرہی تھی نا... ہونھ! میں یہ ساری کیوں پہن کر جاؤں۔ میں جارجٹ کی ساری پہنوں گی جو میرے پرویز کی لائی ہوئی ہے۔ میں نے ساری

کھینچ کر پھینک دی جو ابھی ابھی پہن رہی تھی۔ اور ذکیہ کو آواز دی۔ ذکیہ ایک برتن میں سموسے لیے جارہی تھی۔ ''ذکیہ، ذرا میری نیلی ساری لے آنا وہی جارجٹ کی۔''

''اچھا لے آؤں گی، مگر تم جلدی آنا امی کہہ رہی تھیں کہ وہ مس فنانس کے ساتھ کھانے پر نہیں بیٹھیں گی۔ ان کی بجائے تم بیٹھو تو بہتر ہے۔''

میں نے بے پروائی سے اس کمرے کی طرف نگاہ کی۔ مس فنانس ہاتھ پر ٹھوڑی رکھے اوپر دیکھ رہی تھیں۔ جذبات سے خالی بے نور آنکھیں، بے حد پتلے، پھیکے رنگ کے ہونٹ، زرد چہرہ جس پر چیچک کے داغ ہی داغ تھے۔ مجھے ایسا دکھائی دینے لگا کہ وہ داغ بڑھ رہے ہیں، گہرے ہورہے ہیں اور پھیلتے جارہے ہیں، ان کی صورت کیسی کریہہ ہوتی جارہی تھی! میں جلدی سے اندر کھسک گئی اور سر کو زور سے جھٹکا دیا کہ دماغ پر کھینچی ہوئی تصویر مٹ جائے۔ اس کی جگہ دماغ کے پردہ پر ایک اور تصویر اُبھرنے لگی۔ پرویز کی! وہ خوبصورت نیلی آنکھیں، بڑی بڑی، بادامی، نشیلی، لانبی خمیدہ پلکیں، بیضوی چہرہ، کشادہ حسین پیشانی، اور ہونٹ؟ کتنی حسین تراش تھی ان ہونٹوں کی۔ رسیلے بھرے ہوئے اور کناروں پر وہ ہلکا سا خم گویا وہ مسکرانے کے لیے ہی بنائے گئے ہوں۔ وہ سانولا سانولا رنگ، شیام سندر، ہاں میرے شیام اور میں رادھا! میں نے میز پر رکھی ہوئی تصویر اٹھالی، پرویز کی، اور فرطِ بے تابی سے اسے چوم لیا۔ ''یہی ساری نا؟'' میں نے گھبرا کر تصویر رکھ دی۔ ذکیہ ساری لیے کھڑی تھی۔ ''ہاں یہی۔'' ''آپا جلدی آؤنا۔ سموسے ٹھنڈے ہو رہے ہیں اور یہاں ساریوں پر ساریاں بدلی جارہی ہیں۔ ادھر یہ بے پروائی اور ادھر دیکھو تو بے چاری مس فنانس نے گلنار گلنار ہی کی رٹ لگا رکھی ہے۔''

''اچھا ابھی آئی۔ میں نے پھر تصویر اٹھالی۔ اور سب کچھ بھول کر اسی حسین تصور میں کھو گئی۔ کیسا ہنس مکھ چہرہ۔ آہا یہ ہونٹ، نظر پہلے اِن ہونٹوں پر ہی جا جمتی تھی۔ یہ ہونٹ اور اُف ... کیا خیال آ گیا۔ میں مارے شرم کے عرق عرق ہوگئی۔ میں نے تصویر رکھ دی اور ساری پہننے لگی۔ ان کی شخصیت میں کتنی دلکشی تھی! اُف کس بلا کا سجیلا پن! گٹھا ہوا بدن، دراز قد، چوڑا چکلا سینہ، لانبے مضبوط بازو۔ ان بازوؤں میں... اُف پھر کیسے خیال آ رہے تھے۔ جیسے رگ رگ میں بجلیاں کوند رہی تھیں، دل کی دھڑکن کیسی تیز ہو رہی تھی! اور خون جیسے اُبلا جا رہا ہو۔ نس نس میں گرمی، آگ اُف یہ جذبات کا ہجوم، یہ طوفان! میں بستر پر گر پڑی اور تکیوں میں منھ چھپا لیا۔ یہ ہیجان، کیسی لذت تھی اس میں!

''گلنار آخر تمھیں ہو کیا گیا ہے؟'' میں نے چونک کر دیکھا۔ امی کھڑی تھیں۔ ان کا چہرہ غصہ سے تمتما رہا تھا۔ ''مس فنانس کب سے تمھارا انتظار کر رہی ہیں۔ تمھیں کچھ پاس بھی ہے بڑوں کا۔ اور وہ تو تمھاری استانی ہیں۔'' امی بڑبڑاتی ہوئی چلی گئیں۔

''تمھارا انتظار کر رہی ہیں۔'' ''تمھیں کو یاد کر رہی ہیں۔'' ''تمھارے نام کی رٹ لگا رکھی ہے۔'' اچھا بھئی جاؤں گی.. ہاں، کیوں نہیں؟ ضرور جاؤں گی۔ یہ ساری پہن کر جو میرے پرویز نے لا کر دی ہے۔ اور ہاں وہ انگوٹھی بھی پہنوں گی جو پرویز سے میرے منسوب ہونے کی نشانی ہے۔ میں نے ایک چھوٹی سی مخمل کی ڈبیا نکالی۔ کیسی خوبصورت انگوٹھی تھی۔ میری انگیجمنٹ رنگ 'P-Engagement Ring' پرویز کے نام کا پہلا حرف کس خوبصورتی سے تراشا گیا تھا! ہیروں کی چمک آنکھوں کو خیرہ کیے دے رہی تھی اور ان سفید نگینوں میں ایک سبز رنگ جگمگا رہا تھا۔ میں نے فخر سے دیکھا اور انگوٹھی پہن لی۔ ہاں اسی طرح جاؤں گی اور انھیں بتا دوں گی کہ مجھے اپنی شادی کی کس قدر خوشی ہے۔ وہ اپنے دل میں خیال کر رہی ہوں گی کہ میں ان سے شرمندہ ہوں۔ منھ بسوائے ہوئے بڑی ہی مغموم صورت بنائے ان کے پاس آؤں گی، درد بھرے لہجہ میں اپنی مصیبت بیان کروں گی کہ میرے دل پر کیا بیت رہی ہے اور شاید رونے بھی لگوں۔ ہونھ! میں انھیں کیسے حیران کر دوں گی! ساری پر نظر پڑتے ہی کہہ اٹھیں گی نا ''کیسی خوبصورت ساری ہے'' اور میں بڑے فخر سے کہوں گی کہ یہ پرویز لائے ہیں۔ پرویز ہی کی باتیں کروں گی۔ خوشی سے جھومتی ہوئی انھیں بتاؤں گی کہ پرویز کس قدر حسین ہیں۔ انھیں میری شادی میں شرکت کرنے کے لیے اصرار کروں گی اور جذبات کی شدت کا پورے طور پر اظہار کرتے ہوئے یہ بھی کہہ دوں گی کہ میں پرویز سے کتنی محبت کرتی ہوں۔ یہ سن کر بس جل ہی جائیں گی جلیں گی؟ ضرور۔ اس وقت جب میں چھٹی لیے بغیر گھر آئی تھی۔ وہ بار بار پوچھ رہی تھیں نا۔ ''گلنار! کہیں تمھاری شادی تو نہیں ہو رہی ہے؟'' میں نے کہا ''نہیں'' انھیں یقین ہی نہ آتا تھا۔ ''تم مجھ سے چھپاتی ہو گلنار۔'' اور جبھی تو انھوں نے میری منگنی کی خبر ملنے پر مبارک باد تک نہ لکھ بھیجی تھی اور اب تو میرے چہرے پر بجائے رنج کے یہ وفورِ شوق، مسرت اور بے تابی دیکھ کر کیسے جل اٹھیں گی۔ ہونھ! جلیں گی تو جلیں! خوب جلیں میری بلا سے!

میں نے چلتے چلتے پرویز کی تصویر بھی لے لی۔

تِل اوٹ پہاڑ

ہاجرہ مسرور

میں اور وہ ایک ہی ہوٹل میں برابر کے کمروں میں مقیم تھے لیکن ایک دوسرے سے قطعی ناواقف۔ وہ زیادہ تر اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑی دکھائی دیتی۔ زردی مائل سفید رنگ، دبلی پتلی سی، اس کے چھوٹے چھوٹے سنہری بال جو بالکل خشک اور سیدھے سے تھے، ہمیشہ پشت پر بکھرے رہتے۔ عمر بھی کوئی دس گیارہ سال ہوگی۔ معصومیت نام کو نہیں۔ عجیب پھیکا اور کھرا چہرہ تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے سفید کھاری شلجموں کا مزا یاد آجاتا۔ بس میں نے اسے جھکی جھکی نظروں سے اسی قدر دیکھا تھا، کیوں کہ کمبخت کے سامنے نظر اٹھانے کی ہمت پڑتی ہی نہ تھی۔ ٹانگ برابر کی لونڈیا، کچھ اس طرح آنکھیں گاڑ گاڑ کر دیکھتی جیسے زبردستی میری صورت، لباس اور چال ڈھال میں کوئی عیب نکالنا چاہتی ہو۔ اور یہ محسوس کر کے میرے جسم میں چیونٹیاں سی کاٹنے لگتیں۔ بس یہی دل میں آتا کہ کمبخت کے کان کھینچ کر لگاؤں دو چار چانٹے تاکہ آئندہ باہر نکلتے ہوئے مجھے یوں نہ تاکا کرے۔ لیکن اس کا رعب کچھ ایسا تھا کہ اپنا ہی جی جلا کر رہ جاتی، ''ہوگا بھئی دیکھنے دو۔ میرا کیا جاتا ہے۔ اس کی آنکھیں دُکھیں گی۔'' میں جلے پر مرہم رکھ لیا کرتی۔ ''مگر یہ لڑکی ہے بالکل معمہ۔ اگر میں اسے اچھی لگتی ہوں بجائے بدتمیزی سے گھورنے کے مجھ سے دوستی کیوں نہیں کرتی۔ اتنے اتنے بڑے بچے تو بلاتکلف اپنی پسندیدہ چیزیں دوسروں کے ہاتھوں سے جھپٹ لیا کرتے ہیں نہ کہ یہ... ہوگا! مجھے کیا مطلب اس معمے سے؟ ڈاکٹر کی ویسے ہی ہدایت ہے کہ پہاڑ پر رہو، آرام

کرو، سوچ بچار سے بچو۔ مطلب یہ کہ سطح زمین سے اونچے ہونے کے باوجود ہر قابل غور چیز کو سطح دماغ کے نیچے دبا دو۔ ارے ہاں! جب اپنی صحت ہی خراب ہو تو پہلے فکر اس کی کرنا چاہیے۔'' اور میں بڑی کوشش کے بعد اس لڑکی کی طرف سے بے نیاز ہو جاتی۔

چونکہ میں پہاڑ کی آب و ہوا کی عادی نہ ہوئی تھی، دوسرے علاج اور پرہیز میں بھی کافی بے توجہی تھی، اس لیے سزا تو ملنا ہی تھی۔ زکام ہوا، کھانسی بڑھی اور سینے کا سویا ہوا درد جاگ پڑا۔ ممانی جان اور بھائی جان پروگرام کے مطابق سینما جانے کے لیے تیار ہو چکے تو مجھے سوالیہ نظروں سے متواتر دیکھا جانے لگا، کیوں کہ میں بجائے ساتھ جانے کے پلنگ پر پڑی تھی۔

''آپ لوگ جائیے۔ میں نہ جاؤں گی۔''

''کیوں؟'' دونوں نے چڑ کر یکے بعد دیگرے سوال کیا۔

سچی بات کہتے ڈر لگا، کیوں کہ سچ بولنے کے صلے میں سوائے بد پرہیزی کے طعنوں کے کچھ ملنا نہ تھا۔ اس پر اماں کی شکایت لکھنے کی دھمکی بھی دی جاتی اور پھر اماں کا خط ''تم بڑی خراب لڑکی ہو۔ تمھیں اپنا ذرا بھی خیال نہیں'' میں جھوٹ بولنے پر تل گئی۔

''وہ دیکھیے نا... ذرا آج ایک پیاری سی کتاب ختم کرنے کا ارادہ ہے، اور ذرا اس وقت موج میں ہوں۔ تھوڑا گنگناؤں گی بھی... اور ایک بات یہ بھی ہے کہ دو ڈھائی گھنٹے سینما ہال میں بند رہنے سے... میرا مطلب ہے کہ میری صحت پر بُرا اثر ہو گا۔ دوسرے میری آنکھیں... عینک بھی تو ٹوٹ گئی ہے۔''

میں نے درد سے بے تاب ہو کر تکیہ سینے سے بھینچتے ہوئے جھوٹ کا طومار باندھ دیا۔

''اوہ! بڑی اچھی لڑکی ہو تم۔'' بھائی جان نے بیوقوف بننے میں پہل کی۔

''اچھا تو دروازہ بند کر لو، ہم جا رہے ہیں۔'' ممانی جان بھی صاف چکمے میں آ گئیں۔

تنہائی میں اطمینان سے میں نے اپنی بیماری کا سوگ منانا شروع کیا۔ یا تو ابھی تک مارے ڈر کے منھ سے ہوں بھی نہ کی تھی یا اب...

اللہ... ہا... ہا۔ مجھے مارے تکلیف کے رونا آنے لگا۔ یہ درد، یہ کھانسی، کیا ہو گیا ہے مجھے؟ جس ڈاکٹر کے پاس جاؤ، وہ سینہ اور پیٹھ ٹھوک بجا کر کہہ دیتا ہے، ''کچھ نہیں، بس ذرا اس دوا کی چار شیشیاں پی ڈالو۔ خوب کھاؤ پیو، غور و فکر کرنا چھوڑ دو، بس اچھی ہو۔'' غضب خدا کا! درجنوں ڈاکٹروں کی درجنوں شیشیاں پی ڈالیں لیکن دو چار شیشیاں باقی ہی رہیں اور یہ جو بدتمیز کہتے

ہیں 'کچھ نہیں' تو پھر کھانسی کا درد کا کوئی نیا نام ہوگا ان کی لغت میں۔ کسی کا کیا جائے گا۔ بس میں ہی کسی دن مر جاؤں گی۔ میں نے گھٹ کر اپنا منھ ملائم تکیوں میں بھینچ لیا اور پھر جو اٹھی کھانسی تو ہوش غائب۔ لیکن فوراً ہی میں نے کسی کے ہاتھ کا لمس اپنی پیٹھ پر محسوس کیا اور کھانسی کے جھٹکوں کی لائی ہوئی چکا چوند کے باوجود میں نے دیکھا کہ وہی لڑکی مجھ پر جھکی ہوئی ہے اور اس نے خشک سنہرے بالوں کی کچھ لٹیں کندھوں سے ڈھلک کر میرے اوپر جھول رہی ہیں۔

یہ لڑکی... معمہ، پھیکی، کھری، بدتمیز... نہیں بھئی کچھ نہیں۔ ذرا سنجیدہ ہے اور اپنی عمر سے زیادہ عقل مند۔ ویسے تو کبھی اس نے بات نہ کی لیکن دیکھو اس موقع پر الٹا مجھی کو اس کا ممنون ہونا پڑا۔ یہ عقل مندی نہیں تو اور کیا ہے۔

میں اٹھنے لگی۔

''تم لیٹی رہو۔ نہیں تو پھر کھانسی آنے لگے گی۔'' اس نے بڑی بے تکلفی سے کہا اور پیار سے میری بکھری ہوئی لٹیں درست کرنے لگی۔

'تم' یہ طرز تخاطب مجھے کھلا۔ خیر!

''کیا بیماری ہے تمھیں؟'' اس نے فکر مند ہو کر پوچھا۔

''کچھ نہیں۔''

''ایں!'' یہ اظہار تعجب تھا۔

''میری بیماری کا نام ڈاکٹروں نے یہی بتایا ہے۔'' میں نے وضاحت کر دی۔ اس کا تعجب مسکراہٹ میں تبدیل ہو گیا اور اس نے اپنی بڑی بڑی لیکن بے کیف سی آنکھیں نچا نچا کر ڈاکٹروں کی حماقت کے کئی قصے مجھے سنا ڈالے۔ اب میرے درد کو بھی نیند آ رہی تھی۔ اس لیے اِدھر اُدھر کی سوجھنے لگی۔

''کیا نام ہے تمھارا؟ اور یہاں کس کے ساتھ ہو؟'' میں نے پہلا سوال کیا۔

''زرینہ! اپنے ابا کے ساتھ ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

''تمھارے ابا تمھیں بہت چاہتے ہوں؟'' میں بچوں سے یہ سوال اکثر کرتی ہوں، بلا مقصد ہی۔

''اوں، ہنک'' وہ ہونٹ لٹکا کر خلا میں کچھ گھورنے لگی۔ ''وہ تو ہمیں جلانے کے مارے لال لال ہونٹوں والی، تمھارے برابر کی لڑکیوں کو چاہتے ہیں۔ خیر! جب ہم بھی اتنے ہی بڑے

ہو جائیں گے تو دیکھیں گے ہمیں کیسے نہیں چاہتے۔''

میں کٹ کر رہ گئی۔

''تمھاری اماں کہاں ہیں؟''میں نے اسے خاموش دیکھ کر سوال کیا۔

''مر گئیں وہ۔''اس نے اس طرح کہا جیسے اس کو اماں کے مرنے پر غصہ آ رہا ہو اور میں پریشان ہو گئی۔خواہ مخواہ رنجیدہ کر دیا بے چار کو میں نے،اب بہلاؤں۔

''بھئی تم بڑی اچھی لڑکی ہو۔کیا تم یہاں پہلی مرتبہ آئی ہو؟''

''نہیں، ہم ہمیشہ گرمیوں میں یہاں آ جاتے ہیں۔'' وہ میری انگلیوں سے کھیلنے لگی۔

''تمھاری انگلیاں بہت اچھی ہیں۔چھوٹی چھوٹی بچوں جیسی۔''اس نے میری انگلیاں اپنے ہاتھوں میں بھینچ لیں اور ہنسنے لگی۔اس کے کہنے پر جو میں نے اپنی انگلیاں دیکھیں تو مجھے بڑی ہی اچھی لگیں۔میں بے ساختہ مسکرا دی۔

''اور تمھارا چہرہ بھی خوب صورت ہے۔''اس نے اپنی گہری گہری آنکھیں مجھ پر گاڑ دیں اور میں ذرا بولائی۔جھوٹ بول رہی ہے کمبخت۔ابھی ذرا دیر پہلے میں نے اپنی صورت آئینے میں دیکھی تھی تو کتنی بڑی لگی تھی۔صحت بھی تو خراب ہے۔

''سچ مانو،تم بڑی پیاری لگتی ہو مجھے۔''اس نے میرے چہرے کو اپنی ہتھیلیوں میں ہولے سے دبا لیا اور وہ بہت سنجیدہ ہو گئی۔چہرے پر وہی کھرا پن خم ٹھونک کر جھومنے لگا اور مجھے ہوئی الجھن۔

''تم ہنستی رہا کرو۔''میں گھبرا کر کہا،''مجھے سنجیدہ بچوں سے بڑی نفرت ہے نا۔''

''اچھا!'' وہ اپنے نچلے ہونٹ کا ایک گوشہ دبا کر مسکرانے لگی۔

''زری!اے زرینہ!'' یہ اس کے باپ کی آواز تھی جو اسے عجیب انداز میں پکار رہا تھا۔

''اب تمھاری طبیعت تو اچھی ہے نا؟ میں جاؤں؟'' وہ مجھ پر پیار سے جھک گئی۔

''ہاں ہاں جاؤ۔تم بڑی اچھی لڑکی ہو۔''میں نے کہا۔

دھڑ دھڑ... دھم دھم... متصل کمرے میں اس کا باپ نہ جانے کیا اٹھا دھری کر رہا تھا۔ روز رات کو یہی اودھم ہوتا۔اسی لیے تو بھائی جان ہوٹل کے قیام سے کچھیا کر رہنے کا دوسرا انتظام کر رہے تھے۔

''یہ تمھارے ابا اتنا اودھم کیوں کرتے ہیں؟'' میں نے لگے ہاتھوں یہ بھی پوچھ لینا

مناسب سمجھا۔

''وہ جو آتی ہیں نا بڑی بڑی لڑکیاں، وہ رات کو انھیں بہت سا شربت سوڈے میں ملا ملا کر پلا دیتی ہیں اور ابا کو شربت بہت اچھا لگتا ہے۔ اس لیے اکیلے سب پی جاتے ہیں اور جب ان کا پیٹ بھر جاتا ہے تو مارے خوشی کے بڑے مزے مزے کی حرکتیں کرتے ہیں۔ ایک دن تو انھوں نے ایک لڑکی کی ساری...''

''زری... او زری کی بچی!'' ساتھ ہی ایک باریک قہقہے کی آواز گونجی اور وہ اپنی بات پوری کیے بغیر جلدی سے بھاگ گئی۔

دوسرے دن سویرے میرے کمرے میں وہ پھر آئی۔ لیکن میں سو رہی تھی، اس لیے چلی گئی۔ مجھے ممانی جان نے بڑی حیرت سے بتایا تو میں نے انھیں اپنی اور اس کی دوستی کی ابتدا سنا دی۔

''ہاں وہی تو میں کہوں۔'' ممانی جان نے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ میرے کمرے کے سامنے سے گزری تو میں نے اسے بلا لیا۔ بڑی دیر تک بیٹھی باتیں کرتی رہی۔ اس کے بعد تو بقول اس کے میری اس کی پکی دوستی ہوگئی۔ وہ تقریباً تمام دن میرے پاس گھسی رہتی۔ نہ جانے اسے کتنی باتیں کرنا آتیں۔ بس بیٹھتی تو جھڑ لگا دیتی اور بعض بعض باتیں تو اتنی عجیب کہہ جاتی کہ میں منھ دیکھ کر رہ جاتی۔ وہ تو کچھ اپنی عمر سے زیادہ سوچتی اور بولتی اور مجھے ہوتی الجھن۔ لیکن میں اس کے بدھوپن پر ٹوک بھی نہ پاتی کیوں کہ وہ تو بے بات کی بات پر رنجیدہ ہو جایا کرتی۔ دوسرے وہ مجھے چاہتی بھی اتنا تھی کہ میرا منھ نہ پڑتا کچھ کہنے کو۔

ایسا دوڑ دوڑ کر میرا سب کام کرتی کہ کوئی دو ٹکے کا غلام بھی نہ کرے۔ بس ہر وقت میرا منھ دیکھا کرتی کہ کہیں میں ناراض تو نہیں ہوں اس سے۔ ہم دونوں اکثر ساتھ ہی چہل قدمی کو نکل جاتے تو وہ راستے بھر ایسی کھری بنی رہتی کہ میں قدم قدم پر یہی سوچتی کہ آج اس سے کہہ دوں کہ میری تمھاری دوستی ختم۔

''تم اِدھر اُدھر نہ دیکھا کرو۔'' وہ کہتی۔

''کیوں؟'' میں جل جاتی۔

''لوگ تمھیں گھورتے ہیں۔''

''تو میرے اِدھر اُدھر دیکھنے سے لوگ گھورنا چھوڑ دیں گے۔ کیوں؟''

''نہیں۔ مگر تم کو تو نہیں معلوم ہوگا کہ لوگ تمھیں دیکھ رہے ہیں۔'' وہ جواب دیتی اور مجھے ایسا لگتا کہ کسی نے مجھ پر گرم گرم بھوبل انڈیل دی۔ جی میں آتی کہ مارے تھپڑوں کے منھ سرخ کر دوں کمبخت کا۔ لیکن پھر وہی رعب دل ہی دل میں اپنے بلا وجہ دبنے پر تاؤ کھاتی رہتی اور تفریح کا مزا کرکرا ہو جاتا۔

''اب واپس چلیں گے۔'' میں بیزار ہو کر کہتی اور وہ میرے محافظ کی طرح کبھی میری نظریں اور کبھی دیکھنے والوں کی نظریں دیکھتی سائے کی طرح ساتھ رہتی۔ میں جائے قیام پر پہنچ کر اس کا کھرا پن اس طرح کی لجاجت میں تبدیل ہو جاتا کہ میں دوستی ختم کرنے کا اعلان نہ کر پاتی۔

صبح سے جی کچھ اداس تھا۔ ممانی جان اپنی ہی جیسی موٹی تازی پرانی دوست کے ساتھ پہاڑیوں پر چڑھنے کی مشق فرمانے گئی ہوئی تھیں اور بھائی جان تو تفریح کرنے ہی کے خیال سے آئے ہوئے تھے۔ اب میں تھی اور میرے الجھتے ہوئے خیالات۔ اتنے میں وہ آ گئی۔

''چپ کیوں پڑی ہو؟''

''یوں ہی!'' اس کا آنا کھل رہا تھا اس وقت۔

''کنگھی کیوں نہیں کی آج؟ بالکل جھونجھ ہو رہے ہیں بال۔''

اس نے اپنی انگلیاں میرے بالوں میں الجھالیں۔

''جی نہیں چاہا۔''

''تو لاؤ میں کر دوں کنگھی۔'' وہ جھپٹ کر سنگار میز پر سے کنگھا اٹھا لائی۔

''نہیں بھائی مجھے لیٹا رہنے دو۔ میری طبیعت نہیں اچھی اس وقت۔'' سچ مچ جان سی نکل رہی تھی۔

''تم لیٹی رہو، میں کروں گی کنگھی۔'' وہ بڑی خوشامد سے بولی اور میری چوٹیاں کھولنے لگی۔

''ارے!'' میں نے پھریری لے کر اپنے بازو سکیڑے۔

''کیا؟'' اس نے اپنی پتلی سی زرد گردن کو کندھے کی طرف جھٹکا دے کر کہا اور مسکراتے ہوئے بے رنگ لبوں کو بھینچ کر تھوک نگلا۔ اب وہ احتیاط سے چوٹیاں کھول رہی تھی۔

مجھے اپنی 'ارے' پر بڑی خفت ہوئی۔

وہ آہستہ آہستہ میری لٹوں میں کنگھا پھیرنے لگی اور میری آنکھیں سرور سے بند ہونے

لگیں۔ یہ بھی میری بڑی عجیب عادت ہے کہ جہاں کسی نے میرے بالوں کو چھوا اور مجھے نیند آئی۔ اس کا ہاتھ کنگھی کرتے کرتے رُکا اور میرے چہرے پر پھرنے لگا اور پھر اچانک میں نے اس کی تپتی ہوئی سانس اپنے چہرے پر اور جلتے ہوئے ہونٹ اپنے ہونٹوں محسوس کیے۔ میرے ٹھنڈے جسم کی رگوں میں چنگاریاں سی کلبلائیں اور میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

''تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔'' اس نے میرے چہرے کو اپنی سلگتی ہوئی ہتھیلیوں میں بھینچا اور میں بغیر سوچے سمجھے اپنے او پر ناز کرنے لگی۔

''تم یہاں کب تک رہوگی زری؟'' میرا جی چاہا کہ وہ مجھ سے کبھی بھی جدا نہ ہو۔

''جب تک تم رہوگی۔ تمھارے بغیر یہاں میرا جی گھبرائے گا۔'' وہ اپنے خشک ہونٹ کی ایک پپڑی دانت سے دبا دبا کر ادھیڑنے لگی۔

''تمھارے ہاں تو بہت سی لڑکیاں آتی ہیں۔ ان سے دوستی کرلو، پھر جی نہ گھبرائے گا۔'' میں نے یوں ہی کہہ دیا۔

''اوں ہنک۔ وہ سب کی سب بڑی نک چڑھی ہیں۔ بس وہ سب تو ابا کے پاس گھس گھس کر بیٹھتی ہیں اور...'' اس کے چہرے پر سے بھولپن صاف کھرچ گیا۔

''بھئی دوسری باتیں کرو۔'' میں نے گھبرا کر بات کاٹی۔ وہ ہنس پڑی۔ بالکل اس طرح جیسے کوئی کسی بچے کو 'جوجو' سے ڈرا کر خوش ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ اپنی ان سہیلیوں کا ذکر کرنے لگی جن سے وہ بہت محبت کیا کرتی تھی۔ ان لڑکیوں کا ذکر کرتے ہوئے اس کی آنکھیں اور چہرہ اتنا عجیب ہوگیا کہ مجھے وحشت ہونے لگی۔

''لاؤ کنگھا مجھے دو۔ میں بال ٹھیک کرلوں، تم تو باتوں میں لگ گئیں۔'' میں نے اسے دوسری طرف متوجہ کرلیا اور وہ اپنی سہیلیوں کو بھول کر میرے بالوں سے الجھ گئی۔

اس کے بعد سے تو یہ اس کا معمول ہوکر رہ گیا کہ گھنٹوں میرے بال سنوارا کرتی۔ ابھی اپنی مرضی کے بال بنائے اور دور کھڑے ہوکر ہر زاویے سے معائنہ کیا اور لو...

''اس سے اچھا بناؤں گی۔'' پھر بنائے جانے لگتے بال۔ ایک دن تو اس نے غضب ہی کر دیا یعنی ایک پوری لٹ قینچی سے اڑا دی اور ننھے ننھے ترشے ہوئے بال جھمر کی طرح پیشانی پر بکھیر کر خوب ہی تو خوش ہوئی۔ میں جب ناراض ہوئی تو اس نے لپٹ کر سینکڑوں پیار کر ڈالے، یہاں تک کہ میرا دم گھٹنے لگا۔

''ہٹو الگ۔'' میں نے اُکتا کر الگ کرنا چاہا۔

''اوں... اوں... نہیں۔'' وہ اور بھی لپٹی اور میں نے جھنجھلا کر اسے بازوؤں سے پکڑ کر دھکا دے دیا۔ وہ دھان پان لونڈیا ذرا ہی میں دیوار سے جا ٹکرائی اور میرا دل دھک سے ہو گیا کہ کہیں چوٹ نہ لگ گئی ہو۔

'چچ چچ' میں مارے پشیمانی کے ہونٹ کاٹنے لگی۔ 'اب وہ مجھ سے ناراض ہو جائے گی۔ کتنی ذلیل ہوں میں بھی کہ اس کی محبت کا یہ صلہ دیا۔'

میں نے ڈرتے ڈرتے نظر اٹھائی تو دیکھا، وہ دیوار سے ٹکی مجھے عجیب عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ہاں کچھ بڑی عجیب نظروں سے۔ کیا بتاؤں کہ وہ کس قسم کی نظریں تھیں۔ اس کی ٹھوڑی سینے پر جھکی ہوئی تھی اور خشک سنہری بال کندھوں سے لے کر سینے تک بکھرے ہوئے تھے اور اس کا چہرہ؟ بالکل کسی جوشیلے نوجوان کی طرح کرخت اور وحشت زدہ ہو رہا تھا۔ میں جہاں تھی وہیں کھڑی رہ گئی۔

''سنو!'' وہ بڑے رعب سے کہتی ہوئی آگے بڑھی۔ ''اب ایسا کبھی مت کرنا۔ ورنہ...'' اور پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھ میری کمر کے گرد لپیٹ کر اپنا سر میرے سینے پر جھکا لیا۔ میں کسی قدر غصے میں بے حس و حرکت کھڑی رہی۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ اس کا سر دوبارہ دیوار سے ٹکرا دوں۔ آخر یہ مجھ پر رعب گانٹھنے والی ہوتی کون ہے؟ لیکن اچانک میں نے محسوس کیا کہ کوئی گرم رقیق چیز میرے سینے میں جذب ہوتی جا رہی ہے۔ ارے! وہ تو سسک سسک کر رو رہی تھی۔ اوہ! میں پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ میں نے سوچا، 'میں بھی کتنی بیوقوف ہوں۔ کیا انٹ شنٹ باتیں سوچتی ہوں۔'

اس کی سسکیاں تھم گئیں لیکن وہ لپٹی اسی طرح رہی، بالکل ایک سہمی ہوئی ننھی بچی کی طرح۔

دروازہ کھٹ سے ہوا اور وہ پھرتی سے دور جا کر کھڑی ہو گئی۔ ''ایں یہ کیا؟'' میں ہکا بکا رہ گئی۔ کمرے میں آنے والی ممانی جان تھیں جو اپنے گیلے بالوں سے پانی کی بوندیں تولیہ میں جذب کرنے میں منہمک تھیں۔

''بڑی جلدی نہا لیں آپ؟'' اس نے ممانی جان کو گھورا، بالکل اسی طرح جیسے میں نے ایک بار پالتو کتے کے آگے گوشت کا ایک ٹکڑا پھینک کر پھر شرارت سے اٹھا لیا تو کتے نے مجھے گھورا

تھا۔ مجھے اس کی صورت سے وحشت ہونے لگی۔ میں اس کی طرف سے منہ پھیر کر کھڑکی میں سے باہر دیکھنے لگی۔

''کیسی لڑکی ہے یہ؟'' میرے دماغ میں بس یہی سوال ٹھونگیں مارنے لگا۔

''تم ادھر کیوں کھڑی ہو؟'' وہ پھر میرے پاس آ گئی اور مجھے ایسا لگا کہ میرا جی اندر سے متلا رہا ہے۔ ایک عجیب سی تکلیف، بس جیسے جسم کے ایک ایک رونگٹے پر کراہت آمیز گدگدی چھا گئی ہو۔

''جاؤ بھئی، اس وقت مجھ سے مت بولو۔'' میں ایک تاؤ میں آ گئی اور وہ تھوڑی دیر تک مجھے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے کے بعد خاموشی سے چلی گئی۔ مجھ پر سے جیسے بوجھ اتر گیا۔

پھر وہ تمام دن میرے پاس نہ آئی۔ میں دن میں کئی بار اس کے کمرے کے سامنے سے نکلی لیکن دروازہ بند ہونے کی وجہ سے وہ نظر نہ آئی۔

'بچہ ہی تو ہے۔' میں اپنے دل کو سمجھاتی لیکن دل کے کسی گوشے میں دُبکا ہوا نامعلوم سا خوف مجھے منہ چڑا دیتا اور میں سوچنے لگتی۔ اونھ، اچھا ہی کہ ناراض رہے مجھ سے۔ مجھے نہیں ملنا ہے ایسی لڑکی سے۔ مگر وہ ہے کیسی لڑکی۔ اس کا جواب میرے پاس کیا تھا؟ سوائے اس کے کہ تمام دن مارے الجھن کے دماغ کے آبلے کی طرح تپتا رہا اور رات چڑھا کس کے بخار۔ 'اللہ! زری آ جاتی تو میرا سر دبا دیتی۔ زری آ جاتی تو میرے بال ہی سلجھا دیتی۔ سر پر بوجھ ہو رہا ہے۔ زری آ جاتی تو۔'

اب زری کی کمی شدت سے محسوس ہوئی لیکن وہ نہ آئی۔ رات گئے تک میں بن بن کر کھانستی رہی کہ شاید... صبح ہو گئی۔ بخار دھیما پڑ گیا اور غصہ تیز ہو گیا۔

'نہیں آتی تو نہ آئے کمبخت۔ کیا میں کہیں کی گری پڑی ہوں۔ دوسرے اس میں رکھا ہی کیا ہے۔ نری بدتمیز تو ہے اور جانے مجھے اپنے جی میں سمجھتی کیا ہے جو کھلونا بنا کے رکھا ہے؟'

دوسرا دن بھی میں نے پیچ و تاب کھاتے گزارا۔ شام کو خلاف امید بخار کے ساتھ وہ بھی آ گئی۔ بڑی خوب صورت سی فراک پہنے ہوئے تھی اور خشک سنہری بالوں کو بڑی تمیز سے سرخ رِبن سے باندھ رکھا تھا۔ اس کا دبلا پتلا روکھا سا چہرہ بجلی کی سفید روشنی میں مجھے بڑا بھلا لگا۔ وہ میری طرف دیکھے بغیر ایک کرسی پر بیٹھ کر بے نیازی سے ٹانگیں جھلانے لگی۔

''دیکھا! کیا اسے نہیں معلوم کہ میں بیمار ہوں۔'' میرا جی بھرنے لگا اور آنکھیں تپنے لگیں۔

’’آج تو تم دو روز بعد آئی ہو زری۔ کیوں بھئی؟‘‘ ممانی جان نے سویٹر بنتے ہوئے کہا اور اپنے چوڑے چکلے چہرے پر اس طرح مسکراہٹ لائیں کہ چہرے کی جلد چٹختی ہوئی لگنے لگی۔

’’مجھے آپ پر غصہ تھا۔‘‘ اس نے اپنے بے رنگ لبوں کو بڑے انداز سے کھولا۔

’’کیوں بھئی کیوں؟‘‘ ممانی جان ہڑبڑا گئیں۔

’’آپ اچھی طرح نہیں نہاتیں۔‘‘ وہ بولی اور میرے دل پر چھایا ہوا غبار آناً فاناً یہ معصوم جھونکا لے اڑا۔

میں بھی کتنی وہمی ہوں۔ خواہ مخواہ تنکے کو گھور رہی ہوں کہ کہیں یہ پہاڑ نہ ہو۔ لو بھلا تنکا پہاڑ کیسے ہو جائے گا۔ اماں سچ کہتی ہیں کہ تمھارا سوچ بچار تم کو بالکل نکما کر دے گا۔ تم تو ساری عمر میں زیادہ سے زیادہ یہی سوچ سکتی ہو کہ چلتے میں انسان کے پاؤں آگے پیچھے نہ پڑیں تو کس صورت سے پڑیں۔ میں بے ساختہ مسکرا پڑی۔

’’اچھا اچھا، مجھ پر غصہ بعد میں کرلیا، پہلے اپنی شاداں کی فکر کرو۔ تمھارے لیے اتنی اداس رہی کہ بخار چڑھا لیا۔‘‘ ممانی جان کا کرارا قہقہہ گونجا اور میرا دل اس کا جواب سننے کے لیے زور سے دھڑکنے لگا۔

وہ ہنستی ہوئی میرے بستر پر آ بیٹھی۔

’’تو تم سچ مچ اداس رہیں میرے بغیر؟‘‘ اس نے میری انگلیاں زور سے دبا کر چھوڑ دیں اور مارے غرور کے بھویں تان لیں۔

’’اوں... ہنک!‘‘ میں نے بطور انکار گردن ہلادی۔ اس وقت میرا جی چاہ رہا تھا کہ خوب ستاؤں کم بخت کو۔ اس نے بھی مجھے بہت جلایا تھا نا۔ اس کے چہرے کی تمتمائی ہوئی کھال ایک دم ڈھیلی پڑ گئی اور وہ میری طرف سے منھ پھیر کر ممانی جان کو دیکھنے لگی جو ہماری طرف سے پیٹھ موڑے الماری سے کچھ نکالنے میں جُٹی ہوئی تھیں۔ میں نے اس کی انگلیاں مروڑ ڈالیں کہ یوں ہی لٹکا ہوا منھ سدھر جائے اور وہ تو جیسے اپنا غصہ رفو چکر کرنے پر ادھار کھائے بیٹھی تھی۔ بس میری اس فضول سی ادا پر اس کا پیار پھٹنے لگا۔ اس سے پہلے کہ ممانی جان مڑیں، اس نے میرے چہرے کو اپنے جلتے ہوئے چہرے سے داغنا شروع کر دیا۔ لیکن اُدھر ممانی جان مڑیں اور اِدھر وہ کھٹ سے سیدھی ہو بیٹھی۔

’پھر وہی؟‘ میرا دل ایک جھٹکے سے پسلیوں سے جا لڑا۔ آخر یہ چوری کیسی؟ میں نے الجھ

کر اسے گھورا۔ اس کے اوپر کے ہونٹ پر پسینہ چمک رہا تھا اور میرے ہاتھ پر رکھا ہوا ہاتھ پسیج رہا تھا۔ وہ تو جیسے...

'کیسی ہے یہ لڑکی؟' کھٹ کھٹ دماغ پر چوٹیں لگنے لگیں۔ آنکھیں آپ ہی آپ مند گئیں اور ممانی جان کی ایک ہلکی سی گھبراہٹ آمیز چیخ سننے کے بعد مجھ پر ایک عجیب سا خوف طاری ہو گیا۔

'کرخت، دبلا پتلا لڑکوں جیسا چہرہ، ناقابل بیان قسم کی نظریں، بے رنگ پپڑیائے ہونٹ اور پسیجے ہوئے ہاتھ'... میں کپکپا رہی تھی۔ اے لو! وہ ایک کھرا چہرہ کتنے بہت سے چہروں میں تبدیل ہو گیا۔ بالکل ایک جیسے سوکھے سوکھے بے رونق چہرے۔

افوہ! یہ تو میرے چاروں طرف دیوار کی طرح چن گئے ہیں۔ اب کیا کروں؟

نظریں... اتنی بہت سی بے کیف آنکھوں سے نکل کر مجھے ہر طرف سے گھور رہی ہیں۔ چھلنی ہوا جاتا ہے سارا جسم۔ کہاں جاؤں؟ ارے؟ اب یہ پتلے پتلے پسیجے ہوئے پنجے، اُف کتنا پسینہ ٹپک رہا ہے ان سے اور یہ میری طرف بڑھ کس لیے رہے ہیں؟ اور یہ بے رنگ ہونٹ!! کوئی جگہ نہیں بچنے کی... اب بڑھے یہ ہاتھ اور مجھے دبوچا۔ اب بڑھے یہ ہونٹ اور میرے جسم پر چپکے۔ مارے خوف سے تڑپی تو آنکھ کھل گئی۔

ٹک ٹک ٹک۔ کلاک کا پنڈولم اس گت پر جھومے جا رہا تھا۔ افوہ! تو ایک بج گیا ہے رات کا۔ میں نے سوچا۔ 'ممانی جان بھی سو رہی ہیں اور بھائی جان بھی۔ پھر روشنی کیوں کر رکھی ہے اب تک۔ کتنی خاموش اور سرد رات ہے اور میری طبیعت بھی تو خراب ہے۔ جانے کیا ہو گیا تھا شام کو؟ میں نے اپنا دھمکتا ہوا بھاری سر تکیے پر رگڑا۔ مارے نقاہت کے جسم لوتھ ہو رہا تھا۔

''سی سی۔'' میں نے چونک کر اپنے سرہانے نظر پھیری تو دیکھا میرا شال اوڑھے کرسی پر وہ اکڑوں بیٹھی سسیا رہی ہے۔ سردی سے اس کے ہونٹ کپکپا کر نیلے پڑ گئے تھے۔

''تم اس وقت یہاں؟''

''ہاں!'' وہ مجھ پر جھک کر بولی۔

اور جیسے مجھے کسی نے گولی مار دی۔

ٹی پاٹ

صدیق عالم

اپنے ملکوں میں شہر چھوٹے چھوٹے محلوں میں بٹے ہوتے ہیں۔ ان محلوں میں جو گھر ہوتے ہیں، وہ دوسرے محلوں کے گھروں سے کچھ الگ نہیں ہوتے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ایک محلے میں کھڑے ہو کر آپ تمام محلوں کو جان لیں اور یہ بھی ہے کہ آپ دوسرے محلوں میں جا کر کوئی نئی چیز بھی نہیں جان پاتے۔ اور اس طرح شہر آپ کے بڑھتے قدموں کے ساتھ ساتھ آپ سے دور ہوتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ اس کا دوسرا سرا پیچھے سے آپ کو آپ کی لاعلمی میں اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ شہر کی بازیافت کا یہ واقعہ اکثر مجھے حیران کر دیتا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں، میں نے غور و فکر کا بیڑا اٹھا رکھا ہے اور مجھ جیسے لوگ کسی بھی وقت اس دھرتی کے لیے ایک خطرہ ثابت ہو سکتے ہیں۔

ڈاکٹر پنچم اور میں، جو اکثر سہ پہر کی چائے پینے اس ٹیرس پر آتے ہیں، اس شہر کا تذکرہ لے بیٹھتے ہیں۔ یہ ٹیرس سرکاری اسپتال سے کچھ فاصلے پر ایک قدیم عمارت کی پہلی منزل پر واقع ہے۔ اس عمارت کی ایک ایک اینٹ کو مقدموں نے پیر تسمہ پا کی طرح اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے اور اس کی منڈیر پر طفیلی پودوں سے، جن میں چند نے تو تناور پیڑ کی شکل لے لی ہے، تڑخ رہی ہے۔ اس کی لوہے کی مرغولے دار سیڑھی سے اوپر آتے ہوئے زیادہ تر ہمیں شناسا چہروں سے ہی واسطہ پڑتا ہے۔

''بڑا عجیب بھی نہیں ہے یہ سب کچھ۔'' بنگلہ دیش سے ہجرت کر کے آیا ہوا پنچم سینا پتی جاڑے کی روشن دھوپ میں خون رنگ سوئٹر پہنے کچھ زیادہ ہی کالا دکھائی دے رہا ہے۔ وہ آہنی میز سے جہاں اس کی چائے کی پیالی چائے دانی کے پاس رکھی ہوتی ہے، دور ہو کر بیٹھتا ہے، یہاں تک کہ چائے کی پیالی تک پہنچنے کے لیے ہر بار اسے اپنے پورے جسم کو گھوڑے کے نعل کی شکل دینی پڑتی ہے اور خون اس کے گالوں میں کھنچ آتا ہے۔

''یہ جو ہم لوگ جی رہے ہیں اور جو کچھ بھی ہے یا جیسا بھی ہے، اسے اسی طرح دیکھنا واجب ہے۔ لیکن ہم کسی بھی چیز سے مطمئن کب ہوتے ہیں؟ ہم مسخرے ہیں جو دنیا کو اپنے اوپر ہنسنے کی دعوت دیتے ہیں۔''

میں بحث و مباحثے میں زیادہ تر پیچھے رہ جاتا ہوں۔ شاید میرے اندر معلومات کا صحیح تناسب موجود نہیں۔ یا تو میں کسی ایک چیز کو ضرورت سے زیادہ جان لیتا ہوں اور لوگ بور ہو جاتے ہیں یا پھر اس کے سلسلے میں میری معلومات نہ کے برابر ہوتی ہے۔ دونوں صورتوں میں الفاظ میرا ساتھ دینے سے انکار کر دیتے ہیں۔

''شاید ایسا ہمیشہ سے ہے۔'' میں کہتا ہوں۔ ''میرا مطلب ہے ہم بہت کچھ کر بیٹھنے کی حالت میں بھی نہیں ہیں۔ جو کچھ جیسا چل رہا ہوتا ہے ہم اس میں ایک اضافی حیثیت ہی رکھتے ہیں۔''

ٹیرس شمال کی طرف کھلا ہوا ہے اور نیچے سڑک کی کثافت بہ آسانی ٹیرس پر آ جاتی ہے۔ گرمی میں یہ دھوپ سے تپ اٹھتا ہے، جب کہ جاڑے میں ٹھنڈی ہوا اندر کے انسانی چہروں کو خشک کر ڈالتی ہے۔ ایسے میں ایک گرم بحث میں الجھ پڑنا فائدہ بخش ہی ثابت ہوتا ہے۔ پنچم جس کے بال قبائلیوں کی طرح گھنگریالے ہیں اور ہونٹ قرمزی، جس پر دل کا ایک دورہ پڑ چکا ہے میرے ان چند گنے چنے واقف کاروں میں ہے جنھوں نے سوچنے کا عمل جاری رکھا ہوا ہے۔

''دنیا میں ہر چیز کی اپنی ایک جگہ اور اپنا ایک وقت ہے۔'' وہ کہتا ہے۔ ''مگر یہ شہر ہماری ذہنی اختراع ہے۔ بھگوان کو یہ ناپسند ہے اور دیکھ لینا موہن جوداڑو اور ہڑپا کی طرح ایک دن ہماری تہذیب نیست و نابود ہو جانے والی ہے۔ ہماری اضافی حیثیت چشم زدن میں وہ بھی نہیں رہ جائے گی۔''

اکثر میں سوچتا ہوں، ہم کیوں DNA پر بحث نہیں کرتے؟ اسپتال سے بھاگ کر یہاں

آنے کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہم اپنی بربریت کا مظاہرہ کریں۔ تاریخ سے پرے جا کر، کسی بنجر زمین پر بیٹھ کر فیصلے صادر کرنا، کیا ہم لوگ اسی لیے دھرتی پر اتارے گئے ہیں؟ میرے سامنے کی میز پر ایک ڈائری کھلی رکھی ہے جس پر میں اس دن کے واقعات لکھنا چاہتا ہوں مگر دن تو ابھی نصف ہی گزر پایا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ میں اپنے قلم کی روشنائی کے سلسلے میں وسوسے میں مبتلا ہوں۔

ویٹر کیش کاؤنٹر سے ہماری طرف آتا ہے۔

''کیتن، ایک اور پاٹ!'' میں اس سے کہتا ہوں۔ کیتن کے سر پر اب بال برائے نام رہ گئے ہیں۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ بہرا ہو چکا ہے اور چونکہ اس ٹیرس پر چائے اور بسکٹ کے علاوہ دوسری کوئی چیز نہیں ملتی، گاہکوں کے ہونٹوں کی جنبش کو پڑھ کر اسے جان لینے میں دقت نہیں ہوتی کہ کس چیز کا حکم دیا گیا ہے اور اس طرح وہ اپنے بہرے پن کو چھپا کر جینے میں کامیاب ہے۔ خالی وقت میں وہ منڈیر سے پیٹھ لگائے اپنے اسٹول پر بیٹھا اونگھتا رہتا ہے۔ جانے کیا خواب دیکھتا ہے وہ؟ وہ غیر شادی شدہ ہے، چکلا جاتا ہے، اس ٹیرس میں سوتا ہے اور ایک دن اس ٹیرس میں مر جانے والا ہے۔

''تمھیں یہ عجیب نہیں لگتا؟'' میں خود سے پوچھتا ہوں۔ ''کہ ایک دن ایک دوسرا شخص اس کی جگہ لے گا جو کیتن کی طرح ہی اضافی ہوگا۔ اور ایک دن ہم یہاں نہ ہوں گے اور ہماری غیر موجودگی میں دوسرے لوگ ہماری بحث میں حصہ لیں گے۔ ہمارے مکالمے دہرائیں گے؟''

میں اپنی کار میں گھر لوٹتا ہوں تو محلے بھاگتے ہوئے میرے پیچھے پیچھے آتے ہیں۔ آڑے ترچھے کھمبے راستوں سے ہٹتے چلے جاتے ہیں۔ میرے بچے مجھے پا کر کتنے خوش ہیں! شہر کھلی ہوئی کھڑکیوں کے باہر اپنے مناسب فاصلے پر ٹھہرا ہوا میرا منتظر ہے اور میری بیوی مجھ سے ملاعبت کے لیے بے چین ہے۔

''تمھیں نہیں لگتا ان دنوں تم کچھ زیادہ کام کر رہے ہو؟'' میرا دل جیتنے کے لیے وہ کہتی ہے۔

میں حیرت سے اس کی طرف تاکتا ہوں۔ خود کو ننگا پا کر مجھے یاد آتا ہے رات ہو چکی ہے۔

میں سگریٹ سلگاتا ہوں۔ مجھے چائے کی طلب لاحق ہوتی ہے مگر مجھے اتنی رات گئے باورچی خانے میں بھوت کی طرح بیٹھ کر چائے پینا اچھا نہیں لگتا۔ شہر کھڑکیوں سے رس رس کر اندر آ

رہا ہے۔شاید اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ میں چادر سے اپنے ننگے بدن کو ڈھک کر اسے نظر انداز کر دینا چاہتا ہوں، مگر شہر میرے خواب میں اپنی یکسانیت بھرتا رہتا ہے۔ ایک سے گھر، ایک سے راستے، ایک سے چہرے، ایک سی گاڑیاں۔ میں خواب میں ہر محلے سے فرار ہونا چاہتا ہوں جو میری مدد یوں کرتا ہے کہ دوسرے محلے کے حوالے کر دیتا ہے اور یہ شہر پھیلتے پھیلتے مجھے پیچھے سے آلیتا ہے۔

اسپتال میں کچھ دن سے ایک مریض نے اچھا خاصا ہنگامہ کھڑا کر رکھا ہے۔ اس سے بات کرنے پر یہ پتہ چلا لینا آسان ہے کہ اسے کیا پریشانی ہے۔ اسے اپنے غدود کے کھو جانے کا اندیشہ ہے۔

''اور اب کے آپ نے اتنا شور مچا ڈالا ہے... '' میں اسے سمجھاتا ہوں، ''تو ظاہر ہے اسپتال کے عملے کا ایسا کوئی ارادہ ہو بھی تو وہ آپ سے دور ہی قائم رکھیں گے۔ آخر اس ملک کے قانون سے کچھ تو ڈر رہے ہمیں۔''

''میں نہیں جانتا۔'' وہ کہتا ہے۔ ''مجھے اس بات کی ضمانت چاہیے کہ میرے ساتھ ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آنے والا ہے۔ میں احمق نہیں ہوں۔ ٹیلیفون کے شعبے میں تقرری کے دوران میں نے بڑے بڑوں کے چھکے چھڑائے ہیں۔ میرے بچے بڑے ہو چکے ہیں اور میں اپنی پروا نہیں کرتا۔ میں اس ملک کو کتوں کے حوالے نہیں کر سکتا۔''

اس کے سلسلے میں یہ افواہ بھی اُڑی ہوئی ہے کہ وہ ہم جنسیت کا شکار ہے اور اس نے ایک سوئیپر کو جسمانی تعلقات قائم کرنے کی پیشکش بھی کی ہے۔ وہ پنچم کا مریض نہیں، مگر پنچم اس میں دلچسپی لینے لگا ہے۔ وہ اکثر اس کی مزاج پرسی کے لیے اس کے کیبن میں آدھمکتا ہے۔

''کیوں کہ وہ عام مریضوں سے الگ ہے۔'' وہ اپنا جواز پیش کرتا ہے۔ ''ذرا سوچو ایسے بھی لوگ ہیں جن کی اخلاقی قدریں الگ ہیں، جن کا طریقہ بھونڈا سہی مگر جن کے ہنگامے سماج کو چوکس رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔''

''اور میرا خیال تھا تمھیں سماجیات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔'' میں کہتا ہوں۔ ''تم دھیرے دھیرے بدل رہے ہو۔ شاید ہماری ٹیرس کی ملاقات اب زیادہ عرصے کی بات نہیں ہے۔''

''واقعی!'' وہ ہنستا ہے۔ ''تم اپنے مریضوں کو ان کے مرض سے اوپر اٹھ کر سمجھنے کی کوشش

کیوں نہیں کرتے؟ دراصل وہ کچھ بھی نہیں چاہتا بلکہ وہ تو اپنے غدود سے بھی دستبردار ہونے کے لیے تیار ہے۔''

''اچھا، اور یہ کب کا واقعہ ہے؟'' میں مسکراتا ہوں۔ ''کیا واقعی ہم اب اس کاروبار میں ملوث ہو چکے ہیں؟''

وہ کچھ نہیں کہتا۔ مگر ٹیرس میں وہ اس بحث کو پھر سے شروع کرنا چاہتا ہے۔ پھر یہ دیکھ کر کہ میں کچھ اور سوچ رہا ہوں، وہ ارادہ ترک کر دیتا ہے۔

''یہ ٹیرس خطرناک ہوتا جا رہا ہے۔'' وہ چائے دانی کا ڈھکن اٹھا کر اندر جھانکتے ہوئے کہتا ہے۔

''دس سال سے اس عمارت کو سرکار نے کنڈم ڈیکلیر کر رکھا ہے۔''

''تو'' وہ اس خبر سے مضطرب نظر آتا ہے۔ اس کے اندر قدرے بے چینی دوڑ جاتی ہے جیسے گڈے کے اندر چابی بھر دی گئی ہو اور انگلیوں کی گرفت سے چھوٹتے ہی وہ طوفانی رفتار سے چلنا شروع کر دے گا۔ ''ہمیں اس عمارت کے سلسلے میں مزید جانکاری حاصل کرنی چاہیے۔ تمھیں نہیں لگتا یہ شہر دھیرے دھیرے اپنی پہچان کھوتا جا رہا ہے۔''

''وقت کو اپنا کام کرنے دو پنچم۔'' میں کہتا ہوں۔ ''آدمی کھو کر ہی کچھ پاتا ہے اور ہر دور کو اپنی شناخت بنانے کا حق ہے۔''

''پھر بھی، کچھ بچا کر رکھنا تو ضروری ہوتا ہے نا؟'' وہ کہتا ہے۔ ''اور کچھ نہیں تو تھوڑی سی یادیں، ایک دو پہچان، محبت کی چند گھڑیاں، کچھ نفرت کے لمحات۔ آخر زندہ رہنے کا حق تو ادا کرنا ہے ہمیں۔''

''شٹ اپ ڈاکٹر۔'' میں کہتا ہوں۔ ''شٹ اپ۔ اور یاد رکھو تمھارے منھ سے بدبو آتی ہے۔''

''جو میری بیوی کا مسئلہ ہے۔'' وہ کھلکھلا کر ہنستا ہے۔ ''اچھا، اس مریض کو تم بھول رہے ہو، کیا واقعی اسے اپنے تناسلی غدود کے کھو جانے کا اندیشہ ہے؟ پھر تو ہمیں اس کی غلط فہمی دور کرنی چاہیے۔ دوسروں کے تناسلی غدود کسی کام کے نہیں ہوتے۔ ٹرانسپلانٹ کے نقطۂ نظر سے وہ کسی بھی سائنسی اہمیت کے حامل نہیں ہوتے۔ زیادہ سے زیادہ کتوں کی خوراک بن سکتے ہیں۔''

''دیکھو تمھاری پیالی ہل رہی ہے۔'' میں کہتا ہوں۔ ''ایک اور چائے شاید اسے استحکام

بخشے۔‘‘

اور ایک دن وہ مریض کسی کو اطلاع دیے بغیر اسپتال سے چلتا بنا۔ جیسا کہ ایسے حالات میں ہوتا ہے، احتیاط کے ساتھ رجسٹروں کی خانہ پُری کردی گئی۔ ایک دوسرے مریض کو وہ بستر دے دیا گیا جو کہ اسپتال کی راہداری میں قبضہ جمائے ہوئے تھا۔ وہ ایک روایتی مریض تھا جو مرنے کے لیے سرکاری اسپتال کی راہ لیتے ہیں۔ وہ مریض دو ہفتے کے بعد آپریشن تھیٹر میں جاں بحق ہوگیا۔ اس وقت آپریشن ماسک کے اندر میں ہی تھا۔ اگرچہ عام طور پر اس وقت ہم لوگ ٹیرس میں نہیں جایا کرتے تھے مگر جانے کیوں میرے تھکے ماندے قدم اس کھنڈر نما عمارت کی طرف اٹھ گئے۔ اس کے ٹیرس پر نیم جاں بلب پتنگوں سے لڑ رہے تھے، سائے کرسیوں اور ستونوں سے مباشرت کے انداز میں لپٹے ہوئے تھے اور ایک طفیلی پودے پر کوئی چڑیا بار بار پَر پھڑ پھڑا رہی تھی۔ کیتن نے میری میز پر ٹی پاٹ رکھتے ہوئے کونے کی طرف اشارہ کیا جہاں ڈاکٹر پنچم سیناپتی ایک اور میز پر کسی شخص کے ساتھ بیٹھا تھا۔ پنچم نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے بلایا اور جب میں ٹی پاٹ اور پیالی اس کی میز پر رکھ کر کرسی پر کولھے رکھ رہا تھا، اس کے ساتھی کو دیکھ کر مجھے حیرت نہیں ہوئی۔

’’اسے اپنی شرارت پر ندامت ہے۔‘‘ پنچم کہتا ہے۔ ’’اور وہ بہت جلد تمھارے پاس معذرت کے لیے آنے والا تھا۔‘‘

’’ایسے واقعات سرکاری اسپتال میں اکثر ہوجایا کرتے ہیں۔‘‘ میں کہتا ہوں، مگر مجھے لاپروائی برتنے کے لیے بڑی محنت کرنی پڑ رہی ہے۔ ’’سرکاری اسپتالوں میں مرجانے والا مریض دوسرے کے حق میں اچھا ہی کرجاتا ہے۔ یہاں مریضوں کی ایک لمبی قطار لگی رہتی ہے۔ شکریہ۔‘‘

’’مگر یقین کیجیے۔‘‘ مریض جواب زیادہ لاغر اور ایک جنونی کیفیت لیے ہوئے دکھائی دے رہا تھا، کہتا رہا۔ ’’میں نے اکثر آدھی رات کو انسانی سایوں کو دیواروں پر منڈلاتے دیکھا ہے۔ ڈاکٹر صاحب، اس اسپتال میں کچھ اسرار ضرور ہے۔ آپ کو اس معاملے کی جانچ کرنی چاہیے۔ ہوسکتا ہے، الزام آپ کے سر آئے۔‘‘

’’کیا واقعی؟‘‘ میں پہلی بار خود کو بے چین پاتا ہوں۔ میں احتیاطاً خاموشی اختیار کرتا ہوں۔ میں زیادہ دیر ٹیرس پر بیٹھ نہیں پاتا۔ ان سے الگ ہوتے وقت میں دیکھتا ہوں کہ دونوں

میز کے آر پار بیٹھے میٹھی نظروں سے ایک دوسرے کو تاک رہے ہیں۔

اسپتال لوٹ کر میں راہداریوں میں ٹہلتا رہتا ہوں۔ میں نے ڈاکٹروں کے کمرے میں بیٹھ کر ایک پیالی چائے پی ہے۔ ایک ایمرجنسی کیس اٹینڈ کیا ہے۔ پھر اسپتال میں بہت سارے ڈاکٹر ہو گئے ہیں۔ میں اپنی کار میں گھر لوٹتا ہوں۔ شہر مجھے اپنی گرفت میں لینے کے لیے چاروں طرف سے دوڑ پڑتا ہے۔ آج سڑک پر لوگ جانے کہاں سے اتنی تعداد میں نکل آئے ہیں۔ ونڈ اسکرین سے تارے پھسلتے جا رہے ہیں۔ ایک راہگیر نے میرے بونیٹ پر تھوکنے کی کوشش کی ہے۔ شہر کا مزاج کچھ بگڑا ہوا ہے۔ میں اپنی گلی میں لوٹ کر خوش بھی ہوں اور نہیں بھی۔ میرے گیراج کے شٹر پر کسی نے پیشاب کر دیا ہے۔ گیلی انگلیوں کو دیوار پر رگڑتا ہوا میں پھاٹک سے اندر جاتا ہوں۔ میرا کتا اپنی کوٹھری میں دُبکا پڑا ہے۔ ایک شہر میرے اندر بھی ہے۔ میں آنکھیں موند کر اس میں کھو جاتا ہوں۔

میں اپنی سوچ کے لیے دوسروں کی رہنمائی اختیار نہیں کرتا۔ مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں نے ایک خالص ذاتی نہج اختیار کر رکھی ہے اور ہر معاملے میں، میں ایک ایسا انسان ہوں جسے کم سمجھا گیا ہے۔ جب میں نے ڈاکٹری کا پیشہ اختیار کیا تو یہ میرے لیے نقطۂ عروج تھا۔ ان معنوں میں کہ اس کے بعد میرا بتدریج زوال ہونا شروع ہو گیا۔ انسان کی تمام کامیابیوں کو اس تحریک صارفین کے دور میں ہم پیسوں سے ناپنے پر مجبور ہیں، مگر پیسے بذات خود ہمیں کہیں نہیں لے جاتے اور پیسے کی دوڑ میں آخر ایک ایسا مقام آتا ہے جب خود پیسے اپنے معنی کھو بیٹھتے ہیں۔ اس دن اسپتال کے لان میں وارڈ ماسٹر نے مجھے ڈاکٹر پنچم کا پیغام دیا۔ جس عمارت میں پوسٹ مارٹم ہوا کرتا ہے، پنچم اس کی پہلی منزل کے برآمدے پر بیٹھا ہے۔ مجھے دیکھ کر اس نے مسکرانے کی کوشش کی ہے جو اس وقت غیر فطری سا لگ رہا ہے۔

''ان دنوں تم بہت مصروف ہو گئے ہو۔'' وہ کہتا ہے۔ ''اتنے پیسے کا کیا کرو گے؟''

''یہ ان سے پوچھو جو پیسے کے منتہا پر کھڑے ہیں۔'' میں مسکراتا ہوں۔ ''میں تو صرف کبوتروں کو رِجھانے کے لیے دانے ڈال رہا ہوں۔''

''بہت خوب!'' وہ ہنستا ہے۔ ''یوں دیکھا جائے تو میں بھی کم بندۂ شکم نہیں ہوں مگر ساری مٹی پلید ہو جاتی ہے جب میں اپنے ضمیر کے سامنے جواب دہ ہوتا ہوں۔ کاش اپنے کسی جواز سے میں اسے مطمئن کر پاتا۔ کاش ایسا ممکن ہوتا۔'' یکایک وہ چپ ہو جاتا ہے اور اس کا چہرہ اجنبی لگنے

لگتا ہے۔

''اچھا پنچم۔'' میں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہتا ہوں۔ ''کیا ہمیں نہیں لگتا کہ ہم ٹیرس کی بے تکلفی کھو بیٹھے ہیں، ہمیں ٹی پاٹ ایک مرکز پر لا نہیں پاتا۔''

''بالکل۔'' وہ کہتا ہے۔ ''کاش اس کے ساتھ میں ہم جنسیت میں ملوث نہ جاتا۔''

''مجھے ذرا سمجھنے دو۔'' میں حیران رہ جاتا ہوں۔ ''کیا واقعی؟ مگر تم نے احتیاط تو برتی ہوگی۔ تم نے انسدادِ حمل کی تھیلیاں تو یقیناً استعمال کی ہوں گی؟ اپنے ساتھ رکھا کرو۔''

''وہ ایک اتفاق تھا اور صرف ایک بار۔ آہ!'' پنچم شاید کسی دوسری دنیا سے بول رہا ہے۔ ''ہم لوگ بیڈفورڈ لین میں اس کے گھر میں ملے تھے۔ وہ بہت دکھی تھا۔'' شاید اس کے پاس اس سے زیادہ کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔

میں مزید تفتیش مناسب نہیں سمجھتا۔ ہم اسپتال سے باہر نکل آئے ہیں۔ شہر کو روشنی اور تاریکی نے شطرنج کی بساط کی طرح سفید اور سیاہ خانوں میں بانٹ لیا ہے۔ آسمان تاروں سے دھندلا ہوگیا ہے جیسے مچھلیاں کثیف پانی کے اندر سے تاک رہی ہوں۔ ایک پرندہ دیر تک ہمارے سروں پر اڑا کیا۔

''کیوں؟'' پنچم کہتا ہے۔ ''ہمیں بار بار ایک ہی انداز سے مفتوح ہونا پڑتا ہے۔''

دھیرے دھیرے چلتے ہوئے ہم دھندلکے میں کھو جاتے ہیں اور ہمیں اس کا پتہ بھی نہیں چلتا۔ یہ شہر ہمارے ساتھ انصاف کیوں نہیں کرتا؟ ہم کیوں اتنی سوچ کے عادی ہو گئے ہیں؟ وہ جو اس ملک کی تقدیر لکھ رہے ہیں، ہم کیوں ان کا گناہ اپنے سر لیں؟ کتنے انقلابات آئے گئے، معاملہ وہیں کا وہیں رہا۔ کیا تمھیں لگتا ہے میرے معاملے میں ساری ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی ہے؟''

''شاید۔ یا پھر یہ کہنا مشکل ہے۔'' میں کہتا ہوں۔

''ہم الزامات سے بری ہونے کی کاوش میں زیادہ ہی سفید پوشی اختیار کر لیتے ہیں۔ خدا کو پالینا اور بس، جیسے لاکر کی چابی آپ کے ہاتھ آ گئی ہو۔ پنچم، ٹیرس پر ہم زیادہ آرام سے بیٹھ کر پورے معاملے کو سلجھا سکتے ہیں۔''

''کون جانے۔'' پنچم آہ بھرتا ہے۔ ''مگر جب تم نے ٹیرس کا نام لیا ہے تو مجھے اچانک چائے کی طلب ہونے لگی ہے۔ اس کتے کی طرح جس کی رال گھنٹی کی آواز کے ساتھ ٹپک جاتی ہے۔''

کمبر اسٹریٹ ٹرام ڈپو کی پشت پر واقع ہے، اس پر وہ پرانی عمارت ابھرتی ہے۔ سامنے سڑک سے دوسرے کنارے کے احاطوں تک پولس کا قبضہ ہے۔ لوگ پھاوڑے، ہتھوڑے اور چھینی اٹھائے عمارت کی چھت کو گرانے میں مصروف ہیں۔ تو آخر کار عمارت منہدم کی جارہی ہے۔

ٹیرس سے مزدور ہٹ گئے ہیں۔ انھوں نے اس کا زیادہ تر حصہ ڈھا دیا ہے۔ نیچے کے ستونوں کو ایک اکسکو ٹیر نے دھکا دیا ہے۔ بچا کھچا ٹیرس زمیں بوس ہوتا جارہا ہے۔ دھول کی چادر کہاسے کے مانند کمبر اسٹریٹ پر پھیل رہی ہے۔ اس میں کیتن دکھائی دیتا ہے۔ وہ روشنی کے تکون میں ٹھہر کر اپنی دھندلی عینک کے اندر سے ہماری طرف تاکتا ہے، پھر اندھیرے میں غائب ہوجاتا ہے۔

''کیتن اب کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا۔'' پنچم سرگوشی کرتا ہے۔ ''اب ہم ان مکالموں کا کیا کریں گے جو ہم اس ٹیرس میں لایا کرتے تھے؟ اور تمھیں خوب پتہ تھا ایک دن یہ ہونے والا ہے۔''

''میں نے کبھی نہیں سوچا تھا یہ اتنی جلد ہونے والا ہے۔'' میں جواب دیتا ہوں۔ ''میں شرمندہ ہوں۔ ایک طرح سے دیکھا جائے تو یہ الزام جائز طور پر تم مجھ پر عائد کر سکتے ہو۔''

وہ عمارت اب وہاں نہیں ہے۔ اس کی جگہ ایک نرسنگ ہوم نے لے لی ہے۔ پنچم نے اپنا تبادلہ کسی دوسرے اسپتال میں کروالیا ہے۔ اب شاذ و نادر ہی ہم فون پر ایک دوسرے سے رابطہ قائم کرتے ہیں۔ اب ہماری گفتگو رسمی ہوتی ہے جو تکلفات سے پرے نہیں جاتی۔ شہر ہر پل میرے تعاقب میں لگا رہتا ہے۔ میں اس سے اُوب چکا ہوں۔ مجھے دل کھولنے کے لیے ایک ٹیرس کی تلاش ہے جہاں ایک ٹی پاٹ کے دونوں جانب بیٹھ کر ہم جینے کی کوشش کر سکیں، جہاں پنچم کو ابھی اپنی ہم جنسیت کا پتہ نہ چلا ہو۔

تارے لرز رہے ہیں

صدیقہ بیگم

صفی نے کمرے میں داخل ہوتے ہی کتابیں پٹک دیں، میں چونک پڑی۔ کیا ہو گیا اس صفی کی بچی کو۔ پھر فوراً ہی اماں کی آواز سارے کمرے میں کچھ اس طرح گونجی جیسے آندھی آ رہی ہو۔ اور ان کے قدموں کی آواز زمین کے ساتھ میرے دل کو بھی دہلا رہی تھی۔

''واہ ری لونڈیا واہ، کالج میں کیا پڑھنے لگی ہے، بڑا دماغ ہی چڑھ گیا ہے۔ آئی اور کتابیں پھینک دیں، جیسے مفت ہی تو آئی ہیں۔ ٹھکانے سے الماری میں لگا کے رکھ۔''

اماں جی تو یہ نادر شاہی حکم صادر کر کے یہ جا وہ جا۔ صفی کا منہ سوج گیا جیسے برّوں نے کاٹ لیا ہو۔ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگی۔

''خود کبھی پڑھا ہو تو جانیں بھی کہ کیا ہوتا ہے۔ ہم آپ تھکے تھکائے آئے۔ نہ چائے نہ ناشتہ، بس کتابیں سجاؤ، جیسے کوئی کتابوں کی دکان ہو۔''

''مگر صفی تم نے بھی تو اس بے دردی سے پھینکیں، جیسے واقعی مفت کی چیز ہو۔ اور پھر کتابیں!'' میں نے ناول پر سے نظریں ہٹاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

''بس چپ رہو تم۔ بڑی آئیں نصیحتیں کرنے والی۔'' صفی نے زور سے سر کو جھٹکا دیا اور کھلے ہوئے بال اس کے سینے پر لہرانے لگے۔ میں نے کتاب پر نظریں گاڑ دیں اور کنکھیوں سے دیکھنے لگی۔ صفی جھینپ گئی، اس نے بالوں کو آہستہ سے پیچھے کر دیا اور میری طرف غصے سے دیکھنے

لگی۔

''میرا کیا ہے، بھاڑ میں جھونکو... کبھی جو علم آلے۔'' میں جل ہی تو گئی۔ ایک تو ان کے بھلے کی بات کہو اور اوپر سے صلواتیں سنو۔

''بس رہنے دو اپنی دقیانوسیت۔ مجھے نہیں چاہیے۔'' صفی کا پارہ ایورسٹ کی چوٹی سے بھی بلند ہو گیا تھا۔ صورت سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ اتنے میں سامنے سے ہماری نئی نویلی بھابی، چلی مستانہ وش بادِ صبا، کی طرح آتی نظر آئیں۔ انھیں آتا دیکھ کر مجھے ڈھارس سی بندھی جیسے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ چلو اس تُوتُو میں میں سے جان چھوٹی۔

''اری، آگئی کیا میری صفی۔ آج کہاں دیر لگا دی تھی۔'' مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے میری امیدوں کو پھول کی طرح مسل ڈالا ہو۔

''زہرہ کے چلی گئی بھابی۔ کچھ نوٹس لینے تھے۔''

''کیسے نوٹ؟ اُدھار روپے تھے کیا۔'' مجھ سے ہنسی ضبط نہ ہو سکی۔ بھابی نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔

''نوٹ نہیں، پڑھائی کے نوٹس... کلاس کے۔''

بھابی نے 'اچھا' کچھ اس انداز سے کہا جیسے سمجھ ہی تو گئیں۔ ''میں کیا جانوں، کوئی اسکول کالج میں تھوڑا ہی پڑھی ہوں۔ اچھا اٹھ چل چائے پئیں، کتنی دیر سے تیرے انتظار میں رکھی ٹھنڈی ہو رہی ہے۔'' بھابی صفی کے گلے میں ہاتھ ڈال کر چل دیں، اور میں کمرے ہی میں پڑی سڑوں۔ مجھے چائے تھوڑا ہی پینا ہے۔ آج میں دیکھتی ہوں ان کو۔ میں اٹھ کر پچھلے دروازہ سے خالدہ کے یہاں سرک گئی۔ اگر بدلہ نہ لیا تو میرا نام برجیس نہیں۔ جب دیکھو یہی... آؤ ہم بھی تو گھر میں رہتے ہیں۔ صفی ان کو جوتے کے برابر بھی نہیں سمجھتی اور یہ ہے کہ ہر دم اس کے دُم کے پیچھے لگی رہتی ہے۔ جب تک وہ کالج سے نہیں آتی، بیگم صاحب اپنے کمرے سے کیا مجال جو نکل آئیں اور جیسے ہی اس کی آواز سنی دوڑی ہوئی آگئیں۔ میری آنکھوں میں بھابی کی شکل پھر گئی۔ گلے میں دوپٹہ پڑا ہوا وہ بھی رسی کی طرح اور اماں بی جیسے چیخ رہی ہوں۔

''بہو اتنی مرتبہ کہہ دیا دوپٹہ ٹھیک سے اوڑھا کر بیاہیوں کی طرح۔''

''اوڑھے تو ہوں بوا اور کیسے؟''

''یہ کیا ڈھنگ ہیں۔ دوپٹہ گلے میں پڑا ہے اور گیند اچھالتی پھر رہی ہو۔'' بھابی کی

نظریں جھک گئیں، انھوں نے آہستہ سے دوپٹہ کے البیٹ کھولے اور سینے پر تان لیا۔

''برجیس آپا کتنی مرتبہ کہا کہ میرا جمپر کاٹ دو پر تم نے کاٹ کر نہیں دیا۔'' خالدہ مجھے دیکھ کر دوڑی آئی۔ میرا غصہ دھیما پڑ گیا۔

''اچھا۔ لا کاٹ دو، اچھا سا۔ بالکل نئے فیشن کا۔''

''ویسا ہی جیسا صفی آپا پہنے تھیں۔'' جہاں جاؤ وہاں صفی آپا ہی کا ذکر۔ میں تو گھبرا گئی۔ یہ بھی کوئی بات ہے، دنیا جہاں میں لے دے کر ایک صفی ہی تو رہ گئی ہے۔

''نہیں ویسا نہیں۔ وہ تو نرا گنوارو سا ہے۔'' اور پھر میں خاموشی سے جمپر کاٹنے میں مشغول ہو گئی۔

''ایسا ہی تو آپا بھی کہہ رہی تھیں، یہی تو صفی آپا کے گلے کا ڈیزائن ہے۔''

''چھوڑو بھی۔ تمھیں پسند ہے تو بس ٹھیک ہے۔''

میں اٹھ کر چلی آئی جیسے سارا کھیل ختم ہو گیا تھا۔ یہی تو بس میں چاہتی تھی۔ میں نے کمرے میں آ کر اسٹوو جلایا۔ باورچی خانے سے کیتلی اور چائے کی پیالی لائی، میری نظر بھابی کے کمرے میں دریچے سے چھن کر صفی اور بھابی پر پڑی۔ کس قدر گھٹ رہی تھی۔ جی میں تو آیا کہ ذرا سنوں کیا باتیں ہو رہی ہیں پھر اتنی ہمت نہ ہوئی اور میں کمرے میں آ کر چائے بنانے لگی۔ میں بھی کبھی جو بھابی کو پوچھوں یہاں تو بھابی بھابی کہتے منھ دکھتا ہے اور یہ ہیں کہ کبھی سیدھے منھ بات تک نہیں کرتی۔ صفی کی کیوں نہ خوشامد کریں گی، کالج میں جو پڑھتی ہے اور بھابی سے تو ہر وقت کھسر پسر، کالج کی ایک ایک بات ان کے آگے دہراتی ہے۔ میں تو اس کی کچھ ہوتی ہی نہیں جیسے۔ بس لے دے کر بھابی ہی رہ گئی ہیں۔ آنے دو صفی کا امتحا۔ وہ دماغ دار جو ایک دن بھی کبھی بات کر لے۔ میری نظریں اسٹوو کے لال نیلے شعلوں میں الجھ کر رہ گئیں، میں انجانے طور پر گنگنانے لگی، 'چار دن اور ہوا باغ کی کھائے بلبل'۔

دیر تک یہ مصرع دماغ سے لے کر زبان تک مجھ پر حاوی رہا۔ چائے پی کر میں باورچی خانے میں بیٹھ گئی اور پیاز کاٹنے لگی۔ یوں ہی بے کام کا ایک کام نکال لیا۔ بھابی اور صفی کی آواز باورچی خانے میں صاف سنائی دے رہی تھی، اور میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ بغیر جانے بوجھے۔

''ہاں تو کبھی تمھارے پروفیسر لڑکیوں کو بھی ڈانٹتے ہیں؟''

''لڑکیوں کو کیا ڈانٹتے، وہ تو لڑکوں کو بھی کچھ نہیں کہتے، اسی لیے تو ان کے کلاس میں لڑکے جی کھول کر شرارت کرتے ہیں۔''

''اچھا! لڑکے شرارت کرتے ہیں؟''

''اور کیا، ابھی بتایا نہیں۔ کل ہی کملا کی چوٹی کسی نے پیچھے سے بنچ سے باندھ دی اور جب وہ اٹھ کر چلی تو گھوڑے کی ڈور کی طرح تن گئی۔''

بھابی کی آواز کے ساتھ کمرے میں قہقہہ گونجا۔ بھابی اور صفی دیر تک ہنستی رہیں۔

''اچھا خیر۔ چھوڑو بھی یہ قصے، مجھے انگریزی پڑھاؤ۔ میں بھی کالج میں داخلہ کراؤں گی۔'' اور نہ جانے کیوں بھابی کو پڑھنے کا شوق ہوا۔

''اجی، یہ تمھارے بس کا روگ نہیں، خون پسینہ ایک کرنا پڑتا ہے۔'' جیسے بس یہی تو ایک پڑھنے والی ہیں۔

''آخر میں کیوں نہیں پڑھ سکتی، کیا میں آدمی نہیں۔''

''ارے بھائی۔ بڑا دماغ کھپانا پڑتا ہے۔'' اور بھابی خاموش ہوگئیں جیسے وہ شاخ ٹوٹ رہی ہو جس پر انھوں نے جھولا ڈالا تھا۔ کم عمری کی شادی ہائے اللہ۔ میرا دل خود بخود بھابی کی طرف کھنچ رہا تھا۔ پرسوں کی بات ہے جب بھابی نے پڑھائی کا بھائی جان سے ذکر کیا تو انھوں نے کیسا مذاق اڑایا۔

''بڈھی گھوڑی لال لگام، ابھی کیا تھا۔ کل کو کہنا کلب ٹینس کھیلنے جاؤں گی۔''

اتنا پڑھے لکھے بھیا اور ایسی باتیں!

''سترہ برس کی بڈھی گھوڑی ہوگئی!'' بھابی نے جواب دیا۔

''اور کیا بیٹی، لڑکی کی شادی ہوئی کہ سن سے اتری۔ بارہ برس ہی کی کیوں نہ ہو۔ یہ گال بس چار دن کے ہیں، پھر جہاں پیٹ میں پڑا سب ختم۔''

بھابی کے اوپر سرخی سی دوڑ گئی اور آنکھیں جیسے ان میں لال ڈورے سے پڑ گئے... آخر اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ بھائی جان بدن میں گویا کاٹو تو لہو نہیں۔ سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا، اماں یہ کہہ کر چل دیں اور بھابی چھپاک سے اپنے کمرے کی طرف جھپٹیں۔ بس مجھے ایسا معلوم ہوا کہ فضا میں آنچل لہرایا اور پھر غائب، میں بھی پیچھے پیچھے ان کے کمرے میں پہنچی۔ دیکھا تو الٹی پڑی رو رہی ہیں اور اس صفی کی بچی سے اتنا نہ ہوا کہ جا کر چپاتی، الٹا منھ پچکا کر

کہتی ہے، ''ارے بھابی، یہ پڑھنا وڑھنا تمھارے بس کا روگ نہیں۔'' اور بھابی اس کا منھ تاکنے لگیں جیسے صفی نے ان کو گالی دے دی ہو لیکن یہ بلا وجہ رونا کیسا؟

پھر...

''چاہے جو ہو جائے، میں تو تجھی سے پڑھ کر رہوں گی۔'' میں نے جھانک کر دیکھا، بھابی صفی سے چمٹی ہوئی تھیں، ''میری صفی پڑھائے گی کیسے نہیں۔''

''ہائے اللہ! چھوڑو بھی۔ سچ مچ بھابی تمھاری یہ کیا بُری عادت ہے۔ اس طرح بھینچتی ہو کہ ساری ہڈیاں ہل جاتی ہیں۔'' میری نظریں غریب صفی پر پڑیں جس کو بھابی کی گرفت اور زیادہ پکڑے ہوئے تھی۔ مجھے صفی کی صورت دیکھ کر ہنسی آ گئی اور بھابی نے نہ جانے کیوں مجھے دیکھتے ہی گھبرا کر صفی کو چھوڑ دیا جیسے چوری پکڑی گئی۔ تب کہیں جا کر صفی کے جان میں جان آئی۔

''جاؤ بھائی جان سے پڑھو۔ وہ تو اچھا پڑھاتے ہیں، مجھے بھی تو انھوں نے ہی پڑھایا ہے۔''

''میں تو نہیں پڑھتی بھائی جان سے۔'' بھابی نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

''بھائی جان سے!!'' مجھے ہنسی آ گئی۔ ''اے لو، تمھارے بھی بھائی جان ہو گئے۔''

میں نے پھر جھانک کر دیکھا، بھابی صفی سے بری طرح چمٹی ہوئی تھیں۔

''دیکھو کتنی دفعہ منع کر دیا، نہ جانے تمھیں کیا ہو گیا ہے۔ آخر کوئی حد بھی ہے، سارا جسم پھوڑے کی طرح دُکھنے لگا ہے۔''

''اچھا میرا داخلہ بھائی جان سے کہہ کر کالج میں کرا دے، پھر کبھی جو تجھے کچھ کہوں۔'' بھابی نے عاجزانہ انداز میں کہا۔

''میرا کیا ہے، میں کہہ دوں گی مگر اپنی بر جی آپا کو منا لو۔''

'اپنی بر جی آپا کو منا لو' مجھے دھکا لگا، جیسے میں ہی تو ان کے ہر کام میں روڑا اٹکاتی ہوں۔

پھر...

چند روز بعد میں نے دیکھا کہ بھابی کی پڑھائی سارے گھر کا ایک اہم موضوع بن گئی۔ دن بھر اس پر جھگڑا ہوتا تھا۔ مجھے رہ رہ کر بھائی جان پر غصہ آتا۔ آخر ان کا کیا جاتا ہے۔ وہ پڑھنے جاتی ہیں تو جانے دو، آخر صفی بھی تو جاتی ہے۔ اگر غریب بھابی چلی گئی تو کیا گناہ ہو گیا۔ اور کتنے اچنبھے کی بات ہے کہ وہی بھائی جان کل تک ایک تعلیم یافتہ بیوی کے آرزومند تھے، آج اپنی بیوی

کی تعلیم سے گھبرا رہے تھے۔

''آخر تجھے کیا پڑی ہے۔لکھ پڑھ کر کیا نوکری کرے گی؟''

''توصفی کو نوکری کے لیے پڑھا رہے ہو کیا؟''

''صفی... اس کی اور بات ہے۔اس کا اور تیرا کیا مقابلہ۔''

''بس بھابی میرا انام مت لینا۔اپنا قصہ آپ طے کرو۔مجھے بیچ میں کیوں سانتی ہو۔''

اور بھابی نے صفی کو گھور کر دیکھا، گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے مسل ڈالیں گی۔اور کرو چھپ چھپ کر صفی سے باتیں، اور لگاؤ کلیجے سے، ارے میں تو اس کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ بھابی کی تیز نظروں کے جواب میں صفی نے آخر بھائی جان سے کہہ ہی دیا۔

''ایسے ہی ان کو پڑھنا ہے تو آپ سے کیوں نہیں پڑھتیں ۔کیا فائدہ روپیہ خراب کرنے سے۔'' میں بھابی کو اٹھا کر اپنے کمرے میں لے گئی۔ وہ چپ چاپ زمین پر نظریں گڑوئے ہوئے آ کر بیٹھ گئیں۔ان کی پُرآب آنکھیں گویا خود ہی آنسوؤں کے بوجھ سے گھبرا رہی تھیں جو پلکوں کے سہارے رکے ہوئے تھے اور گرنے سے پہلے کسی خاص سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔انھوں نے کئی بار آہستہ آہستہ پلکیں جھپکائیں، جیسے اس طرح وہ ان آنکھوں میں جذب ہی تو ہو جائیں گے۔ٹیگور، اقبال کی تصویریں گویا بھابی کا خیر مقدم کر رہی تھیں اور کمرے کی تمام کتابیں گویا بھابی کو زور زور سے پکار رہی تھیں۔ بھابی کی نظریں تصویر پر پڑیں اور جھک گئیں۔ وہ آنسو جو کسی اشارے کے منتظر تھے، برسات کی بوندوں کی طرح ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ بھابی کے آنے کی خوشی کے باوجود افسردگی کی ایک لہر سی میرے سارے جسم میں دوڑ گئی۔ مجھے جھرجھری سی محسوس ہوئی۔ میں اور بھابی... 'تارے ٹمٹما رہے تھے'، خاموشی سے اس طرح باتیں کر رہے تھے جیسے ایک دوسرے کو بہت دنوں سے جانتے ہوں، ان بہن بھائیوں کی طرح جو آپس میں لڑ کر ایک دوسرے کو گھورتے ہیں جیسے ماضی کے افسانے آنکھوں ہی آنکھوں میں دُہرا رہے ہوں۔ ایک طویل خاموشی کے باوجود بھی ایک دوسرے سے کتنا قریب، زبان سے بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس شاخ کی طرح جو پھول کے ٹوٹ جانے کے باوجود اپنی آغوش وا کیے رہتی ہے۔

اس واقعہ کے بعد ہم دونوں ایک دوسرے سے اتنا نزدیک ہو گئے جیسے وہ دو ستارے... وہ دو بہن بھائی۔

اب بھابی ہر روز شام کو مجھ سے پڑھا کرتی تھیں۔اور بھائی جان سے تو وہ بہت گھبراتی

تھیں۔ کتنا اچھا پڑھاتے ہیں بھائی جان۔ سارا گھر ان کے پڑھانے کی تعریف کرتا ہے۔ اور بھابی... ان کے امتحان میں تو وہ فیل ہو گئے۔ ان کو دور سے آتا دیکھ کر وہ تکیے میں کتاب دُبکا لیتیں۔ ماضی کے دھندلکے میں مجھے ایسا معلوم ہوا کہ کہیں کہیں دھیمی روشنی دکھائی دے رہی ہے، گویا قبرستان میں چراغ جل رہا ہے۔ اور اس گھٹا ٹوپ اندھیارے میں، جیسے قبرستان کے کھنڈروں سے میں ہانپتی کانپتی چلی آ رہی تھی، تیز تیز قدم جماتی ہوئی، کبھی ٹھٹکتی اور پیچھے مڑتی، پھر آگے بڑھ جاتی... آکاش پر کبھی تو تارے ٹمٹماتے اور کبھی بالکل ہی گُل ہو جاتے، جیسے کسی نے پھونک مار کر بجھا دیے ہوں۔

''یہ کون سی کتاب پڑھ رہی ہے؟''

''طلسم ہوش رُبا تھوڑا ہی ہے۔'' مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے بال پکڑ کر گھسیٹ لیے ہوں۔ کمبخت یہ کتابیں پڑھتی ہے۔ بچپن یہ سب جھیلتے گزر گیا اور اب... بھابی کی کتاب تکیے میں دبی ہوئی تھی۔

''تمھاری کتاب نہ ہوئی، طلسم ہوش رُبا ہو گئی۔''

بھابی مسکرائیں اور پھر دیوانہ وار مجھ سے لپٹ گئیں۔ میری آنکھوں کے سامنے صفی آ گئی۔ بھابی پوری طاقت سے اس کو بھینچ رہی تھیں۔ اس کی سانس پھول رہی تھی۔ ''اوئی اللہ، چھوڑو بھی، کیا بری عادت ہے جو اس طرح بھینچتی ہو۔ ساری ہڈیاں ہل جاتی ہیں۔'' میرے بھی جی میں آئی کہ اسی طرح چیخوں، پھر جیسے کسی نے منھ پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ اور میری آنکھیں ایک لذت آمیز کرب سے اچانک پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ صفی بیوقوف ہے جو اس زور سے چیختی ہے۔ کوئی سنے گا تو کیا کہے گا۔ میں جھینپ سی گئی۔ بھابی کی گرفت ڈھیلی ہو چکی تھی اور ان کی سانس... جیسے بہت دور سے دوڑتی ہوئی چلی آ رہی ہوں... بے نیل و مرام۔

''میں نہ پڑھتی یہ انگریزی ونگریزی۔ مجھے تو کہانیوں والا کوئی مزیدار رسالہ دے۔'' اور پھر جواب کا انتظار کیے بغیر کسی رسالے کا ایک پرچہ، نہ جانے کب کا پرانا، الماری سے نکال کر یہ جا وہ جا۔ میں دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ بھابی ایسی غائب ہوئیں کہ گھنٹوں کے لیے لاپتہ۔

''تو اب یہ رسالہ پڑھا جا رہا ہے۔'' میں چونک ہی تو پڑی۔ بھابی کے کمرے سے صفی کے بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ تمھارے لیے ہی تو اختر الایمان نے کہا ہے:

یوں ہی اک دور آتا ہے یوں ہی اک دور جاتا ہے

مگر میں دو اندھیروں میں ابھی تک ایستادہ ہوں

بس اس کی تنقید سے تو خدا بچائے، جس کے پیچھے پڑتی ہے ہاتھ دھو کر پڑتی ہے۔ ادھر بھائی اور مصیبت، میں سچ مچ ان کو سمجھنا کوئی خالہ جی کا گھر نہیں۔ اب جو رسالوں کا دور شروع ہوا تو بس صبح سے شام تک یہی مشغلہ۔

رات میں بھابی کے کمرے میں دندناتی پہنچ گئی۔ یہ بھی تو نہیں دیکھا کہ کمرے میں کوئی ہے بھی کہ نہیں۔ بھلا دس بجے ان کے کمرے میں ایسے بے دھڑک پہنچ جانا۔ امی دیکھ لیتیں تو آفت ہی تو کر دیتیں۔

''بہو کو آرام کرنے بھی تو نہیں دیتیں یہ لونڈیاں، جب دیکھو گھسی رہتی ہیں اس کے کمرے میں۔'' بڑا ان کے آرام کا ہی تو خیال ہے۔ ویسے تو جب دیکھو ایک نہ ایک جھگڑا کھڑا رکھتی ہیں۔ ذرا موقع ملا اور لڑیں، مگر ہم ان کے کمرے میں جائیں تو آفت۔ جی میں تو آتا ہے کہ بالکل ان کے کمرے کا بائیکاٹ کر دوں۔ کیا ان کے کمرے میں جائے بغیر ہمارا کوئی کام رُکا پڑا رہ جاتا ہے؟ مگر اس میں بھابی کا کیا قصور۔ وہ بیچاری تو کس خوشامد سے کہتی ہیں:

''آیا کرو برجی، میرے کمرے میں جب چاہے۔ کس کا ڈر پڑا ہے تمھیں۔'' اور میرے قدم آپ ہی آپ کمرے کی طرف اٹھنے لگے۔ بھائی جان اپنی الماری کے قریب کھڑے نہ جانے کیا کر رہے تھے، مگر مجھے کیا۔ میں تو بھابی کے پاس گئی تھی اور بھابی کہہ رہی تھیں۔

''آخر میں کیا کروں، میں بھی تو مجبور ہوں۔ ایسی کہانیاں پڑھنے سے ہوتا کیا ہے... کوئی ان کے پڑھنے سے...''

مجھے آتا دیکھ کر بھائی جان نہ جانے کیوں گھبرا سے گئے۔ انھوں نے پٹ سے الماری بند کر دی اور ایسے چپ ہوئے جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ پھر بھابی بولیں۔

''آخر اس کے پڑھنے میں کیا عیب ہے؟''

''عیب کیسے نہیں،'' وہ پھر بولے ''یہ رسالے تم کو نہیں پڑھنے چاہئیں۔''

''واہ، اگر عیب ہے تو پہلے اپنی بہن کو منع کرو۔ بعد میں مجھے کہنا۔''

''برجی کی اور بات ہے۔''

مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے چلتے چلتے کسی پتھر سے ٹکرا گئی۔ یہ آخر کیا ہے۔ صفی کی اور بات ہے، برجی کی اور بات ہے۔ یہ بھابی نے شادی کر کے ایسا کون سا جرم کیا ہے جو ان کی اور بات

نہیں۔

اور مجھے بھابی کی آنکھوں کے پپوٹے بوجھل معلوم ہوئے جن میں نہ جانے کتنے اَن دیکھے سپنے الجھ الجھ کر ٹوٹ رہے تھے۔ بھلا یہ خواب کہیں حقیقتوں کے سامنے ٹھہر سکتے ہیں۔ بھائی جان کمرے سے باہر نکل گئے اور بھابی مسہری سے اٹھ کر مجھ سے لپٹ گئیں۔

روشنی میں صفی کا رسالہ سامنے پڑا ہوا دکھائی دیا۔ وہ دروازے کی چوکھٹ پر کھڑی کہہ رہی تھی، ''اوئی اللہ، چھوڑو بھی، کیا بری عادت ہے جو اس طرح بھینچتی ہو کہ ساری ہڈیاں ہل جاتی ہیں۔''

اچانک بجلی بجھ گئی۔ سایہ غائب ہو گیا اور ہم دونوں اندھیارے میں سورج کو تلاش کر رہے تھے۔

میرے گالوں پر آنسوؤں کے قطرے گرنے لگے۔ میں نے اپنی آنکھیں بھینچ لیں، دوسرے کمرے میں صفی کے گنگنانے کی آواز ہلکے ہلکے سنائی دی۔

لیلائے آب و رنگ کا ڈیرا قریب ہے
تارے لرز رہے ہیں سویرا قریب ہے

مگر سچ تو یہ ہے کہ رات باقی ہے۔ سویرا بہت دور ہے۔ آنسوؤں کی منزل کے بعد کہیں تاروں کی محفل جگمگائے گی۔

درمیانی صنف کے سورما

سلام بن رزاق

بڑا ہی حیرت انگیز منظر تھا۔ حیرت ناک اور مضحکہ خیز۔ سڑک کی دورویہ فٹ پاتھوں پر تماش بینوں کا ایک میلا سا لگ گیا تھا۔ مکانوں کے چھجوں، گیلریوں، چھتوں اور دھابوں پر لوگ اُمڈے پڑ رہے تھے۔ سارا ٹریفک جام ہو گیا تھا۔ لوگ سواریاں روکے، بسوں اور کاروں سے گردنیں لٹکائے حیرت اور دلچسپی سے اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ ہنس رہے تھے، قہقہے لگا رہے تھے۔ بچے تالیاں بجا بجا کر اُچھل رہے تھے۔ عورتیں منھ میں آنچل ٹھونسے ہنسی ضبط کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

ایسا عجیب وغریب جلوس انھوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کسی نے بھی نہیں دیکھا تھا۔ جلوس میں شریک سارے افراد درمیانی صنف سے تعلق رکھتے تھے۔ جلوس کے آگے آگے ایک طویل القامت ہیجڑا ایک لمبا سا بانس اٹھائے چل رہا تھا۔ بانس پر سیاہ رنگ کا ایک ریشمی دوپٹہ بندھا ہوا تھا جو ہوا میں پرچم کی طرح لہرا رہا تھا۔ دوپٹے پر سلمیٰ ستارے ٹنکے دھوپ میں جگمگ کر رہے تھے۔ اس کے پیچھے چلنے والے ہیجڑے تین تین کی قطار میں چل رہے تھے۔ وہ لباس اور حلیے کے اعتبار سے پہلی نظر میں اسپارٹا کے سپاہی معلوم ہوتے تھے۔ بغیر آستینوں کے گھٹنوں تک لمبے جیکٹ، پیروں میں کاغذ کے مصنوعی جوتے اور کمر میں کاٹھ کی ایک ایک عدد تلوار۔ بیشتر کے ہاتھوں میں چوڑیاں تھیں اور ان کی چھوٹی چھوٹی چوٹیاں ان کے کاندھوں پر دائیں بائیں جھول رہی تھیں۔ ناکوں میں کیلوں اور ماتھے پر بندیا بھی تھی۔ بعض صرف چولیاں اور گھاگھرے پہنے ہوئے تھے۔ سب کے سب منھ سے ہائے ہائے کی آوازیں نکالتے، چھاتیاں پیٹتے، تالیاں بجاتے، مٹک مٹک کر چل رہے تھے۔ چوڑیوں

کی جھنکار سے فضا میں ایک ارتعاش سا پیدا ہو رہا تھا۔ بعض کے ہاتھوں میں چھوٹے بڑے بینر لٹک رہے تھے جن پر مختلف قسم کے نعرے لکھے ہوئے تھے۔

''ساری دنیا کے ہیجڑے ایک ہیں۔''

''کل دنیا ہیجڑوں کی ہوگی۔''

''ہم سے جو ٹکرائے گا، ہم جیسا ہو جائے گا۔''

''دیکھو دنیا اوٹ پٹانگ۔ نیچے منڈی اوپر ٹانگ۔''

''ہماری مانگیں پوری کرو۔''

کسی نے پوچھا، ''آخر یہ لوگ چاہتے کیا ہیں؟''

''شاید یہ لوگ اپنی حکومت بنانا چاہتے ہیں۔''

''ارے یہ لوگ حکومت بنا کر کیا کریں گے۔''

''تالیاں بجائیں گے اور ہائے ہائے کریں گے۔''

''اور یہ ان کی کمروں میں کاٹھ کی تلواریں کس لیے ہیں؟''

''لڑنے کے لیے۔''

''ان سے کون لڑے گا یار۔''

''سالے خود ہی سورما بن کر نکلے ہیں۔ واقعی ان سے کون لڑے گا۔''

''حکومت نے ان لوگوں کو کافی چھوٹ دے رکھی ہے۔''

''میں کہتا ہوں حکومت میں بھی ان سالوں کے بہت سے نمائندے بن چکے ہیں۔''

''بڑا بُرا زمانہ آ گیا ہے یار، لوگ اپنی نامردی کو بھنانے کا فن بھی جان گئے ہیں۔''

''کیا اس دیش میں اب انقلاب ان زنخوں کے توسط سے آئے گا؟''

ادھر جلوس آگے سرکتا جا رہا تھا۔ اب جو گروپ گزر رہا تھا، ان میں شامل ہیجڑوں کی گردنوں میں بڑے بڑے ڈھول لٹکے ہوئے تھے اور وہ دونوں ہاتھوں سے انھیں پیٹتے ایک خاص لَے پر گاتے ہوئے چل رہے تھے۔ گیتوں میں سوائے گالیوں کے اور کچھ نہ تھا۔

ڈھول بجاتے اور گالیاں بکتے وہ کبھی کبھی دونوں ہاتھ ہوا میں لہرا کر انگلیاں بھی چٹخانے لگتے۔

ان سب کی کمروں سے بھی ایک عدد کاٹھ کی تلوار لٹکی ہوئی تھی بلکہ بعضوں کی پشتوں سے دفتی

کی ڈھالیں بھی بندھی ہوئی تھیں۔ اتنے میں کہیں سے چند فوٹو گرافر نکل آئے اور کھٹ کھٹ ان کی بے شمار تصویریں کھینچ لی گئیں۔ فوٹو گرافروں کو دیکھتے ہی ہر ہیجڑا ایک خاص پوز میں کھڑا ہو گیا۔ کوئی اپنا ایک ہاتھ کمر پر اور دوسرا کاٹھ کی تلوار کے دستے پر رکھ کر اس طرح کھڑا ہو گیا جیسے کسی اَن دیکھے دشمن پر حملہ کرنے کے لیے پینترا بدل رہا ہو۔ کوئی ناک پر انگلی رکھے دہانہ کھولے، ہائے نوج کی تصویر بن گیا۔ کوئی دونوں ہاتھوں سے ڈھول پر تھاپ دینے کی اسٹائل میں کھڑا ہو گیا۔ کوئی کولہوں پر ہاتھ رکھے مٹکنے لگا۔ ہیجڑوں کے یہ مختلف پوز دیکھ کر لوگوں کا ہنسی کے مارے برا حال تھا۔ اخبار کے چند رپورٹرز بھی کہیں سے آدھمکے۔

''آپ لوگوں کے اس جلوس کا مقصد کیا ہے؟''

''کیا ضروری ہے کہ ہر کام کے پیچھے مقصد کا دُم چھلا بھی ہو۔''

''آپ لوگ لیفٹسٹ ہیں یا رائٹسٹ؟''

''عیاں راچہ بیاں۔ ہم تو درمیانی لوگ ہیں۔''

سارے زنخے ہو ہو کر کے ہنسنے لگے۔

''آپ لوگوں کے مطالبات کیا ہیں؟''

ایک ہیجڑے نے کان پر ہاتھ رکھ کر الاپنا شروع کر دیا۔ ''جو تیرا غم وہی غم ہے میرا۔۔۔''

''آپ لوگوں کا نظریہ؟''

''نہ مارو بلموا نجریا کے بان... نجریا کے بان...''

ایک ہیجڑا اپنی بائیں آنکھ دباتے ہوئے ایسے فحش انداز میں ہنسا کہ رپورٹر بغلیں جھانکنے لگا۔

''آپ لوگوں کا سیاسی بیک گراؤنڈ کیا ہے؟''

''ہمارا تو بس ایک ہی بیک گراؤنڈ ہے۔''

ایک موٹے سے ہیجڑے نے اپنے بھاری کولھوں سے سوال پوچھنے والے رپورٹر کو ایسا ٹھمکا لگایا کہ بے چارہ لڑکھڑا کر رہ گیا۔

آخر سارے رپورٹر تھک ہار کر ایک طرف کو ہٹ گئے اور جلوس پھر اسی طرح لہکتا مٹکتا آگے بڑھنے لگا۔ کسی طرح پولیس کو بھی اس عجیب و غریب جلوس کی خبر ہو گئی۔ سب سے پہلے تو ایک ٹریفک انسپکٹر اپنی موٹر سائیکل پھٹ پھٹاتا ہوا جلوس کے تعاقب میں روانہ ہوا۔ جلوس کے سامنے پہنچ

کر اس نے اپنی موٹر سائیکل کو ترچھا کر کے اس ہیجڑے کا راستہ روک دیا جو سب سے آگے دوپٹے کا پرچم لہراتا ہوا چل رہا تھا۔

''ارے یہ کیا ہو رہا ہے؟'' انسپکٹر نے کڑک کر پوچھا۔

''مگر یہ جلوس کس کا ہے؟ تم لوگ کس پارٹی سے تعلق رکھتے ہو؟''

''ہمارا کسی پارٹی سے تعلق نہیں، البتہ ہر پارٹی کو ہم سے سروکار ہوتا ہے۔ ہم بیچ کے لوگ ہیں۔''

''تم نے یہ جلوس کس کی اجازت سے نکالا؟ تمھارے پاس اجازت نامہ ہے جلوس نکالنے کا؟''

پرچم بردار ہیجڑے نے اپنے پاس ہی کھڑے ایک دوسرے ہیجڑے سے کہا، ''ارے رام کلی! دکھا دے اسے اپنا اجازت نامہ۔''

یہ سنتے ہی رام کلی نے اپنا چھتری نما پیٹی کوٹ انسپکٹر کے سامنے کمر تک اٹھا دیا۔ بے چارا انسپکٹر بوکھلا کر اس طرح پیچھے ہٹا کہ یکبارگی موٹر سائیکل سے گرتے گرتے بچا۔ سبھی ہیجڑے غل مچا کر ہنسنے اور تالیاں بجانے لگے۔ اِدھر اُدھر کھڑے ہوئے تماش بین بھی بے تحاشا ہنس پڑے۔ انسپکٹر کا چہرہ غصے اور شرم سے سرخ ہو گیا، اس نے پوری ہیجڑہ برادری کو ایک موٹی سی گالی دی اور تیزی سے موٹر سائیکل موڑ کر ہوا ہو گیا۔ ہیجڑے اس کے پیچھے تالیاں بجاتے دیر تک ہائے ہائے کی آوازیں نکالتے رہے۔

اب جلوس شہر کی سب سے پُر رونق سڑک سے گزر رہا تھا۔ سڑک اور فٹ پاتھوں پر تماش بینوں کی بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی بلکہ اس جلوس کے متوازی سڑک کے دائیں بائیں فٹ پاتھوں پر ہزاروں تماش بین بھی جلوس کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے اور جلوس میں شامل ہیجڑوں کی ایک ایک حرکت پر قہقہے لگا رہے تھے۔ سڑک پر رُکی موٹروں سے ہارن پر ہارن دیے جا رہے تھے مگر ہیجڑوں کا جلوس اپنی سی چال چلتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ آس پاس کے سینکڑوں ہزاروں بچے ہیجڑوں کے نعروں کے جواب میں 'ماں جی... ماں جی' کی تکرار کرتے چل رہے تھے۔

جلوس چلتے چلتے شہر کے سب سے بڑے چوراہے پر آ گیا تھا۔ اتنے میں سائرن کی تیز سیٹیوں سے پورا علاقہ گونج گیا۔ چاروں طرف پولیس کی درجنوں گاڑیاں سائرن بجاتی آ گئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے جلوس کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا۔ مگر ہیجڑوں کے چہرے سے ذرا بھی تردد ظاہر نہیں ہو رہا تھا۔

سب نہایت اطمینان سے کھڑے پولیس والوں کی طرف دیکھ دیکھ کر تالیاں بجاتے 'ہائے ہائے' کر رہے تھے۔ اتنے میں ایک پولیس وین سے اعلان ہوا:

''حکم دیا جاتا ہے کہ جلوس کے لیڈر اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دیں اور دیگر لوگ یہاں سے چپ چاپ منتشر ہو جائیں۔ اس طرح بغیر اجازت سڑک پر جلوس نکالنا قانوناً جرم ہے۔''

مگر ہیجڑوں پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا اور وہ اسی طرح لہک لہک کر تالیاں بجاتے اور ہائے ہائے کرتے رہے۔ پولیس سپرنٹنڈنٹ نے اسپیکر سے اعلان کیا۔

''جلوس کے لیڈروں کو گرفتار کر لیا جائے۔''

مگر ایس پی کے حکم کے باوجود ہیجڑوں کو گرفتار کرنے کے لیے پولیس کی گاڑی سے کوئی نہیں اُترا۔ ایس پی نے ڈی ایس پی سے تیز لہجے میں پوچھا، ''کیوں؟ یہ سپاہی انھیں گرفتار کیوں نہیں کر رہے ہیں؟''

اس سے پہلے کہ ڈی ایس پی کوئی جواب دیتا، ایک انسپکٹر دوڑتا ہوا سپرنٹنڈنٹ کی وین کے پاس آیا، سلیوٹ دی اور ہانپتا ہوا بولا، ''سر! کانسٹبل انھیں گرفتار کرنے سے انکار کر رہے ہیں۔''

''کیوں؟'' پولیس سپرنٹنڈنٹ کی بھویں تن گئیں۔

''سر! وہ کہتے ہیں ہم ہیجڑوں کو گرفتار نہیں کریں گے۔ اس کے لیے لیڈیز فورس کو بلایا جائے۔''

''وہاٹ نان سینس۔'' پولیس سپرنٹنڈنٹ نے غرا کر کہا۔

پھر ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سے بولا کہ وہ خود جا کر صحیح صورت حال کا پتہ چلائے۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ اپنی وین سے اُتر کر پولیس کی لاری کی طرف گیا مگر تھوڑی ہی دیر بعد لوٹ کر آ گیا۔ اس کے چہرے سے بھی پریشانی ظاہر ہو رہی تھی۔

''کیا ہوا؟''

''سر، اس معاملے میں ان پر دباؤ ڈالنا مناسب نہ ہوگا۔ آخر ہمارے عملے میں لیڈیز فورس بھی تو ہے۔''

سپرنٹنڈنٹ یکدم سے بھڑک گیا۔ ''مگر ڈسپلین کی یہ سراسر خلاف ورزی ہے۔''

''ہے تو سہی، مگر جبر کرنے سے معاملہ بگڑ جائے گا سر۔''

پولیس سپرنٹنڈنٹ چند لمحے جانے کیا سوچتا رہا، پھر آپریٹر سے بولا۔ ''ڈی سی صاحب کو

وائرلیس کرواور انھیں صورت حال سے آگاہ کرو۔''

آپریٹر نے ہیڈ فون کانوں پر چڑھایا اور ڈپٹی کمشنر کے سامنے سپرنٹنڈنٹ کا پیغام دہرایا۔ ڈپٹی کمشنر بھی چند لمحے کے لیے مخمصے میں پڑ گئے۔ انھوں نے کمشنر سے رابطہ قائم کیا۔ کمشنر نے پوری روداد سنی اور آخر میں لیڈیز فورس طلب کرنے کی اجازت دے دی۔ ہیڈ کوارٹر بذریعہ وائرلیس اطلاع دے دی گئی اور اب سب لیڈیز فورس کا انتظار کرنے لگے۔ اس ہیچ ایس پی نے بار بار اعلان کیا کہ ''جلوس کے لیڈر اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دوں۔''

غالباً ادھر ہیجڑے بھی صورت حال کی نزاکت کو اچھی طرح بھانپ گئے تھے اور موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چیخ چیخ کر نعرے لگا رہے تھے۔

''ہم سے جو ٹکرائے گا، ہم جیسا ہو جائے گا۔''

''ایک جلیبی تیل میں، راجہ بیٹھا جیل میں۔''

تمام ہیجڑوں نے اپنی اپنی کمر میں بندھی کاٹھ کی تلواریں نکال لی تھیں اور انھیں ہوا میں اُچھال اُچھال کر گلا پھاڑ رہے تھے۔ ایک دُبلا پتلا ہیجڑا تو ہوا میں تلوار چلاتا ہوا پینترے بھی بدل رہا تھا مگر اس طرح لچک لچک کر جیسے کوئی نٹنی کسی تنی ہوئی رسی پر چلنے کی کوشش کر رہی ہو۔ وہ ہیجڑے کاٹھ کی تلواروں سے شمشیر زنی کا مظاہرہ کرنے لگے۔ دونوں ایک دوسرے پر لہک لہک کر وار کرتے اور ہر وار پر ایک لذت آگیں سسکاری بھرتے۔ پولیس کے سپاہی اب گاڑیوں سے اُتر آئے تھے اور حیرت و دلچسپی سے اس مضحکہ خیز منظر کو دیکھ رہے تھے۔ بلڈنگوں کی کھڑکیوں اور گیلریوں سے ہزاروں گردنیں لٹکی ہوئی تھیں۔ اتنے میں ایک بار پھر سائرن کی سیٹیوں سے فضا گونج اُٹھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے یکے بعد دیگرے مزید تین چار پولیس وین آ پہونچیں۔ وین سے دھڑا دھڑ خاتون سپاہیوں کی پوری کھیپ برآمد ہوئی مگر جب خاتون سپاہیوں کی نظر ان لہکتے مٹکتے ہیجڑوں پر پڑی تو ان کے بڑھتے ہوئے قدم یک بیک رُک گئے اور ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارے ہوئے اور تمام لیڈیز پولیس اُلٹے قدموں لوٹ کر دوبارہ گاڑیوں میں جا کر بیٹھ گئیں۔

انچارج لیڈی انسپکٹر نے ایس پی سے کہا، ''سر، لیڈیز ان ہیجڑوں پر ہاتھ ڈالنے سے انکار کر رہی ہیں۔''

''کیوں؟''

''وہ کہتی ہیں یہ کام ہمارا نہیں۔ہم صرف عورتوں پر ہاتھ ڈال سکتی ہیں۔''

''مگر... مگر... عورتوں اور ہیجڑوں میں کیا فرق ہے؟ میرا مطلب ہے...''سپرنٹنڈنٹ نے کہنے کو تو یہ جملہ کہہ دیا مگر فوراً اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔

انچارج لیڈی انسپکٹر نے بُرا سا منھ بنایا اور بولی،''ایسا نہ کہیے سر۔ یوں دیکھا جائے تو مردوں اور ہیجڑوں میں بھی کوئی فرق نہیں ہوتا، پھر مرد پولیس نے انھیں گرفتار کرنے سے انکار کیوں کر دیا؟''

اتنا کہہ کر لیڈی انسپکٹر پیر پٹکتی اپنی وین میں جا کر بیٹھ گئی۔

اب تو پولیس سپرنٹنڈنٹ بہت سٹپٹایا۔اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سچویشن کو کس طرح ہینڈل کرے۔اس نے کانپتے ہاتھوں سے آپریٹر سے ہیڈ فون لے کر خود اپنے کانوں پر چڑھائے اور ڈپٹی کمشنر کو وائرلیس دیا۔ڈپٹی کمشنر کو جب صحیح حالات کا علم ہوا تو وہ بھی گھبرا گیا۔اس نے فوراً کمشنر کو فون کیا۔کمشنر نے بوکھلا کر ہوم سکریٹری سے رابطہ قائم کیا۔ہوم سکریٹری نے ہوم منسٹر کو اطلاع دی اور ہوم منسٹر نے حسب معمول اعلیٰ افسران کی میٹنگ طلب کرنے کا مشورہ دے دیا تا کہ لا اینڈ آرڈر کے مسئلے پر نئے سرے سے غور کیا جا سکے۔اس کے علاوہ وہ بیچارے کر بھی کیا سکتے تھے کہ یہی ایک کام تھا جسے وہ بہ حسن وخوبی انجام دیتے آئے تھے۔ویسے انھوں نے کمشنر کو دلاسا دے دیا کہ''ان پیچ کے لوگوں سے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ یہ بے ضرر لوگ ہیں اور جب تک یہ بے ضرر ہیں، ان کے خلاف کوئی سخت کارروائی نہ کی جائے۔''

کمشنر نے ڈپٹی کمشنر کو فون کیا اور مذکورہ بالا پیغام لفظ بہ لفظ دہرا دیا۔ڈپٹی کمشنر نے ایس پی کو مطلع کیا۔ایس پی نے ہر پولیس وین کے انچارج کو بلا کر وہی پیغام سناتے ہوئے کچھ ضروری ہدایات بھی ذہن نشین کرا دیں۔

اُدھر ہیجڑے چیخ چیخ کر آپے سے باہر ہوئے جا رہے تھے۔اب وہ پولیس کو دیکھ دیکھ کر ایسی ایسی فحش حرکتیں کرنے لگے کہ لیڈیز پولیس شرم سے سرخ ہو گئیں۔کھڑکیوں، گیلریوں اور مکانوں کے چھجوں سے جھانکنے والوں کو تو مفت کا تماشا ہاتھ آ گیا تھا۔اب کھڑکیوں اور گیلریوں سے لہکتے مٹکتے ہیجڑوں کی طرف سکے اچھالے جانے لگے تھے، ہیجڑوں کے نعرے تماش بینوں کے قہقہے اور بلڈنگوں سے پھینکے جانے والے سکّوں کی چھنا چھن سے ایسا شور مچا کہ پولیس سپرنٹنڈنٹ نے جھنجھلا کر ایک ہوائی فائر کر دیا۔اس کی آواز سے ایک لمحہ کو پورا علاقہ گونج اٹھا۔ایک اونچی عمارت سے دو چار کبوتر

پھڑ پھڑا کر اڑے اور چند لمحوں کے لیے چاروں طرف خاموشی سی چھا گئی مگر یہ خاموشی زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی کیوں کہ جب لوگوں کو پتہ چلا کہ وہ محض ہوائی فائر تھا تو ایکبار پھر سب شور مچانے لگے۔ ایک انسپکٹر نے سپرنٹنڈنٹ سے پوچھا کہ حکم ہو تو آنسو گیس کے شیلز داغے جائیں۔ مگر سپرنٹنڈنٹ نے سختی سے منع کر دیا کہ اعلیٰ حکام کی ہدایت کے مطابق، ''جب تک وہ بے ضرر ہیں، ہماری طرف سے انھیں بھی کوئی ضرر نہ پہنچے۔''

اسی طرح جب ایس پی نے لاٹھی چارج کی تجویز کو بھی ٹھکرا دیا تو پولیس کے سپاہی اطمینان سے ایک طرف ہٹ کر کھڑے ہو گئے اور تمبا کو پھانکتے مونگ پھلیاں ٹھونگتے اور گپیں لڑاتے لوگوں کے ساتھ خود بھی ہنسی قہقہے لگانے لگے۔

عین اس وقت جب کہ ہیجڑوں کا لہکنا اور بلڈنگوں سے سکّوں کا اُچھالنا اور تماش بینوں کا قہقہے لگانا شباب پر تھا، وہاں پولیس کی ایک جیپ آ کر رکی۔ ایک سب انسپکٹر جیپ سے اتر کر دوڑتا ہوا پولیس سپرنٹنڈنٹ کے پاس پہونچا اور آہستہ آہستہ اس کے کان میں کچھ کہنے لگا۔ یک بیک پولیس سپرنٹنڈنٹ کے چہرے پر مردنی سی چھا گئی۔ اس نے بوکھلا کر اس چھوٹی سی گلی کی طرف دیکھا جو شاہراہ کی بائیں طرف اونچی اونچی بلڈنگوں کے درمیان سے کسی تیز کٹار کی نوک کی طرح باہر کو نکلی ہوئی تھی۔

''اوہو۔ کیسے پتہ چلا کہ وہی ہیں؟''

''ابھی ابھی انٹلی جینس برانچ سے اطلاع آئی ہے۔''

''اندازاً کتنے لوگ ہوں گے؟'' سپرنٹنڈنٹ نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے پوچھا۔

''پندرہ بیس سے کم نہیں ہوں گے۔''

انسپکٹر کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

''ہتھیاروں سے لیس ہیں یا نہتے ہیں؟''

اس کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ملی، مگر ہمیں چوکس رہنا چاہیے۔''

''یقیناً۔ یہ حرامزادے نہتے نہیں ہوتے۔ ہتھیار چھپا کر رکھتے ہیں۔ پچھلی دفعہ یاد نہیں، اسی دھوکے میں ہمارے قریب درجن بھر سپاہی زخمی ہو گئے تھے۔''

''آپ نے صحیح فرمایا۔''

''مگر وہ لوگ اس گلی میں کیا کر رہے ہیں؟ کوئی خفیہ اجلاس؟''

’’ہوسکتا ہے۔ ویسے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ اسی گلی کی کسی کھولی میں ان کا ایک ہینڈ پریس بھی ہے۔ پچھلے ہفتہ حکومت کے خلاف جو ہینڈ بِل اور پوسٹر چھپے تھے، وہ اسی پریس میں چھاپے گئے تھے۔‘‘

’’اوہو، تب تو ان میں ایک بھی بچ کر نہ جانے پائے۔ ہروین انچارج کو جا کر خبردار کر دو۔‘‘

’’اور ان ہیجڑوں کا کیا کیا جائے سر؟‘‘

’’ارے ان کی فکر مت کرو۔ یہ تو صرف ہوائی فائر سے کائی کی طرح پھٹ جائیں گے۔ جلدی کرو، کہیں شکار چوکنا نہ ہو جائے۔‘‘

انسپکٹر سلیوٹ دے کر تقریباً دوڑتا ہوا دوسرے پولیس والوں کو خبردار کرنے چلا گیا۔

ادھر دوسروں نے بھی غالباً فضا میں بارود کی بُو محسوس کر لی تھی، کیوں کہ دیکھتے دیکھتے ہیجڑوں کا مٹکنا اور نعرے لگانا، بلڈنگوں سے سکّے اچھالنا اور پولیس کا بار بار بھونپو سے اعلان کرنا سب بند ہو گیا۔

معاً ایس پی نے مائیکروفون پر چیخ کر کہا، ’’ساوٗدھان!‘‘

بلڈنگوں کی کھڑکیوں، گیلریوں اور چھجوں سے جھانکتی لٹکتی گردنیں غائب ہو گئیں۔ عمارتوں کی کھلی کھڑکیاں کھٹ کھٹ بند ہونے لگیں۔ دکانوں کے شٹرز گر گئے۔ اِدھر اُدھر کھڑی موٹریں، ٹیکسیاں، رکشے اور دوسری سواریاں سڑکوں سے سلیٹ پر بنی تصویروں کی طرح مٹ گئیں۔ فٹ پاتھیں اور سڑکیں ویران ہو گئیں اور سب سے تعجب خیز بات یہ کہ وہ سارے ہیجڑے بھی ایک ایک دو دو کر کے محفوظ راستوں سے فرار ہو گئے۔

پولیس کے سپاہی گاڑیوں سے کود کود کر گلی کے دہانے پر پہنچ گئے اور گلی کی سمت بندوقیں تانے مورچہ سنبھال کر کھڑے ہو گئے۔ اب چاروں طرف سناٹا چھا چکا تھا اور کہیں سے بھی کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔

یکایک اس پتلی سی گلی سے ایک پتھر سنسناتا ہوا آیا اور پولیس کی ایک جیپ گاڑی کا شیشہ چکنا چور ہو گیا۔

ایس پی اپنی پوری طاقت سے چیخا، ’’فائر...‘‘

دَن دَن بندوقوں کی گولیوں سے ساری فضائیں لرز اٹھیں جیسے کسی خوابیدہ شخص کو بجلی کا جھٹکا لگ گیا ہو۔

گریفٹی

عرفان احمد عرفی

''آپ کے ان گنت صوتی پیغامات ہیں۔بٹن پریس کیجیے اور سنتے جائیے۔''

منگل صبح نو بجکر تیس منٹ...

''مجھے یقین ہے تمھاری آج آف تھی اور تم ابھی تک سو رہے ہو گے۔ جیسے ہی میرا پیغام سُنو فوراً کال کرو۔ امید ہے تم نے اپنے گھر والوں کو خیریت کی اطلاع دے دی ہو گی۔ وہاں بھی ٹی وی چینلز پر لائیو کوریج جا رہی ہو گی۔ جاگتے ہی انھیں کال کر دینا وہ بہت پریشان ہوں گے۔''

منگل صبح نو بجکر چالیس منٹ۔

''آئی نو... تم آج چھٹی پر ہوتے ہو اور ظاہر ہے ابھی تک سو رہے ہو گے اسی لیے فون اٹنڈ نہیں کر رہے۔ پتہ نہیں تمھارے ساتھ کام کرنے والوں کا کیا بنا؟ میسج سنتے ہی فوراً مجھے فون کرو...''

منگل صبح نو بجکر چھیالیس منٹ۔

''ہیلو... ہیلو... کوئی ہے؟ کیا کوئی سن رہا ہے؟ بہت پریشانی ہے... کال می بیک... کال می بیک... پلیز! ٹی وی آن کرو... دیکھو تو کیا ہو رہا ہے؟

منگل صبح نو بجکر اکیاون منٹ۔

''بہت مشکل سے کال ملی ہے۔ یہاں اس وقت شام ہے ہم سخت پریشان ہیں۔ جلدی سے کال کرو... تم آج کام پر تونہیں گئے تھے نا؟''

منگل صبح نو بجکر باون منٹ۔

''کال کرو مجھے؟ کہاں ہو؟''

منگل صبح نو بجکر اٹھاون منٹ۔

ٹی وی آن ہوتا ہے۔

اسکرین منی تھی لیکن منظر لارجر دین لائف۔ آئی میکس تھیٹر میں ہی دیکھا جا سکتا تھا۔

پہلے تو میں سمجھا ہالی ووڈ کی کسی عامیانہ سی بلاک بسٹر سنسنی خیز ایکشن فلم کا ٹریلر ہے۔

لیکن ہر چینل پر اسی فلم کا اشتہار؟ یہ بہت عجیب بات تھی۔

اُفق کی لکیر کو چھوتی عمارت کی وہ منزلیں جہاں سے میں روزانہ برق رفتار لوکل رَن ایلی ویٹر میں سوار اٹھتر ویں فلور تک جایا کرتا، ہیبت ناک شعلوں کی لپیٹ میں تھیں۔ میری آنکھوں کے سامنے ہر وہ چہرہ کیسینو کے رولیٹ کی طرح گھوم گیا جو اس صبح اسکائی لابی میں اپنے اپنے ورک اسٹیشن پر موجود ہوگا۔

فُوڈ کورٹ کا ہر کاؤنٹر اس پہر تک سیاحوں کی قطاروں سے پرہجوم ہو جاتا تھا۔ اس پر بھگدڑ میں کتنے ایسے ہوں گے جو گھبرا کر آبزرویشن ڈیک تک چڑھ جانے کی کوشش میں ہوں گے۔

اوپر ڈیک تک جاتی سیڑھیوں کی تنگ راہ داری پر تو ویسے بھی نمایاں لفظوں میں لکھا تھا۔

''بلندی سے خوف کھانے والے گریز کریں۔''

لیکن اس گھڑی کسے بلندی سے خوف کھانے کی ہوش ہوگی۔ ڈیک پر تو ویسے بھی کالے دھوئیں نے اندھیرا مچا رکھا تھا۔ مدد کے لیے ہیلی کاپٹر بھی ٹاور کے ہیلی پیڈ پر اُتر نہیں پا رہے تھے۔ ہیلی کاپٹر پرواز نیچی کرتا تو اس کے پنکھے کے پر شعلوں کو مزید ہوا دیتے۔

کافی اسٹال پر کام کرنے والی مایا کا اگرچہ میری طرح آف ڈے ہی تھا لیکن اسے دو مہینے بعد اس دسمبر میں کرسمس کی چھٹیوں میں اپنے بھائی کی سگائی پر دیس جانا تھا، پیسے جمع کرنے کے لیے فالتو گھنٹے کام کر رہی تھی بدنصیب۔

ابھی تو اس معصوم نے ایپرن باندھ کر شفٹ شروع ہی کی ہو گی۔

سینڈ وِچ کاؤنٹر پر جو ابھی ابھی نیا دیسی آیا تھا وہ پینِڈو تو ویسے بھی روزانہ اتنی بلندی تک چڑھ آنے سے خوف کھایا کرتا تھا۔ آج ٹکراؤ کے بعد جب عمارت لرزی ہو گی تو پتہ نہیں اس پر کیا گزری ہو گی۔ اور سٹیفن جسے آج میری جگہ ریسٹ روموں کی صفائی دُھلائی کرنا تھی کہیں ایلی ویٹر میں ہی پھنس کر جھلس نہ گیا ہو... کبھی تو لگتا ہے مایا کے بازو میں اپنے بازو واڑ سا کر وہ بھی ننگے پیروں کے ساتھ عمارت سے باہر کود جانے والوں میں سے تھا۔

ان میناروں کو جڑواں کہا تو جاتا تھا اور شاید دونوں نے اُفق چھونے کے لیے سر تو ایک ساتھ نہ اُٹھایا ہو البتہ فنا کا دن دونوں کے لیے ایک ہی تھا۔

اور پھر جیسا کہ ساری دنیا نے دیکھا دونوں مینار جو فلک بوس تھے ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی زمین بوس بھی ہو گئے جن کھڑکیوں، روشندانوں میں کبھی سورج جھانکتا تھا اب راکھ کا ڈھیر بنے ہوئے تھے۔

اس کے بعد کیا ہوا ساری دنیا جانتی ہے سب نے کھلی آنکھوں دیکھا سنا... دُہرانے کی ضرورت نہیں۔

کئی روز تک میں بھی اسکائی لابی کی فوڈ کورٹ میں اپنے جیسے کیش پر کام کرنے والے گھس بیٹھیے غیر ملکیوں کے بارے میں سوچتا اور کھوجتا رہا جو کسی کھاتے میں تھے نہ شمار میں۔

جن لوگوں کو تو میں جانتا تھا ان کے گھروں سے ان کے بارے میں پتہ لگا ہی لیا، کتنے بچ گئے، کس کے فضا میں چیتھڑے بکھر گئے اور کون ایک سودسویں منزل سے فرش در فرش گرتے ملبے میں گُندھ گیا؟

پتہ نہیں میں خود بھی بچ جانے والوں میں سے تھا یا ابھی تک اسکائی لابی میں ہی پھنسا ہوا کسی غیبی طاقت کو مدد کے لیے پکار رہا ہوں۔

اب تو 'ہیوا ے گُڈ ڈے (ایک اور اچھے دن کی دعا)' اور 'یُو ٹو (تمھارے لیے بھی یہی دعا)' جیسی رسمی نیک تمناؤں پر سے میرا اعتماد اُٹھ ہی گیا تھا جو روزانہ دن کی شروعات میں ایلی ویٹر میں آتے جاتے لوگ ایک دوسرے پر ظاہر کرتے۔

شعلوں میں سے بلند ہوتی 'ہیلپ... ہیلپ' کی چیختی چلاتی فریادوں کے بے اثر ثابت ہونے

پر بے یار و مددگار انسان کے ساتھ فطرت کی سرد مہری آخر آشکار ہو ہی گئی تھی۔

شروع شروع میں جب پہلی بار اس شہر کی فلک بوس عمارتوں کے سائے میں آیا تھا تو مجھے اپنا آپ بھی کسی اسکائی اسکریپر سے کم محسوس نہ ہوا تھا۔ تب ساری دنیا مجھے چھوٹی دکھائی دی تھی خاص طور پر وہ دنیا جسے میں بہت دور پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ وہاں اگر کوئی 'چھوٹا' تھا تو وہ پہلوان کے ہوٹل میں کام کرتا تھا اور اس کے دکھ کا احساس یہاں آ کر مجھے تب ہوا جب مجھے بھی یہاں آ کر وہی کام کرنا پڑے۔

پہلوان کے ہوٹل کی ایک مخصوص میز پر ہم ادیب شاعر بھی اپنی محفل سجایا کرتے تھے۔ 'چھوٹا' دن بھر ہوٹل کے کھردرے فرش پر اپنی گھِسی ہوئی چپل کی ایڑھی پر لٹو کی طرح گھومتا رہتا۔

شام تک فرش پر جتنے بھی دائرے کاٹتا ہو گا یقیناً وہ رات بھر کسی خونخوار مچھر کی طرح اُس کے سر کے گرد منڈلاتے ہوں گے۔

کاؤنٹر پر بیٹھے پہلوان کے لیے تو جیسے چھوٹے کے پیروں کے تلوے اور چولھے پر رکھی کیتلی کے پیندے میں کوئی فرق ہی نہیں تھا... چھوٹے کے ساتھ پہلوان کے اس غیر انسانی سلوک نے مجھے چھوٹے سے ہمدردی پر مجبور کر دیا اور وہ خواہ مخواہ ہی میری توجہ کے دائرے میں آ پڑا۔

کیتلی بھی اپنا اصل رنگ چھوڑ چکی تھی ایک کالک سی تھی جو اس پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چڑھتی جا رہی تھی اور چھوٹا بھی اب آسانی سے پہچانا نہیں جا سکتا تھا، اس کی اصل شکل دیکھنے کے لیے اس کے منھ سے بھی پتہ نہیں کیا کچھ کھرچنا ضروری ہو چلا تھا۔

پہلوان کی توند دن بدن چولھے کی جانب ڈھلکتی جا رہی تھی اور وہ سارا دن گاہکوں کی موجودگی میں چھوٹے کی ماں بہن ایک کرتا رہتا۔

پہلوان کا ہوٹل اندرون شہر کے اس گنجان چوراہے میں اب خاصا مشہور ہو چکا تھا۔ آس پاس کے دفتروں میں کام کرنے والے کلرک اور افسر لوگ وہیں آ کر کھانا کھاتے، چپڑاسیوں اور قاصدوں کی برادری بھی یہیں کی دال پر دو نمبر گھی کا تڑکہ لگواتی اور ہم جیسے شاعر افسانہ نگار بھی یہاں کی میٹھی اور گاڑھی دودھ پتی پینے آ بھٹکتے۔

کہنے کو پہلوان اب کچھ عرصے سے روزانہ رات کو کرارے نوٹوں کے بنڈل شلوکے کی جیبوں

میں ٹھونسنے لگا تھا مگر اس کے طور طریقے وہی لاری اڈوں پر چائے بیچنے والوں جیسے ہی تھے۔

میلی سی قمیص جس کے بٹن ہمیشہ ٹوٹے رہتے اور پسینے سے شرابور چھاتی کے سفید بال سر نکالے رکھتے۔ موٹی سی گردن کے اُوپر رکھے چہرے پر خضاب سے رنگی سیاہ گھنی مونچھیں، گول گول آنکھوں میں تھرکتے کالے بنٹے جن کے گرد ہر وقت سُرخی تیر رہی ہوتی، آواز کی گھن گرج کا یہ عالم کہ اپنے تئیں وہ سرگوشی بھی کرتا تو چائے خانے کی آخری میز پر بیٹھا گاہک جان لیتا پہلوان کا مُوڈ کیسا ہے۔ سارا دن کیتلی کے پاس رکھا ریڈیو فُل والیم میں بج بھی رہا ہوتا تو ہوٹل کے لڑکوں کے لیے پہلوان کا حکم نامہ جن سُروں میں نشر ہوتا وہ نور جہاں کے گانے 'یہ وادیاں... یہ پربتوں کی شاہزادیاں' کو بھی پس منظر کی موسیقی بنا دیتا۔

پہلوان کا نزلہ سب سے زیادہ اسی پر گرتا اور مجھے یقین تھا کہ یہ بھی شاید اس لیے کہ اس کی ناک کے نیچے کام کرنے والا شاید وہ واحد لڑکا تھا جو اس کا لونڈا بننے سے انکاری تھا جب کہ دوسروں کے بارے میں شنید یہی تھی کہ وقت پر اجرت وصول کرنے کی خواہش میں پہلوان کو راضی کرنے کے لیے مزدور لڑکے ازار بند کھول دینے میں چوکتے نہیں تھے۔

چھوٹے کی جب سے گاہکوں میں جان پہچان بڑھ گئی تھی، اسے بھرے چائے خانے میں پہلوان سے گالیاں کھانا اچھا نہ لگتا خاص طور پر ایسی گالیاں جو اسے پیدائشی جنسی مفعول ثابت کرنے کی وجہ بن سکتی ہوں۔

سب سے زیادہ چِڑ اسے تب ہوتی جب پہلوان اسے شُشکار کر بلاتا تھا۔

یقیناً پہلوان نے اپنی گالی کے جواب میں کبھی گالی نہیں سنی تھی اس لیے وہ ڈنکے کی چوٹ پر ایسی بک بک کرتا رہتا۔

متعدد بار اگر کسی گاہک نے پہلوان کو گند بکنے پر ٹوکا بھی کہ اکثر کوئی زنانی ذات یا بزرگ لوگ سن رہے ہوتے ہیں لہٰذا وہ اپنی زبان پر قابو رکھے تو اس پر پہلوان زوردار قہقہہ لگانے کے بعد مزید اُونچی آواز میں نہایت فخر سے للکارتا:

''کون ماں کا کھسم دعویٰ کرتا ہے کہ اس کی ٹانگوں کے بیچ وہ نہیں جو میری زبان پر آتا ہے۔ کس بہن کے یار کے دماغ میں وہ کچھ نہیں بھرا ہوا جو میری بک بک میں ہوتا ہے؟''

ایک روز پہلوان کی ہی غلطی کی وجہ سے گاہک نے چائے میں مکھی دیکھ لی اور جب گاہک نے

کاؤنٹر پر آ کر شکایت کی تو پہلوان نے اپنی غلطی ماننے کی بجائے اُلٹا سب کے سامنے چھوٹے پر گالیوں کی بوچھاڑ کر دی۔

''بھین کے یار تُو نے مکھی والی چائے سرجی کو پیش کر دی؟ اندھا ہو گیا ہے؟''

ایسا لگ رہا تھا وہ اس بے عزتی کا زیادہ دیر تک متحمل نہیں ہو سکتا تھا یا تو کیتلی میں ڈوبا چمچا اُٹھا کر پہلوان کے سر دے مارے گا یا پھر دھاڑیں مار مار کے رونا شروع کر دے گا۔ کیفے میں موجود سب لوگ اسے دیکھ رہے تھے اور میں اسے مزید شرمندہ ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا لہٰذا میں نے سر جھکا کر اپنے اسکرپٹ پر کام کرنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ مجھے کہیں نظر نہ آیا۔ مجھے یقین ہو گیا وہ پہلوان کے چنگل سے فرار ہو گیا ہے مگر پھر بھی میز چھوڑتے ہوئے حسب معمول میں نے اس کے لیے دو روپے کی ٹِپ چھوڑ دی۔ میرے مثانے میں دباؤ بڑھا تو مجھے پہلوان کے ہوٹل کے پچھواڑے گلی میں اس بیت الخلا کا خیال آ گیا جس کے دروازے پر جلی حروف میں 'مردانہ لیٹرین' لکھا تھا۔ اگر چہ وہ بہت غلیظ اور تاریک لیٹرین تھی مگر اس لمحے اس سے بڑی سہولت اور کیا ہو سکتی تھی۔

لیٹرین میں آ کر فارغ ہونے کے بعد ہاتھ دھونے کے لیے میں نے چاپچی کی ٹونٹی کھولی تو اس میں سے ایک دو قطرے ہی ٹپک سکے حسب معمول وہاں پانی نہیں تھا... تب میری نظر چُونا اتری گندی مندی دیواروں پر پڑی جہاں جنسی اعضا کا پر لذت تذکرہ لکھا تھا اور کہیں کہیں تصویری منظر نامہ بھی پیش کرنے کی کوشش کی گئی تھی میرے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ البتہ ایک نسوانی شرم گاہ کی تصویر کے نیچے لکھی تحریر نے مجھے چونکا دیا۔ کوئی پہلوان کی بیوی کو بے لباس کر گیا تھا۔ پتہ نہیں کیوں مجھے لگا جیسے چھوٹا شدید احتجاجی جذبے کے تحت اپنے اندر کی بے لباسی کو لفظوں اور لکیروں کا لبادہ پہنا گیا ہے۔

کچھ روز بعد مجھے پھر اتفاق سے لیٹرین میں جانے کا اتفاق ہوا۔ چھوٹے کی بات کے جواب میں ایک اور بات لکھی دیکھی۔

''لکھنے والے کی ماں کو اگڑم بگڑم۔''

یقیناً پہلوان کے کسی چمچے کڑچھے نے پہلوان کے ساتھ وفاداری کا اظہار کیا ہو گا۔

پتہ نہیں کیوں اس روز میں نے پہلوان کے وفادار لونڈے کے لکھے جواب کو مٹایا پھر ایک ایسی بات لکھ دی کہ پہلوان کی بیوی کی چیخیں نکال دیں۔ ایسا لگ رہا تھا تھوڑی دیر کے لیے میں خود 'چھوٹا'

بن گیا ہوں۔

کچھ دنوں بعد میں نے محسوس کیا کہ لیٹرین کی کشادہ دل دیواروں پر اس یک طرفہ جنسی انتقام اور حسرتوں کی پیغام رسانیوں سے چائے خانے کے اندرونی ماحول میں تبدیلی آنے لگی۔

چند مہینوں میں لیٹرین کی دیواروں نے مجھے بتایا کہ اب یہ اس کا معمول بن گیا ہے کہ پہلوان گاہکوں کے سامنے جب بھی اس کی ماں بہن ایک کرتا تھا وہ جھٹ بیت الخلا میں جا کر وہاں کی دیواروں پر اس کی بیوی کی شلوار اُتار دیتا۔

ابھی تک تو یہ سُن رکھا تھا کہ دیواروں کے کان ہوتے ہیں مگر اب کے پہلی بار جانا کہ دیواروں کے کان ہی نہیں زبان بھی ہوتی ہے اور ڈھکی چھپی بے لباس دیواروں کی تو زبان نہ صرف ننگی ہوتی ہے بلکہ لمبی بھی بہت ہوتی ہے۔

اور کبھی تو مجھے لگتا شہر بھر کی عوامی لیٹرینوں اور مکانوں کے پچھواڑوں کی دیواروں پر لکھنے والا کوئی ایک ہی چھوٹا ہے۔

ان سب تحریروں کے اندر ڈھکی چھپی بات دراصل ایک آدمی کی بات ہے۔

ان دنوں میں جب بھی کسی عوامی بیت الخلا میں جاتا اور دیواروں پر لکھی تحریریں پڑھتا تو حلقہ اربابِ ذوق کے نقادوں کی طرح ہر بات کا پلستر اُکھاڑنے لگتا... ہر مختلف بات کے اندر دراصل ایک ہی بات ہے جیسے باہر سے ہر آدمی مختلف ہے لیکن اندر سے ایک جیسا حمام میں بھی تو ہر آدمی ایک جیسا ہوتا ہے تبھی غسل خانوں کی دیواروں پر کھینچے گئے آدمی عورتیں بھی ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ان پر کسی لباس اور پہچان کا لیبل نہیں ہوتا وہی بات پہلوان اپنے جملے میں بک دیتا اور اسی کی ٹکر میں اس سے بھی زیادہ غلیظ بات بیت الخلا کی دیوار پر لکھ دی جاتی۔

پہلوانوں اور چھوٹوں کی اس دنیا کو خیر باد کہہ کر اس بڑی دنیا میں آنے کے بعد کچھ عرصہ تو مجھے خود کو یقین دلانے میں گزر گیا کہ میں اب کھلی فضا میں سانس لے رہا ہوں۔ اور جب تک مجھے یقین آیا، مجھ پر کھلا کہ یہاں مزید رہنے کا اجازت نامہ اپنی تاریخ تنسیخ سے تجاوز کر گیا ہے۔ادھر رہے چلے جانا اب جرم ٹھہرا۔ یہ احساس جرم تنگ و تاریک لیٹرین والی گھٹن سا تھا۔ مجھے لگا جیسے میں اب ایک اور غسل خانے میں آ گیا ہوں، یہ الگ بات کہ یہ غسل خانہ صاف اور کشادہ تھا اور فضائیں ائر فریشنر کی مصنوعی خوشبوؤں سے مہک رہی تھیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ میں کوئی لال بیگ ہوں جس کا مقدر ہی غسل خانوں کی نالیوں اور سوراخوں میں رینگنا ہے۔

یہاں آ کر اب کے ایک اور پہلوان نے مجھے آ لیا اور میں چھوٹا ہو گیا۔ لمبی لمبی شاہراہوں پر ٹیکسی چلاتے ہوئے جیب میں لائسنس ہونے کے باوجود میں ایک غیر قانونی شہری تھا۔ ہر قدم پر پکڑے جانے کا خوف ساتھ والی نشست پر بیٹھا رہتا۔

پہلوان کی گرفت جب میری گردن پر بہت زیادہ تنگ ہو جاتی تو مجھے بھی پہلوان کی بیوی یاد آنے لگتی، وہی مجھے پہلوان کی چابک کے زور سے بچا سکتی تھی۔ اگرچہ یہاں بھی ریسٹ روموں اور پچھواڑوں کی دیواریں کالی ہوتیں مگر ان پر پہلوان کی بیوی کی بجائے چھوٹا بذات خود پہلوان کے ساتھ براہ راست گتھم گتھا ہوتا۔ پہلوان اور چھوٹے کے بیچ ناگفتہ پیغام رسانیوں کے کبھی نہ ختم ہونے والے سلسلے تھے۔

''پہلوان اگر تمھیں چھوٹے کی ضرورت ہے تو میرا فون نمبر نوٹ کر لو۔''

''میں پہلوان ہوں اتنے بجے فلاں جگہ پر ملو۔''

''میں پہلوان بھی ہوں اور چھوٹا بھی ہوں ... تمھیں کیا چاہیے؟ میں اتنے بجے پھر اس جگہ پر آؤں گا۔''

''چھوٹے میں تمھارے بتائے گئے وقت پر آیا تھا تم نہیں تھے ... فقط پہلوان۔''

ایسے میں مجھے پہلوان کی وہ گالی یاد آ جاتی ہے جو وہ چھوٹے کو بلا جھجک دیا کرتا تھا اور وہی اس کو سب سے زیادہ بری لگتی تھی۔

ایک روز میں شہر کی بلند ترین عمارت میں آیا جس کے اٹھتر ویں چھت کو آسمان کی ڈیوڑھی کہا جاتا تھا۔ یہاں آ کر مجھے لگا جیسے میں نے واقعی کسی نیلی حویلی میں داخل ہونے کے لیے بادلوں کی دہلیز پر قدم رکھ دیا ہے۔ مجھے اس روز چھوٹا بہت یاد آیا۔ کاش میں اسے یہاں لا سکتا۔ وہ خود کو ادھر کتنا بڑا محسوس کرتا۔

اسکائی لابی میں سیاحوں کے لیے فوڈ کورٹ اور عوامی سہولت گاہوں کا اہتمام بھی تھا۔ وہیں پر مجھے کیش کے عوض صفائی کا کام مل گیا۔ پہلے دن میں خوشی خوشی ایک سو ساتویں منزل کے آبزرویشن ڈیک پر بھی گیا، ذرا گردن جھکا کر نیچے دیکھا تو تا حد نظر عمارتوں، پُلوں اور شاہراہوں کی یہ دنیا 'لیگو بلاکس' کی طرح لگی جسے کسی 'چھوٹے' نے کھیلنے کی ناکام کوشش کے بعد بے ترتیبی سے بکھیر دیا ہو۔ تب پہلی بار میں نے کھلی فضا میں بھرپور سانس بھرے تھے۔ دور سامنے نیلے پانیوں میں سبز جزیرے پر ایستادہ آزادی کی ملکہ فضا میں پتھریلی شمع لہراتی، گویا پہلوان سے چھٹکارے کا جشن منانے میں میرا

ساتھ دے رہی تھی۔

کام پر پہلے روز جب میں سویپ ماپ کرنے ریسٹ روم میں گیا تو کسی زنانہ بیت الخلا میں جانے کا یہ میرا پہلا اتفاق تھا۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہاں کی دیواریں بالکل صاف تھیں جب کہ اس کے برعکس مردوں کے ریسٹ روم کی دیواریں مغلظ نقش و نگار سے بھری پڑی تھیں اور جیسے جیسے دن گزرتے جا رہے تھے دیواروں پر لکیریں اور تحریریں بھی پھیلتی جا رہی تھیں۔ چھوٹے سے چھوٹا اور پہلوان سے پہلوان کا دنگل جانے کس فائنل راؤنڈ کی طرف رواں تھا اور پھر وہ دن آ گیا جب اتفاق سے میرا آف ڈے تھا اور ریسٹ روموں کی دیواریں جنھیں میں روزانہ صاف کرتا تھا، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ملیا میٹ ہو گئیں شاید یہ ہی فائنل راؤنڈ تھا۔

اب پتہ نہیں جیت کس کی ہوئی تھی۔ پہلوان کی یا چھوٹے کی البتہ بلندی اور بڑے پن پر سے میرا اعتماد اُٹھ گیا۔

میں نے فیصلہ کر لیا میں یہاں سے واپس چلا جاؤں گا مجھے ہر طرف بیت الخلا کی بُو پھیلتی محسوس ہوئی جس سے میں کبھی جان نہیں چھڑا پایا تھا۔

اور اس روز جب اتنے سالوں بعد بورڈنگ کارڈ ہاتھ میں تھامے انٹرنیشنل ڈپارچر کی انتظار گاہ میں اپنی فلائٹ کے گیٹ نمبر کے اعلان کے انتظار میں تھا، مجھے پھر ریسٹ روم میں جانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

ٹائلٹ کی دیوار پر آویزاں مثانہ خالی کرنے والے برتن کے سامنے جوں ہی پتلون کی زِپ کھولی تو سامنے کھینچی گئی تصویر اور لکھی عبارت نے مجھے گویا حیرت اور وسوسے کی کسی کھائی میں دھکیل دیا... وہی لہجہ وہی لکھائی اس سے پہلے بھی میں نے کسی دیوار پر دیکھی تھی؟

یقیناً اس دیوار پر جواب ملیا میٹ ہو چکی تھی، تب کسی 'چھوٹے' نے اپنے پہلوان کو گالی دیتے ہوئے ٹاور میں گھستی طیارے کی چونچ کا نقشہ کھینچ کر اسے وقت سے پہلے خبردار کر دیا تھا...... میری آنکھوں کے سامنے منی اسکرین پر بلاک بسٹر فلم کا ٹریلر گھوم گیا۔

ڈپارچر گیٹ کے اوپر نصب سیکورٹی کیمرہ طیارے میں داخل ہونے والے ہر مسافر کا چہرہ مانیٹر میں ڈسپلے کر رہا تھا جس میں نظر آتا ہر مسافر کا چہرہ کس قدر سپاٹ، مطمئن اور لاتعلق سا تھا جیسے ڈھکی چھپی دیواروں پر لکھنے والوں کے چہرے ہوتے ہیں، جنھیں صرف لکھ دینے سے مطلب ہوتا ہے کوئی ان کی بجھارت بوجھ پاتا ہے کہ نہیں ان کی بلا سے۔

تھوڑی دیر بعد طیارہ آسمان کی ڈیوڑھی کی جانب پوری رفتار سے رواں تھا ایسا لگ رہا تھا اپنی نوکیلی چونچ سے نیلی دیوار پر کچھ لکھنے کو ہے۔

فضا میں جانی پہچانی سی بو پھیل گئی... شاید لواٹری کا دروازہ کھلا رہ گیا تھا یا طیارے میں سوار کسی مسافر کا مثانہ اپنے پہلوان کے بوجھ سے بے قابو ہونے کو تھا... مجھے اپنی نشست بھیگی ہوئی محسوس ہوئی۔

کاتیائن بہنیں

مشرف عالم ذوقی

گرچہ یہ کوئی فلمی منظر نہیں تھا لیکن یہ فلمی منظر جیسا ہی تھا۔ مس کاتیائن کے ہاتھوں سے سبزی کا تھیلا پھسلا اور دو بڑے بڑے آلو لڑھکتے ہوئے بھوپیندر پریہار کے پاؤں سے ٹکرائے۔ بھوپیندر پریہار، عمر ایک کم باسٹھ سال، تھوڑا الہرائے... تھوڑا رکے... آلوؤں کو اٹھایا اور سبزی منڈی کی ایک دکان پر کھڑی مس کاتیائن پر جی جان سے نچھاور ہو گئے۔

''آپ مس کاتیائن ہیں نا؟ وہ 'اپنا کی ڈالی' والی دکان کے سامنے والے گھر میں...؟''

''ہاں۔'' مس کاتیائن اتنا بول کر خاموش ہو گئیں۔ شاید انھیں گفتگو کا یہ انداز پسند نہیں آیا۔ وہ بھی ایسی جگہ؟ سبزی منڈی میں... کوئی 'مرد' اس طرح کسی عورت سے اس طرح بات کرے، انھیں اچھا نہیں لگا۔

''میں وہیں رہتا ہوں... آپ کے گھر کے پاس... تھیلا بھاری ہے؟''

پتہ نہیں کہاں سے بھوپیندر پریہار کے لہجے میں اتنا اپنا پن سمٹ آیا تھا۔

''نہیں کوئی بات نہیں۔''

''دیجیے نا۔ میں اٹھا لیتا ہوں۔''

بھوپیندر پریہار نے آرام سے تھیلا اٹھایا اور سبزی منڈی کی دھول بھری سڑکوں پر دونوں چپ چاپ چلنے لگے۔ ہاں، بھوپیندر پریہار کچھ لمحے کے لیے یہ بالکل ہی بھول بیٹھے تھے کہ وہ کوئی نوجوان نہیں، بلکہ ایک کم باسٹھ سال کے گھوڑے پر سوار ہیں۔

لیکن گھوڑے میں اچانک جوش آ گیا تھا۔

***

ایک عالی شان مگر پرانے زمانے کا چندن کی لکڑی کا بنا ہوا محراب نما دروازہ تھا۔ یہ دروازہ چرچرانے کی بھیانک آواز کے ساتھ کسی ہارر فلم کی طرح کھلتا تھا۔ اس کے بعد کافی کھلا ہوا صحن تھا۔ غرض یہ ایک ٹوٹا پھوٹا سا بے رونق گھر تھا۔ یہاں آپ ہمیشہ ہر موسم میں بڑی مس کا تیائن کو دیکھ سکتے ہیں؛ جھکی ہوئی نظریں، ہاتھوں میں پکڑی ہوئی تیلیاں، ایک طرف پڑا ہوا اُون کا 'گچھّا'۔ تیلیوں میں الجھے ہوئے ہاتھ... یعنی دنیا سے بے خبر مس کا تیائن سوئٹر بن رہی ہیں۔ جاڑا ہو گرمی یا برسات، مس کا تیائن کی بس اتنی سی دنیا ہے... گہری فکر، اون کا گولا اور تیلیاں۔ لیکن یہ باتیں زیادہ توجہ طلب نہیں ہیں کہ بڑی مس کا تیائن یہ سوئٹر کس کے لیے بنتی ہیں۔ انھیں پہننے والا کون ہے؟ یا بس سوئٹر بننا مس کا تیائن کا ایک شغل ہے... ایک ہی سوئٹر کو بار بار ادھیڑتے رہنا اور بنتے رہنا۔

''اندر آ جائیے۔''

چھوٹی مس کا تیائن نے اشارہ کیا۔ بھوپیندر پریہار تھیلا لئے صحن میں آ گئے۔ ہمیشہ کی طرح بڑی مس کا تیائن نے گردن گھما کر چھوٹی مس کا تیائن کے ساتھ اندر آتے ہوئے اجنبی، کو دیکھا، لیکن آنکھوں میں حیرانی کا شائبہ تک نہ تھا۔ چہرہ پتھر جیسا بے حس۔

''یہ پڑوسی ہیں۔'' چھوٹی مس کا تیائن نے بڑی کے سامنے تھیلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، ''بھاری تھا، اس لیے مدد کرنے چلے آئے۔''

بھوپیندر پریہار کو یقین ہے کہ چھوٹی کا تیائن کی وضاحت پر بڑی کی آنکھوں میں ایک ہلکی سی چمک ضرور لہرائی ہوگی، حالاں کہ اس چمک کو وہ صرف محسوس کر سکتے تھے۔ اس لیے کہ دوسرے ہی لمحے سوئٹر بنتے پتھر کے مجسمے سے آواز آئی تھی، ''بیٹھیے نا۔''

یہ کا تیائن بہنوں کے ہاں بھوپیندر پریہار کی پہلی انٹری (Entry) تھی۔

کچھ بھوپیندر پریہار کے بارے میں

بھوپیندر پریہار مرد آدمی تھے۔ مردوں کے بارے میں ان کی اپنی رائے تھی... ایک

خاص طرح کا فیسی نیشن (Fascination) تھا اس لفظ کے بارے میں۔ مثلاً وہ سوچتے تھے کہ مرد ایک شاندار جسم رکھتا ہے۔ خوشبو میں ڈوبا ہوا جسم... ایک سدا بہار، مست مست، کسی تناور درخت کی طرح شان سے ایستادہ... بے پروا، بے نیاز کسی کو خاطر میں نہ لانے والا، عورت یا بیوی جیسی چیز اسی جسم کو قید میں رکھنا چاہتی ہے۔ یہ جسم بے لگام گھوڑے کی طرح ہے... شاہراہوں کو روندتا... منزلوں کو پیچھے چھوڑتا... سمندر کی طرح بے خوف... لہروں کی طرح چیختا دہاڑتا... طوفان کی طرح گرجتا۔ یا شیر ببر کی طرح بے قابو... سرکش اور دھرتی کو اپنے طاقتور پنجوں سے روندنے والا۔ یہ جسم کسی ایک درّے میں نہیں چھپ سکتا... کسی ایک بیرک میں قید نہیں رہ سکتا... کسی ایک قید خانے میں، کسی ایک گھر میں یا کسی ایک عورت میں...

لیکن ہوتا کیا ہے، وقت آنے پر یہ جسم ایک عورت کے حوالے کر دیا جاتا ہے، اور کہا جاتا ہے بس... اسے تمہارے حوالے کیا۔ بس یہی ہے... اپنے جسم کی پتوار جیسے چاہو اس پر استعمال کرو۔

مسز پریہار عام عورتوں جیسی ہی ایک عورت تھی جس کے لیے زندگی کا مطلب ایک کنبے یا شوہر اور بچوں سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ یا شاید بچے کے آنے کے بعد شوہر کی بھی کچھ زیادہ حیثیت نہیں رہتی۔ سمن کے آنے کے بعد مسز پریہار کی زندگی کا یہی ایک مقصد رہ گیا تھا۔ سمن۔ صرف سمن۔ اس لیے شاید کبھی کبھی شوہر کے پتوار جیسے تنے جسم کی مانگ کو بھی وہ نظر انداز کر جاتی۔

''نہیں... اسے اتنا پیار مت دو۔ بھگوان کے واسطے۔'' بھوپیندر پریہار کے ہونٹوں پر تلخی تھی۔

''کیوں؟''

''کیوں کہ بچے ہوتے ہی ایسے ہیں۔ لاپرواہ اور بے وفا۔''

''پاگل ہو گئے ہو!''

''بچے تمھاری محبت کی قدر نہیں کریں گے۔ وہ ایک دن تاڑ جتنے ہو جائیں گے اور ہمیں بھول جائیں گے۔''

اور شاید یہی ہوا تھا۔ سمن بڑا ہوا... لو میرج کی اور بیوی کو لے کر کینیڈا چلا گیا۔ مسز پریہار اس فرض سے سبکدوش ہو کر ابدی نیند سو گئی۔ اکیلے رہ گئے بھوپیندر پریہار۔ لیکن وہ اس زندگی کو یادوں کا قبرستان نہیں بنانا چاہتے تھے۔ وہ بقول رسول حمزہ توف... پیار کو زندہ رکھنا چاہتے

تھے جس کے بارے میں ان کا عقیدہ تھا کہ زندگی سے پیار چلا گیا تو ہم بھی نہیں بچ سکتے۔ وہ کھونا نہیں چاہتے تھے اور سچ کہا جائے تو اپنے مرد ہونے کے بھرم کو قائم رکھنا چاہتے تھے... اور شاید خالی پن کے یہی وہ لمحے تھے جب کا تیائن بہنوں سے ان کی دوستی کے در وا ہوئے تھے یا بقول رسول حمزہ توف... اس بہانے وہ اپنے آپ کو زندہ رکھ سکتے تھے۔

بڑی بہن یعنی رما کا تیائن کا نظریہ

کا تیائن بہنوں کی زندگی میں ویرانی کی شاید ایک لمبی تاریخ رہی تھی۔ آس پاس کے لوگوں کے لیے اس گھر یا بہنوں کے بارے میں سب کچھ پُر اسرار تھا، یعنی جب یہ بہنیں گھر میں ہوتیں یا وہ وقت جب بے ہنگم آواز کے ساتھ کھلنے والے دروازوں سے یہ باہر نکلتیں تو گویا سرگوشیوں کا بازار گرم ہو جاتا۔ ان کی زندگی پر اسرار کا دبیز پردہ پڑا تھا... شاید اس مکمل کائنات سے بھی زیادہ پراسرار تھیں وہ۔ بڑی بہن کے ہاتھ میں ایک گل بوٹوں والی چھتری ہوتی جس کا ساتھ ان کے لیے ہر موسم میں لازمی تھا۔ جاڑا ہو، گرمی ہو یا برسات۔ گویا اندر کوئی خوف ہو اور پھول دار چھتری کسی باڈی گارڈ کی طرح ان کی نگرانی کرتی ہو۔ چہرہ اس چٹان کی طرح سخت، سمندر کی لہریں جس کا کچھ نہیں بگاڑ پاتیں۔ آج تک کسی نے بھی رما کا تیائن کو ہنستے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ آپ اپنے گھر کی بالائی منزل سے شام ڈھلنے تک جب بھی جی چاہے انھیں دیکھ لیجیے... ایک کرسی پر سوئٹر بنتی ہوئی رما کا تیائن آپ کو ضرور مل جائیں گی... عمر ساٹھ کے آس پاس۔ چھوٹی ریتا کا تیائن بڑی سے دو تین سال چھوٹی رہی ہوں گی۔ اس سے زیادہ نہیں۔ مگر ریتا، رما کی طرح سخت نہیں تھیں۔ کسی زمانے میں خوش مزاج بھی رہی ہوں گی مگر وقت کے ساتھ ساتھ مزاج میں ایک قسم کی سنجیدگی آ گئی تھی۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ اس سے پہلے کا تیائن بہنوں کی پراسرار دنیا میں کوئی آیا تھا یا نہیں، مگر بھوپیندر پر یہار کی اچانک آمد گھر میں شکوک وشبہات کی فصل لے کر آئی تھی اور یہ شک بھوپیندر پر یہار کے جاتے ہی شتر مرغ کی طرح ریت سے اپنا سر نکالنے لگا تھا۔

بڑی کا تیائن کی آنکھوں میں حیرانی کے دوڑے تھے اور چھوٹی کا تیائن کے ہونٹوں پر ایک شرارت بھری خاموشی۔

''کب سے جانتی ہو اسے؟''

''کسے؟''

''وہی، جسے لے کر تم گھر آئی تھی۔''

''اچھا وہ۔ بھوپیندر پریہار...''

''نام بھی جانتی ہو۔ اس کا مطلب پرانی ملاقات ہے... کب سے جانتی ہو اسے؟''

''آج سے پہلے نہیں۔''

''ایک ہی دن میں اس نے سبزی کا تھیلا بھی تھام لیا اور گھر میں آ ٹپکا؟''

''نہیں۔ آپ نے سمجھا نہیں۔''

''کیا ایک اجنبی شخص کو تم اس گھر میں لے آئیں اتنا کافی نہیں؟''

چھوٹی مس کاتیائن کی آنکھوں میں مایوسی تھی۔ ''نہیں، دراصل آپ ابھی بھی نہیں سمجھیں... تھیلا بھاری تھا...''

''صفائی مت پیش کرو۔ اس سے پہلے ایسا حادثہ اس گھر میں کبھی نہیں ہوا۔''

بڑی مس کاتیائن کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔ ''ابھی تم سبزی کاٹو۔ رات کا کھانا بنانے کی تیاریاں کرتے ہیں، مگر یاد رکھو... رات میں... رات میں اس واقعہ کے بارے میں دوبارہ غور کریں گے۔''

دہشت بھری رہگزار سے

ہم کہہ سکتے ہیں وہ رات کاتیائن بہنوں کی نظر میں بہت عام سی رات نہیں تھی۔ بڑی کاتیائن کمرے میں ٹہل رہی تھیں، جیسے اندر ہی اندر کسی خاص نتیجے پر پہنچنے کی تیاری کر رہی ہوں یا جیسے رات کے وقت شوہر اپنے کمرے میں کچن سے لوٹنے والی اپنی نو بیاہتا دلہن کا انتظار کرتا ہے کہ وہ اب آئے گی یا بتی بجھائے گی یا اس کے قدموں کی آہٹ سنائی دے گی۔

لیکن آپ اس طرح بڑی کاتیائن کو ٹہلتے دیکھ کر یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ بڑھاپے کے گلیاروں میں اتنی دور تک نکل آئی ہیں۔ نہیں، حیرت انگیز طور پر اس وقت وہ کسی نوجوان سے کم نہیں لگ رہی تھیں۔ یقیناً ایک ایسے نوجوان سے جو اپنی بیوی کی کسی بات سے ناراض ہوا اٹھا ہوا اور

اس سے گفتگو شروع کرنے کی ذہنی کشمکش سے گزر رہا ہو۔ چھوٹی کاتیائن کے اندر داخل ہوتے ہی بڑی نے کسی لومڑی کی طرح اپنی نگاہیں اس پر مرکوز کر دیں۔

''آؤ ٹرسٹ ایکسرسائز (Trust Exercise) کرتے ہیں۔''

''ٹرسٹ ایکسرسائز؟ لیکن کیوں؟''

''جرح مت کرو۔ مردوں کی طرح مت بنو... کیوں کہ تم نے اپنا Trust کھویا ہے۔''

''یا تم نے؟''

''ممکن ہے۔ اس لئے آؤ آنکھیں بند کریں اور شروع ہو جائیں۔''

اور اسی کے ساتھ دونوں آمنے سامنے کھڑی ہو گئیں۔ بڑی کاتیائن کی پتلیاں دھیرے دھیرے بند ہونے لگیں۔ چھوٹی کاتیائن کچھ سوچ کر مسکرائیں اور پتھریلی زمین پر وہ بھی بڑی کاتیائن کے آمنے سامنے کھڑی ہو گئیں۔ ٹرسٹ ایکسرسائز میں ایک دوسرے پر آنکھیں موند کر گرنا ہوتا ہے۔ سامنے والے کو اپنے ساتھی کو تھامنا ہوتا ہے۔ ایسا کئی بار کرنا ہوتا ہے۔ سامنے والے نے اگر تھام لیا تو مطلب صاف ہے۔ ابھی یقین میں کمی نہیں آئی یا ابھی یقین بحال ہے۔ یہ عمل پتھریلی زمین پر اس لیے کرتے ہیں تاکہ گرنے یا چوٹ لگنے سے پیدا ہونے والا احساس اس یقین کو پھر سے بحال کر سکے۔ دراصل مغربی ممالک سے ہم لگاتار کچھ نہ کچھ بطور تحفہ لیتے رہے ہیں اور 'ٹرسٹ' کرنے کا یہ نایاب طریقہ ابھی کچھ دنوں پہلے ہی وہاں سے امپورٹ ہو کر آیا ہے۔

تو کاتیائن بہنوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ ممکن ہے آپ کے لیے یہ سارا منظر بے لطف، اکتا دینے والا اور واہیات ہو، مگر شاید کاتیائن بہنوں کو یقین کی دوڑ سے باندھنے کے لیے یہ کھیل کافی معنی رکھتا تھا اور جیسا کہ ہمیں بھی یقین تھا آنکھیں بند کرنے، ایک دوسرے پر گرنے کے عمل میں چھوٹی سر کے بل گری تھی۔ شاید یہ ایک عمر پار کرنے کی حد کے سبب تھا۔ یا جو بھی ہو، مگر طے تھا کہ بڑی اسے تھام نہیں پائی اور چھوٹی کاتیائن کے ہونٹوں سے، لڑکھڑاتے، گرتے ہوئے ایک زور کی چیخ نکل گئی تھی۔

''آہ جیسا کہ مجھے یقین تھا۔'' بڑی کاتیائن کا لہجہ برف سا سرد تھا۔ ''وہ آدمی... تم نے سچ مچ اپنا ٹرسٹ کھو دیا ہے۔ چلو، بہت دنوں کے بعد ہی سہی ذرا ماضی کی راکھ کریدتے ہیں۔'' بڑی کاتیائن نے چھوٹی کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''تمھیں کچھ یاد آ رہا ہے؟''

''ہاں۔''

''تمھیں یاد رکھنا بھی چاہیے۔'' بڑی کی آواز میں لرزش تھی... ''اس آدمی کے باوجود، جو مرد تھا یا باپ تھا... یا جنگلی سانڈ۔ یہی کمرہ تھا نا... اور وہاں دروازے پر...''

چھوٹی کاتیائن کو یاد تھا۔ باپ دروازے پر شراب پی کر شام کے وقت آ کر، ماں کا نام لے کر زور زور سے چلاتا تھا۔

''سب یاد ہے۔''

''باپ کیوں یاد ہے، اس لیے کہ اس میں بے رحمی تھی۔ وہ ایک خوفناک انسان تھا بلکہ حیوان... تمھیں یاد ہے، ماں رویا کرتی تھی۔ کبھی کبھی خوب زوروں سے اور ساری رات چلایا کرتی تھی... اور باپ نشے میں دھت سویا رہتا تھا۔''

''ہاں، مگر وہ سب بھیانک یادیں ہیں اور رونگٹے کھڑی کرنے والی۔ میری ماں ایک سہمی ہوئی گائے تھی۔ نہیں، وہ ایک معصوم میمنا تھی اور بچپن سے باپ تھوڑا تھوڑا کر کے اس میمنے کو ذبح کرتا رہا تھا۔''

''تمھیں یاد ہے؟ اس وقت یا ان دنوں تم گرتی تھی تو... روتی تھی تو... یا کسی پریشان کر دینے والے ڈر سے سہم جاتی تھی تو، یہ میں ہوتی تھی، میں... میں بڑی تھی اور میں انھیں دنوں تمھیں چاہنے بھی لگی تھی... نہیں، تمھیں یاد ہونا چاہیے، جب یکا یک ڈر کر سہم کر تم مجھ سے چپک جایا کرتی تھی تو یا میری گود میں اپنا سر رکھ دیتی تھی تو... یہاں ٹانگوں کے درمیان سے... کسی ایک مرکز سے دریا پھوٹ پڑے تو... کیسا لگتا ہوگا؟ اندر سنسناہٹ کا ایک طوفان سا آ جاتا تھا۔ شاید ایسا اس لیے بھی تھا کہ دنیا میں اور بھی لوگ ہو سکتے ہیں، ہمیں پتہ نہیں تھا... ہم صرف ایک دوسرے کو جانتے تھے یا پھر ماں کو جسے اس زمانے میں معصوم میمنا کہہ کر ہم اداس ہو جایا کرتے تھے یا پھر اپنے باپ کو، جس کی پرچھائیں تک سے ہمیں ڈر لگتا تھا۔ ہم کسی مرد کو صحیح طور سے پہچان نہیں پاتے تھے، جیسے عورت ہونے کے نام پر ہمارے سامنے صرف مظلوم ماں کا تصور رہ گیا تھا۔

''ہاں یہ سچ ہے۔'' چھوٹی کاتیائن کی آواز بوجھل تھی۔

''تو تمھیں یاد ہونا چاہیے۔'' بڑی کاتیائن نے اپنی بات جاری رکھی، ''وہ دن... شاید وہ دن ہماری زندگی کے چند خوبصورت دنوں میں ایک تھا... گلی میں ایک سانڈ پاگل ہو گیا تھا... یاد

ہے، وہ اپنی بڑی بڑی سینگیں اٹھائے، کبھی ادھر کبھی اُدھر دوڑ رہا تھا۔ کچھ دیر تک ہم بھی اس تماشے کا حصہ بنے رہے۔ مگر اب باپ کے آنے کا وقت ہو چلا تھا۔ باہر دکاندار، راہگیر سب تالیاں بجا رہے تھے۔ ہم کمرے میں آ گئے... ہم ایک دوسرے کو برابر دیکھے جا رہے تھے جیسے، اب میمنے کے لرزنے کی آواز آئے گی۔ اچانک آنکھوں کے سامنے باپ کی شبیہ اُبھری۔ اس کا چہرہ سانڈ جیسا تھا... اس کی سینگیں نکلی ہوئی تھیں... اور وہ ان سینگوں سے دیوانہ وار میمنے کو زخمی کر رہا تھا... تم میری طرف دیکھ رہی تھیں اور میں ان لہروں کی ہلچل گن رہی تھی جو تمھارے اس طرح دیکھنے سے میرے بدن میں اٹھنے لگی تھیں... یاد ہے... میں نے کہا تھا... مجھے چھوؤ... مجھے بخار لگ رہا ہے... تم دھیرے سے میری طرف بڑھی تھیں اور تبھی باہر زوردار گرج کے ساتھ دروازے پر کچھ گرنے کی آواز آئی تھی... زبردست شور ہوا تھا۔ تم کانپتی ہوئی میرے بدن میں سما گئی تھی اور میں... جیسے کسی ایک مرکز سے دریا پھوٹ پڑے تو... میں تمھیں لے کر کانپ رہی تھیں... اندر سنسناہٹ ہو رہی تھی... تبھی میمنے کی بے خوف، پرسکون اور ٹھہری ہوئی آواز سنائی دی...''

''دروازہ کھولو سانڈ نے تمہارے باپ کو پٹخ دیا ہے۔ شاید وہ مر گیا ہے۔''

''دروازہ کھول کر میں نے پہلی بار ماں کو دیکھا۔ وہ حسین لگ رہی تھی۔ ماں کے چہرے پر خوف کا شائبہ تک نہیں تھا۔ باہر دروازے پر ایک ہجوم اکٹھا تھا اور وہیں گلی میں کھلنے والے دروازے کے پاس باپ کا بے جان جسم اوندھا پڑا تھا۔ شرٹ خون سے تر تھی۔ اس نے شراب پی رکھی تھی ہمیشہ کی طرح۔ راہگیروں کے شہہ دینے پر وہ سانڈ سے بھڑ گیا۔ لوگ ماں کو صبر کی تلقین کر رہے تھے۔'' کسے معلوم تھا کہ ایسا ہو جائے گا۔''

''یاد ہے۔ ماں خاموشی سے سب کچھ سنتی رہی... پر یکا یک سب کے سامنے زور زور سے ہنس دی تھی۔ لوگوں کی آنکھیں حیرانی سے پھٹی پڑی تھیں۔ ممکن ہے یہ سمجھا گیا ہو کہ شوہر کے صدمے کو نہ سہہ پانے کی وجہ سے... لیکن ماں کی کیفیت تو صرف ہمیں معلوم تھی۔''

''ہاں۔ اس کے بعد ماں جب تک زندہ رہی، وہ بیٹھی بیٹھی ہنس پڑتی تھی۔''

''اور مرتے وقت بھی اس کے ہونٹوں پر یہ ہنسی موجود تھی۔ گویا ماں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا ہو گا، کہ باپ جیسا آدمی ایک دن مر سکتا ہے۔'' بڑی کاتیائن کے لہجے میں سنجیدگی تھی۔'' مگر آخر یہ سب میں تمھیں کیوں یاد دلا رہی ہوں؟ کیوں؟ تو سنو ریتا کاتیائن!'' بڑی کاتیائن کے الفاظ برف ہو رہے تھے۔'' سنو اور غور سے سنو۔ اس لیے کہ عورت اپنے آپ میں مکمل ہوتی ہے۔ ایک

مکمل سماج۔ مرد کبھی مکمل نہیں ہوتا۔ جو مرد ایسا سمجھتے ہیں وہ غلط فہمی کا شکار ہیں۔ مرد کو عورت کی ضرورت پڑ سکتی ہے لیکن عورت کو مرد کی نہیں۔ اس لیے، ابھی سے کچھ روز پہلے جو آدمی تمھاری زندگی میں آیا ہے...''

چھوٹی کاتیائن نے بات بیچ میں ہی کاٹ دی، ''آپ کی غلط فہمی ہے''، اس نے دوسرے ہی پل نظر جھکا لی۔ ''میری زندگی میں کوئی مرد نہیں آیا ہے۔ میں نے کہا نا... وہ محض ایک حادثہ...''

''ٹھیک ہے۔ لیکن تم نے حادثوں کے دروازے کھول دیے ہیں۔ یاد رکھنا۔ وہ آدمی... کیا نام بتایا تم نے... ہاں بھوپیندر پریہار۔ وہ دوبارہ بھی آ سکتا ہے... اور اس کے لیے تمھارا جواب کیا ہوگا۔ کیا بتانا پڑے گا مجھے۔''

''نہیں،'' چھوٹی کاتیائن مسکرائی۔ ''عورت اپنے آپ میں مکمل ہے۔ ایک مکمل سماج۔''

''اور اب میں یہ دکھانا چاہتی ہوں کہ اس مکمل سماج کے پاس کیسی کیسی فینٹاسی موجود ہے... ٹھہرو، ہاں ہو سکے تو وارڈ روب سے اپنی کھلی کھلی نائٹی نکال لو۔ سلیولیس (Sleeveless)۔ تم اس عمر میں بھی آہ۔ اس عمر میں بھی...'' بڑی کاتیائن کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ ''سنا تم نے۔ میں بس ابھی آئی۔''

کاتیائن بہنوں کی فینٹاسی

رات دھیرے دھیرے خاموشی کے ساتھ اپنا سفر طے کر رہی تھی۔ مگر یہاں... اینا کی ڈالی والی دکان کے سامنے والے گھر میں رات ایک نئے 'ایڈونچر' سے آنکھیں چار کر رہی تھی۔ شاید! بہت ممکن ہے ہمارے ہندستانی معاشرے میں سوچا جائے، اس عمر میں تو آگ بہت پہلے کی کسی منزل میں بجھ چکی ہوتی ہے۔ اور کیسی آگ؟ کیسی راکھ؟ مستی کے ساتویں آسمان پر پہنچانے والے نئے نشے براؤن شوگر اور ہیروئن بھی وہ ہیجان نہ پیدا کر پائیں جو اس خستہ اور سیلن زدہ کمرے میں پیدا ہو رہا تھا۔

''اس وقت میں تمام کائنات کی سوامی ہوں... سمجھا تم نے۔'' بڑی کاتیائن کے ہاتھوں سے گرم گرم بھاپ اٹھ رہی تھی، جیسے جاڑے کے دنوں میں صبح صبح منہ کھولنے سے اٹھتی ہے۔ اس

کے ہاتھ میں ایک اسٹیل کی کٹوری تھی۔ کٹوری میں پگھلا ہوا اصلی گھی پڑا تھا۔ چھوٹی کا چہرہ قد آدم آئینے کی جانب تھا۔ اس نے سلیولیس سیاہ نائٹی پہن رکھی تھی... شاید نہیں۔ نائٹی نے اچانک اس کی عمر پہن لی تھی۔ اس چھوٹے سے کپڑے میں وہ ایک دم سے چھوئی موئی لگ رہی تھی۔ بڑھاپے اور جھریوں سے میلوں پیچھے۔ جہاں صرف ہنستا گاتا ڈھول بجاتا حسن ہوتا ہے۔ حسن کا ساز چھیڑنے والے جذبات ہوتے ہیں اور جذبات کے پیچھے چھپی مجروح 'ہوسنا کی' ہوتی ہے۔ ''ہاں اب ٹھیک ہے۔ لیٹ جاؤ اور کپڑے اتار دو۔'' بڑی کاتیائن کی آواز سے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس نے ڈھیر ساری ''ماریجوانا'' پی لی ہو اور وہ پوری طرح نشے میں آ گئی ہو۔

چھوٹی کاتیائن لیٹ گئی۔ اندھیرے میں جلتی ٹیوب لائٹ میں اس کا جسم چمکا۔ بڑی نے اسٹیل کی کٹوری تھام لی۔ اس کا سخت جھریوں بھرا ہاتھ 'گھی' کے اندر گیا جیسے کبھی میدے کی چھوٹی چھوٹی 'لوئیاں' بنتی ہیں اور انھیں ڈھیر سارے گھی میں ڈبویا جاتا ہے۔ گورے چٹے بدن پر بڑی کاتیائن گھی اس طرح ملنے لگیں گویا چھوٹی کا بدن اچانک میدے کی 'لوئیوں' میں تبدیل ہو گیا ہو... جھپ... جھپ...

''آہ، تم اب بھی ویسی ہو۔'' بڑی کے ہاتھ میں حرکت ہوئی۔ ''بالکل ویسی... سنوریتا کاتیائن... دیکھو... خود کو دیکھو غور سے۔ آہ... اپنی عمر کو دیکھو... نہیں، عمر کو مت دیکھو مگر سنو... غور سے سنو۔ مرد اس تندور کو کب کا ٹھنڈا کر چکا ہوتا ہے... ایک لاش گھر کی طرح مگر یہاں تم اپنے آپ کو دیکھو... تم لاش گھر نہیں ہو... برف گھر بھی نہیں ہو... تم تندور ہو۔''

بڑی کاتیائن اپنے غیر مفتوح ہونے کے خیال سے زور سے ہنسی۔

''اسے بتا دینا... کیا نام بتایا تم نے۔ بھوپیندر پریہار... اسے بتا دینا، عورت اپنے آپ میں مکمل ہوتی ہے... اسے مرد کی ضرورت نہیں...''

پھر وہ اس پر جھک گئی۔ رات خاموشی سے اپنا سفر طے کر رہی تھی۔

بھوپیندر پریہار اور عشق کی ڈگر

اتنی عمر گزر جانے کے بعد بھی بھوپیندر پریہار زندگی کے اسی فلسفے پر قائم تھے کہ ایک عمر گزر جانے کے بعد بھی ایک عمر بچی رہ جاتی ہے... اور جو عمر باقی بچ جاتی ہے اسے اسی طرح

گزارنے یا جینے کا حق حاصل ہونا چاہیے۔ مسز پر یہار کے گزر جانے اور سمن کے کینیڈا بھاگ جانے کے بعد اچانک ان پر بڑھاپا طاری ہونے لگا تھا... حالاں کہ انھوں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ جسم بوڑھا بھی ہوسکتا ہے... وہ تو بقول رسول حمزہ توف ''جسم تو بس عشق کے لیے ہے اور عشق کو زندہ رکھنا ہی انسان کا اولین فرض ہے۔'' شاید بڑھاپے کی یہ شروعات انھیں کافی آگے لے گئی ہوتی، وہ تو اچھا ہوا جو اچانک چھوٹی کا تیائن ان سے آٹکرائیں۔ مدتوں بعد اندر کہیں کوئی چنگاری سی لپکی تھی۔ بڑھاپے کی تنہائی میں چہرے اور بالوں کو سنوارتے ہوئے وہ جیسے برسوں پرانے چہرے والے بھوپیندر پر یہار کو واپس لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ کتنی ہی بار قدم 'اینا کی ڈالی' والی دکان کے سامنے والے گھر کی طرف اٹھے۔ ہر بار دروازہ کھلتا تھا اور بند ہوجاتا تھا۔

'کاتیائن بہنوں کی دنیا'... بھوپیندر پر یہار کو لگتا، باہر کی دنیا میں ان کے بارے میں جتنی کہانیاں ہیں، شاید وہ سب کی سب سچ ہیں۔ یہاں تو کسی پریوں کی کہانی سے بھی زیادہ الجھا ہوا معاملہ تھا، لیکن انھوں نے ہار نہ ماننے کا فیصلہ کیا تھا اور شاید اسی لیے اس دن انھیں کامیابی مل گئی تھی۔

دو ایک دستک کے بعد دروازہ کھلا تو سامنے چھوٹی کا تیائن کھڑی تھیں۔

''کیا بات ہے؟ بڑی کا تیائن سو رہی ہیں۔ جو بولنا ہے جلدی بولو۔''

''اندر آجاؤں؟''

چھوٹی کا تیائن نے کچھ سوچنے کے بعد کہا، ''آسکتے ہو۔ ویسے بھی بڑی کو اٹھنے میں دو ایک گھنٹے تو لگیں گے ہی۔''

وہ اندر آگئے۔ چندن کی لکڑی کے بنے محراب نما دروازے سے گزرتے ہوئے... یہ وہی جگہ تھی جہاں آپ ہر موسم میں بڑی کا تیائن کو دیکھ سکتے ہیں... ہاتھ میں تیلیاں تھامے، سر جھکائے سوئٹر بنتی ہوئی... وہ ایک آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ یہ سب کچھ ایسا تھا جیسا کالج کے دنوں میں لڑکے لڑکیوں کے ساتھ ہوتا ہے یا پیار کی پہلی بارش کی پہلی بوند پڑتے ہی یہ سب ان کی اداؤں میں شامل ہوجاتے ہیں۔

چھوٹی کا تیائن کچھ دیر تک اسے گھورتی رہی۔

بھوپیندر پر یہار نے نظریں جھکا لیں۔

ذرا دیر بعد چھوٹی کا تیائن کے لب ہلے؛ ''تمھاری... تمھاری بیوی...؟''

’’نہیں ہے۔ گزر گئی۔‘‘

’’اوہ!‘‘

’’نہیں، اس میں افسوس کرنے جیسی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ اپنی عمر سے زیادہ جی چکی تھی۔‘‘

’’عمر سے زیادہ؟‘‘ چھوٹی کا تیائن نے حیرانی ظاہر کی۔

’’ہاں، مرنے سے دس برس پہلے تک مجھے احساس ہی نہیں تھا کہ وہ ہے... یعنی گھر میں ہے۔‘‘

’’ایسا کیوں تھا؟‘‘ چھوٹی کا تیائن کی ہرنی جیسی آنکھوں میں چمک جا گی۔

’’پتہ نہیں... پر مجھ میں جیسے ایک نئے اور جوان بھوپیندر پریہار کی واپسی ہو رہی تھی۔ تم... یعنی آپ سمجھ سکتی ہیں اس عمر میں... یعنی مجھے دیکھ کر...‘‘ وہ کہتے کہتے لڑکھڑائے تھے۔

چھوٹی کا تیائن کھلکھلا کر ہنس پڑیں؛’’وہی غلط فہمی کی روایت... مرد سمجھتا ہے وہ ساٹھ کے بعد پھر سے بچہ بن گیا ہے اور عورت تو اپنی عمر سے زیادہ بوڑھی ہو گئی ہے... ہے نا، ایسا ہی کچھ...‘‘ وہ پھر زور سے ہنسی۔

’’پتہ نہیں۔‘‘ بھوپیندر پریہار کے کھوکھلے لفظوں میں ہلچل ہوئی۔’’مگر میرا خیال ہے کہ مرد... یعنی...‘‘

’’مرد۔ مرد کے نام پر اتنی رعونت کیوں بھر جاتی ہے مرد میں... بار بار اس لفظ کو دہراتے ہوئے، اپنی کسی کمزوری پر پردہ تو نہیں ڈالتے۔‘‘ چھوٹی کا تیائن نے الفاظ جیسے زہر میں ڈبو رکھے تھے،’’خیر! جو بھی کہنا ہے جلدی کہو۔ بڑی کا تیائن تمھارے اس طرح آنے کو پسند نہیں کرتیں۔‘‘

’’کیوں؟‘‘ بھوپیندر پریہار اچانک ٹھہر سے گئے۔ ان کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

’’تمھاری اپنی زندگی ہے، ان کی اپنی۔‘‘

’’نہیں، ہماری زندگیاں ایک ہیں۔‘‘

بھوپیندر پریہار زور سے لڑکھڑائے؛’’کیا...؟‘‘

’’ہاں، ہم لسبین (Lesbian) ہیں... لسبین۔‘‘ وہ بڑے اطمینان سے ناخن چباتے ہوئے بولی۔

’’لسبین!‘‘ بھوپیندر پریہار اچھل پڑے جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

''ہاں، میں لسبین ہوں لیکن تم تو ایسے ڈر رہے ہو جیسے میں کوئی کوڑھی ہوں، یا مجھے ایڈس ہو گیا ہے۔''

''لیکن تم...'' ان کی آنکھیں اب بھی پھٹی پھٹی تھیں۔

''کیوں آتے ہو میرے پاس، اچھی طرح جانتی ہوں۔'' چھوٹی کا تیائن کے لہجے میں شدید نفرت تھی۔ ''اپنے باپ کو بھی جانتی تھی۔ تمھیں بھی... تمھارے اس پورے مردانہ سماج کو... حیران مت ہو۔ بس وہی غلط فہمی پر مبنی روایتیں... مرد ہونے کی خوش خیالی... یہ احساس ہی اچانک تمھیں ایک بے وقوف راکشس میں تبدیل کر دیتا ہے۔ تم سمجھتے ہو سب تمھاری طاقت کے ماتحت ہیں۔ تو یہ تمھاری ناسمجھی ہے... سنو بھوپیندر پر یہار... تمھاری بیوی نہیں ہے، یہ بات ذہن کی گانٹھ کھول کر نکال کیوں نہیں دیتے کہ تمھاری بیوی، دس برس پہلے ہی کھوئی نہیں تھی بلکہ مر چکی تھی... اور تم نے مارا تھا اسے...''

''میں نے؟'' بھوپیندر پر یہار ایک دم سے چونکے۔

''ہاں تم نے۔ ہاں، اس لیے کہ دس برس پہلے ہی اس کے اندر کے لاوے کو بجھا چکے تھے تم اور اسی لیے وہ تمھارے لیے نہیں تھی... یا مر گئی تھی... اور اس بڑھاپے میں بھی تمھارے اندر ایک گرم، دہکتا ہوا جسم ہے... سنو پر یہار، تم نے اپنی تہذیب اور روایت کے وہ موتی چنے ہیں جہاں صرف 'ایک بیوی بس، یا لوگ کیا کہیں گے' کی بندشیں ہوتی ہیں۔ تم لاکھ ماڈرن بننے کی کوشش کرو مگر تم ہو وہی... ایک بزدل مرد۔ اگر اتنی ہی آگ تمھارے اندر ہے تو تم اپنا جسم کسی مرد سے کیوں نہیں بانٹتے؟ جہاں تمھیں بند کمرے میں داخل ہونے کے لیے تم کو بہت سے سوالوں کا جواب نہیں دینا ہوگا۔''

''لیکن خود کو...'' بھوپیندر پر یہار کا جسم تھرتھرایا۔

''بھول کر رہے تو تم۔ خود کو ابھی دیکھا کہاں ہے۔ اسے تو تم نے Gay یا Homosexuality اور کئی دوسرے غلط ناموں میں باندھ رکھا ہے۔ میں کہتی ہوں میں لسبین ہوں، تب بھی تمھارا سماج اچانک ہم پر بے رحم ہو جاتا ہے۔ لسبین یعنی کسی ناجائز نظریے کی اولاد۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ ہم نے آپس میں سکھ، امن، شان و شوکت اور سرشاری کی انتہا ڈھونڈ لی ہے۔ اب تم چاہو تو جا سکتے ہو۔''

آخری جملہ اس قدر ٹھہر ٹھہر کر بولا گیا تھا کہ بھوپیندر پر یہار کی آنکھوں کے آگے اندھیرا

چھا گیا۔ اندھیرا دھیرے دھیرے چھٹ رہا تھا... چھوٹی کا تیائن کے لفظ چیخ رہے تھے اور اس چھٹتے ہوئے اندھیرے میں وہ کئی پرچھائیوں کو سمٹتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ ماں، بابو جی، بیوی، سمن۔ پرچھائیاں ایک دم سے ہٹ گئی تھیں۔ گے (Gay)، لسبین اور کتنے ہی غیر فطری رشتے۔ اب ایک سہما سا اُجالا تھا اور اس اُجالے میں وہ صاف دیکھ رہے تھے کہ وہ اپنی عمر سے زیادہ جی چکے ہیں۔ زندگی، موت، سکھ ... کہنا چاہیے ایک پل کو چھوٹی کا تیائن کے الفاظ کے تیر سے گھبرا کر وہ کافی دور نکل آئے تھے... اور اب... بھوپیندر پریہار کے ہونٹوں پر ایک تیکھی سی مسکراہٹ تھی۔

''سنو رما کا تیائن۔'' وہ اس کی طرف دیکھے بغیر بولے... ٹٹول ٹٹول کر اپنے لفظوں کو یکجا کرتے ہوئے بولے، ''سنو۔ ہم میں سے کوئی بھی کبھی بھی مر سکتا ہے۔ سمجھ رہی ہو نا! کبھی بھی مر سکتا ہے۔ کیوں کہ ہم اپنی عمر سے زیادہ جی چکے ہیں۔ اس لیے...'' پتہ نہیں وہ اور کیا کیا کہہ رہے تھے لیکن چھوٹی کا تیائن ... انھیں کچھ بھی سنائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ صرف ایک ٹک بھوپیندر پریہار کا چہرہ تکے جا رہی تھیں۔ ہاں، اس عمل کے دوران، ان کے اندر تیز سنسناہٹ ہو رہی تھی جو اس سنسناہٹ سے مختلف تھی جیسی سانڈ والے حادثے کے دن بڑی کا تیائن کی بانہوں میں سمٹ کر اس نے محسوس کی تھی۔ پتہ نہیں یہ کیا تھا، اسے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا... یا وہ سمجھنا نہیں چاہ رہی تھیں۔

آخری مکالمہ چھوٹی کا تیائن کا

وہ اسی نائٹی میں تھیں۔ سلیولیس سیاہ نائٹی میں۔ آئینے کے سامنے، لیکن آئینہ شانت تھا۔ آئینے میں کہیں کوئی آگ، کوئی بھڑکیلا پن، کوئی لگاؤ، کوئی کشش نہیں رہ گئی تھی۔ دھیرے دھیرے ریتا کا تیائن نے نائٹی کے تمام ہک کھول ڈالے۔ ذرا فاصلے پر بڑی کا تیائن کھڑی تھیں، اور انھیں گھورے جا رہی تھیں۔ لیکن ان کے اس طرح دیکھنے میں کوئی بزرگی، کوئی حکم یا کوئی خفگی شامل نہیں تھی۔

اچانک چھوٹی کا تیائن کے منھ سے ایک تیز چیخ نکلی۔ نائٹی کے تمام ہک انھوں نے کھول ڈالے تھے۔ آئینے میں ایک سہما، بے ڈھنگا جسم مردہ پڑا تھا۔ وہ بوکھلاہٹ میں چیختی ہوئی بڑی کا تیائن کی طرف جھپٹیں۔

''آگ کہاں ہے؟ میرے جسم کی آگ کیا ہوئی؟''

بڑی کا تیائن ایسے چپ تھی، جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔

''سنو، میرے اندر... تم نے تو کہا تھا... 'چھوٹی کاتیائن کی نظریں جیسے مدتوں بعد بڑی کاتیائن کی آنکھوں میں سمائی جارہی تھیں'' یاد ہے؟... سنو، تم نے ہی کہا تھا، آہ تم اب بھی ویسی ہو... بالکل ویسی ریتا کاتیائن... سنو، مرد اس تندور کو کب کا ٹھنڈا کر چکا ہوتا ہے۔'' وہ پھر چیخی، ''آگ کہاں ہے، میرے اندر کی آگ کہاں ہے؟''

بڑی کاتیائن کا چہرہ ہر پل تیزی سے بدل رہا تھا۔

''تم... تم سن رہی ہو۔ میں... میں کیا پوچھ رہی ہوں؟''

کافی دیر بعد بڑی کاتیائن کے بدن میں حرکت ہوئی۔ اس نے چھوٹی کی جلتی آنکھوں کی تاب نہ لاکر نظریں جھکالیں۔

''آگ تو میرے پاس بھی نہیں ہے۔''

بڑی کاتیائن کے الفاظ سرد ہو چکے تھے۔ پھر وہ ٹھہری نہیں، تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئیں۔

آئینے میں ابھی بھی چھوٹی کاتیائن کا سہما، بے ڈھنگا جسم پڑا تھا... اور شاید مردہ بھی۔

نظمیں

ہرا پتہ

افتخار نسیم

پتے سارے ہرے ہوتے ہیں
لیکن یہ پتہ ہے
جس کے شاخ پہ آنے تک
درخت ہی پیلا پڑ جاتا ہے
اس پتے کی ہریالی ہے
یا مکڑی کا جال
زر کی زردی آنکھوں کو اندھا کر دیتی ہے
مہندی کا پتہ سوکھے تو
پِس کے خون کا رنگ دیتا ہے
پر یہ سوکھا پتہ
دل کے لہو سے ہرا ہوتا ہے
اس پتے کی کونپل خار سے بھی
نوکیلی ہے
تیر کی مانند روز دلوں کو چھیدتی ہے
اس کی خاطر
مرد طوائف بن جاتے ہیں

اس پتے کے نیش سبز سے
تیسری دنیا کی مدقوق رگوں میں
ایک جھوٹی سی توانائی ہے
دوڑتی ہے جو
اور ہم لوگ اسی کو نوید عمر سمجھ لیتے ہیں
یہ پتہ آزادی ہے
لیکن ہر آزادی کی اک قیمت ہے
کیا تم قیمت دے سکتے ہو؟

کشور ناہید کے لیے نظم

افتخار نسیم

جب سب پتھر پھینک رہے تھے
تم بھی ان میں شامل تھیں
جب سب مجھ کو زخمی کر کے چھوڑ گئے تھے
تم تب بھی خاموش کھڑی تھیں
جانتی ہو کشور ناہید
چپ رہنا بھی سنگ زنی ہے
لیکن جب تم لوٹ کے آئیں
تو میں گھر کے سارے برتن مانجھ رہا تھا
تم ہر بار مرے پاس آ کر
اپنے سارے خواب سناتیں
دفتر کے اور مدرسوں کے سب دروازے
بند تھے مجھ پر
میں اپنے کیا خواب سناتا
میں تو بس اتنا سمجھا تھا
میں گلیوں میں ناچوں
یا پھر گھر گھر جا کر
برتن مانجھوں
مجھ کو تو زندہ رہنا ہے

تم عورت کے استحصال پہ کتنا چیخیں
کتنا روئیں
تم عورت ہو تم تو میرا درد سمجھتیں
ہم دونوں میں کتنی چیزیں مشترکہ ہیں

سفر میں ایک رات کی کہانی

افتخار نسیم

وصل اور ہجر کے سارے قصے
اس نے مجھے سنائے
کتنے انجانے بستر تھے
جو اس نے گرمائے
دنیا کے سارے خطوں کے
لوگوں کی زیبائش
یاد تھی اس کو اب تک ان کے
اعضا کی پیمائش
کتنی صبحیں جاگ کے اس نے
چڑھتے دیکھا سورج کو
کتنی شامیں کس کس
دانشور کے ساتھ رہا
بحثیں کرتے کرتے گزریں
ایسی بھی کچھ راتیں
رومی اور یونانی سارے
فلسفیوں کی باتیں
ایک دیے کی روشنی اس میں
پُراسرار دِشائیں

کانپ رہی تھیں دیواروں پر
خواہش کی پرچھائیں
اندر کمرے میں گرمی تھی
باہر سرد ہوا
برف کی دستک دروازے پر
چور دلوں کا تھا
چیتے جیسے آنکھیں جن میں
خواہش تھی در آئی
پر میں سوچ رہا تھا اس کو
بہن کہوں یا بھائی

اپنے جیسے لوگوں سے انسیت کے بارے میں

راہ نشاط

ابونواس

ترجمہ: خان حسنین عاقب

چند نو جوان، خوبرو، حسین
ایک جگہ مل بیٹھے
ان کے پاس سونے کے خالص سکے تھے
قسمت نے مجھے جن کے حصول کا
ایک موقع عنایت کر دیا
وہ نو جوان بولے، 'اتوار کو تعطیل ہے'
میں دھیمے قدموں چلتا ہوا متعینہ
مقام تک پہنچا
وہاں پہنچنے والا میں پہلا شخص تھا
میں ایک شکن آلود ازار بند سے
کسے ہوئے لمبے سے
واعظوں جیسے لبادے میں ملبوس تھا
جب وہ اپنی مطلوبہ اشیا خرید چکے
تو تسکین تشنگی کے لیے مضطرب ہو گئے
میں ان کے نزدیک پہنچا اور انہیں پیشکش کی
لائیے، میں آپ کا سامان آپ کے ٹھکانے
تک پہنچا دوں

میرے پاس کافی گنجائش ہے
میری رسیاں بھی مضبوط ہیں
اور میں خود بھی کافی پھرتیلا اور
قابل انحصار ہوں
وہ بولے، 'ٹھیک ہے۔ تم اپنے دعوے کے
عین مطابق لگتے بھی ہو
فانت انت'
ہم تمھیں تمھاری محنت کا
نہایت معقول و مناسب انعام دیں گے
لہٰذا میں ان کی معیت میں چلنے لگا
انھوں نے مجھے اپنے ساتھ
اس منزل پر چڑھنے کو کہا
جہاں ہمیں جانا تھا
ان کے کھلے ظروف اس طرح ان کا
انتظار کر رہے تھے
جیسے پہلی رات کو
بیویاں اپنے شوہروں سے کھل جاتی ہیں

ایک پرندا داس اور افسردہ سا نغمہ گا رہا تھا
میں نے سرعت کے ساتھ
بلوریں جام لے کر انھیں
شفاف سفید برف کی طرح چمکایا
میری تیزی اور پھرتی سے
وہ بے ریش نو جوان نہایت متاثر ہوئے
میں نے بغیر کسی توقف کے
انھیں پانی ملا کر شراب پیش کی
جو ایک ہیجان انگیز آگ کی طرح
گرم اور روشن تھی
یہاں تک کہ شراب کے خمار کی وجہ سے
ان کے سر تر چھے ہو کر جھک گئے تھے
ان کی زبانیں بھاری اور گنگ ہو چکی تھیں
اب یا تو وہ جھکے ہوئے تھے
یا پھر سو رہے تھے
میں لرزیدہ لرزیدہ سا اٹھا
تا کہ ان کے ساتھ مجامعت کر سکوں
(جو لوگ چوری چھپے دخول کرتے ہیں،
اس کے تصور سے ہی ان پر لرزہ طاری
ہو جاتا ہے)
پہلے پہل ان کے ازار بند
میرے لذت وکیف وسرور کے لیے
ایک مشکل مسئلہ معلوم ہوئے
لیکن پھر میں نے بڑی چابکدستی
اور چالاکی سے
ان کے ازار بند کھول دیے
جس کی وجہ سے بیدِ مجنوں کی طرح جھومتی
ہوئی
ان نو جوانوں کی لرزیدہ پشت
عریاں ہو گئی
میں نے وہ رات
کبھی اِس نو جوان اور
کبھی اُس نو جوان سے
غرض اس گھر میں موجود
ہر ذی نفس سے
مسلسل کیف وسرور
لطف وانبساط
سرمستی وسرخوشی
کشید کرتے ہوئے گزاری
یہاں تک کہ پہلا نو جوان بیدار ہو کر اٹھا
اسے اپنی رانیں درد کرتی محسوس ہو رہی
تھیں
پھر میں باقیوں کے
جاگ اٹھنے کے اندیشے کے ساتھ
اٹھ بیٹھا
میں نے ان سے پوچھا،
'کیا تم بھی وہی محسوس کر رہے ہو،
جو میں محسوس کر رہا ہوں؟'
'کیا یہ پسینہ ہے جس کے دھبے
ہم سب پر لگے ہوئے ہیں؟'
اپنے جیسے لوگوں سے انسیت کے بارے میں

وہ بولے،
'یہ تو مکھن جیسی کوئی شئے معلوم ہوتی ہے'
جب میں نے دیکھا کہ وہ
چاق و چوبند ہو گئے ہیں
تو میں فراغت پانے کے لیے
وہاں سے ہٹ گیا
اب جب کہ مجلس دوبارہ گرم ہو گئی
میں بھی ان کے ساتھ شریک ہو گیا
جام بڑی تیزی سے گردش میں آ گئے
وہ سب عمدہ، نفیس اور
رنگین قباؤں میں ملبوس تھے
ساری تھپکیاں، سب کچھ تازہ تازہ
اور نیا نیا سا تھا

انھوں نے مجھ سے پوچھا،
'تم کون ہو؟'
میں نے کہا، 'تمھارا غلام!
جس سے تمھیں بدسلوکی اور بدخلقی کا
اندیشہ رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں'
پھر میں نے موقع محل
اور موڈ کی مناسبت سے
محبت بھرا ایک نغمہ گانا شروع کر دیا
'کاش سلمیٰ اپنے وعدے ایفا کرتی...'

کِنّر ہی سہی...

سواتی دامری ماسورکر
ترجمہ: خان حسنین عاقب

میرے جنم سے پہلے کی چہل پہل
وہی خوشی، وہی کیف و مستی
ماں اور باپ بننے کے احساس کے آگے
آسمان بھی بونا لگ رہا تھا
تقریبِ حمل برداری کا جوش
نئے خواب سجائے
آج میری آمد کا دن
تم، میں اور سارے لوگ
نہایت خوش تھے
میری پہلی چیخ کی وجہ سے
سب کے چہروں پر خوشیاں پھوٹ پڑیں
آج گھر میں
ایک ننھی سی جان کی آمد ہوئی تھی
اسی خوشی کے عالم میں
سب کے دل میں ایک ہی سوال تھا
'پیڑا یا برفی؟'
اچانک الفاظ گونگے ہو گئے

پھر...
بس چادر ایک طرف کھینچ دی گئی
کیا غلطی تھی؟
کس کی غلطی تھی؟
خوشیوں پر پانی پھر گیا
جس گھر میں ولادت کا ماحول تھا خوشیوں
بھرا
وہاں اچانک ماتم پسر گیا
'میرا... میرا... کرنے والوں کے
پاؤں پیچھے ہٹنے لگے
اپنوں کی نظروں میں اچانک
غیریت اور بیگانگی جھلکنے لگی
واقعتاً ہوا کیا ہے؟
اس ننھی جان کو کچھ معلوم نہیں
جنم دے کر بھی کبھی ایسے
'ماں باپ پن' کھوسکتا ہے؟
بڑی آسانی سے
چاول میں پڑے کنکر کی طرح
مجھے الگ کر دیا گیا
کسی استعمال شدہ کپڑے کی طرح
مجھے یوں ہی ڈال دیا گیا
کیا ان لوگوں کو
تب بھی احساس نہ ہوا ہوگا؟
یہ ظالمانہ، سفاکانہ سلوک
اپنے پیٹ کی اولاد کو دھتکار کر
ماں نے اپنی ممتا جلا کر خاکستر کر دی
خود کو مکمل کہنے والے
تم اور تمھارا سماج
میں تمھارا ہی حصہ ہوں
پھر تمہیں شرم کیوں محسوس ہو رہی ہے؟
لوگوں کی نہیں، اپنے دل کی سن لیتے

بہر حال، میں تو تمھارے پیار،
تمھاری شہوت کا شاخسانہ تھا
مرد یا عورت کی الجھن میں
میرے انسان ہونے کی حقیقت کو
خارج کر دیا گیا
جنس کا تعین ہونے سے پہلے ہی
میرا بچپن مرجھا گیا
مجھے پیدا کرنے کی زحمت کے عوض
مجھے جہنم میں پھینک دیا گیا
میرے اطراف سارے اپنے تھے
باوجود اس کے مجھے نفرت کی وجہ سے
یتیم بنا کر چھوڑ دیا گیا
مرد، عورت یا انسان
اسی کے گرد گردش کرنے والے
اپنے وجود سے متعلق
یہ سارے سوال مجھے پریشان کر رہے تھے
کچی عمر کو بھلا کیا معلوم؟
پیٹ کی بھوک اور ماں کی ممتا
اپنے جیسے لوگوں سے انسیت کے بارے میں

بھلا بھیک میں بھی کہیں ملتی ہے؟
اتنا سب کچھ بھی کافی نہیں تھا...
اب تو ساری عمر، سارا مستقبل
سامنے آن کھڑا تھا
عمر ہوتے ہوتے
سارا حساب کتاب غلط ہو چکا تھا
مرد کے جسم میں مجھے نسائیت مل رہی تھی
جسم کے ساتھ ساتھ دل بھی
ساڑھی میں ہی سج رہا تھا
مضطرب اور بے چین دل
اس کے لمس کو بے تاب تھا
گھر، خاندان اور سماج میں
میرے وجود کا انکار
چار دیواری کی تاریکی میں
میرے جسم کا استحصال جائز
میری جھولی میں جہنم کا عذاب
میری تالیوں میں خیر مانگنے والا نام نہاد سماج
مذہب کی حدود میں مقید

مجھے اپنی زندگی کا فیصلہ
خود کرنے دو
کہ مجھے کسی مرد کے جسم میں رہنا ہے
یا کسی عورت کے جسم میں
مجھے تمہارے ساتھ
اس دنیا میں
انسان بن کر جینا ہے...

نسیم خان کی چار نظمیں

بے باک

تمھارے ہونٹوں پہ سرخی لگائی
آنکھوں میں سرمہ لگایا
تمھیں بالیاں پہنائیں،
کنگن پہنائے
تمھارے گیسو دراز کئے
سینے پر چھاتیاں اگائیں
کولھے بڑے کئے
ازار بند کھولا
اور تمھیں لڑکی بنا کر نظم کہی

تم آج گراؤنڈ ضرور آنا

میں پرسوں یونیورسٹی چلا جاؤں گا
تمھیں یہیں پہ چھوڑ کر
کرکٹ کھیلتے ہوئے
خود کو بھی یہیں چھوڑ جاؤں گا
اسی میدان میں
تم کو بغیر دیکھے گھر لوٹ جانے کے لیے
اور ہر روز ایسا دہرانے کے لیے
تمھارے دوست کی فیس بک آئی ڈی تو
مجھے مل گئی ہے
مگر اس سے بھی مجھے تمھاری کوئی تصویر نہیں ملی
میں بہت ہی مایوس ہوں
یونیورسٹی جانا بھی کینسل نہیں کر سکتا
اور تمھاری یاد بھی نہیں جا رہی
تمھاری کوئی تصویر کوئی مصور،
کوئی کیمرہ، یا کوئی آنکھ
مجھے چند دنوں کے لیے دے سکتے ہو؟

میر تقی میر کے نام

فطرت میری سگی نہیں ہے
زمیں مجھ سے نفرت کرتی ہے
دن مجھ پر فقرے کستا ہے
دن بھر مجھے ذلیل کرتا ہے
میری نظموں کو مکروہ گردانتا ہے
میرے بارے میں سب کچھ جانتا ہے؟

خلا میرا بھائی ہے
آسمان مجھے پسند کرتا ہے
رات مجھے نہیں گھورتی
اور ستارے مجھے آنکھ مارتے ہیں
آنکھ مارنے والے لڑکے رات بھر
میری بانہوں میں ہوتے ہیں
(خواب مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا)

ہم صرف دھکیل سکتے ہیں

گلابی لڑکے!
تمھاری یاد
مونث ہے
جو ہر وقت میرے ساتھ رہتی ہے
ہمارے دلوں کے پولز یکسر مختلف ہیں

مگر
تمھارا لمس مذکر ہے
جو
مجھے کبھی تمھارے قریب نہیں آنے دیتا
ہمارے ہونٹوں کے پولز ایک جیسے ہیں

جوشوا جینفر اسپنوزا کی پانچ نظمیں

تعارف و ترجمہ: خان حسنین عاقب

جوشوا جنیفر اسپینوزا ۱۹۸۷ میں امریکی شہر رورسائیڈ کیلیفورنیا میں پیدا ہوئی. وہ ایک ٹرانس وومین ہے. اس نے اپنے ٹرانسجینڈ رہونے کی کیفیت، کرب اور سماجی ردعمل کی عکاسی اپنی نظموں میں کی ہے. اس کی نظمیں پوئٹری، کوارٹرلی ڈینور، امریکن پوئٹری ریویو، پوئم اڈے، لامبڈا، PEN امریکہ، دی آفنگ وغیرہ میں تسلسل کے ساتھ شائع ہوتی ہیں۔

۳۲ سال کی عمر میں اس کی نظموں نے امریکہ کے ٹرانس جنڈر ادب میں نمایاں مقام حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کر لی ہے. جوشوا کی مشہور تصنیفات میں 'آئی ایم/ اِٹ ہرٹس/ آئی لو اِٹ' اور 'There should be flowers' شامل ہیں۔

Deja Vu
لمحات میں کبھی

کبھی کبھی، 'دیجاوو' لمحات میں
میں بھول جاتی ہوں
کہ میں کہاں ہوں
بستر میں
میرے ہاتھوں سے خون ٹپکتا ہے
اور بستر کا خون دیواروں سے...
ایسے رنگ بھی دکھائی دیتے ہیں
جو دوسرے رنگوں میں بدل جاتے ہیں
ان رنگوں کا کوئی مفہوم نہیں ہوتا
ایسا ہوتا ہی رہتا ہے
جس پر ہم دھیان نہیں دیتے
ایک تہہ، ایک پرت
یہ تہہ یا پرت کیا ہے؟
ہم ان تہوں، ان پرتوں کو
چھوتے جا رہے ہیں
ٹین کینس
اور ہر سو بکھری ہوئی بے شمار دھجیاں...
مجھ سے بات کرو
کچھ تو کہو
ایسے الفاظ کا استعمال کرو
جن کے معنی سمجھنے کے لیے
مجھے کالج نہ جانا پڑے
کیا تمھیں اس بات کی پرواہ ہے
کہ یہ دنیا ایک بے کار چیز سے
زیادہ کچھ نہیں؟
مجھے ہے...
میں خود بھی ایک بے کار شے ہوں
اور مجھے اس احساس سے محبت ہے!

میرا پہلا پیار

میرا پہلا پیار خاموشی تھا
میں نے خراشوں اور کرچیوں سے
اپنی ذات کی تعمیر کی
لیکن کسی نے مجھے نہ سنا
یہ میری زندگی کا بہترین وقت تھا
میں کپڑے لانڈری روم کو لے جایا
کرتی تھی
اور دعا کرتی تھی
کہ دنیا کی ساری دھند
مجھے اپنی آغوش میں لپیٹ لے
میں اپنے خیالات کو
پاس سے گزرتے ہوائی جہازوں سے
ہم آہنگ کرتی
میرے منہ کی بالائی چھت (تالو)
میں جکڑی ہوئی
نسائیت شہد جیسی تھی
مجھے معلوم تھا کہ یہ کبھی خراب نہیں ہوگی
اس لیے میں نے
اس کے بارے میں
کبھی کسی سے ایک لفظ بھی نہیں کہا

لذت درد کوشی

Autopainophile

میری پسندیدہ ترین چیز
دھیرے دھیرے اپنے گھر میں موجود
میرے پارکنگ لاٹ کی طرف بڑھ رہی ہے
اس وقت
میں جس گانے کو سن کر
ایک احساس، ایک کیفیت سے
گزر رہی تھی،
وہ ختم ہو گیا
یہ تمام فلمیں لمحات
ہاتھوں کو کاٹ کر رکھ دینے والی سرد ہوا
نیم خوابیدگی کی حالت میں
میرے لیے ایسے آتی ہیں
جیسے یہ کسی روشنی کی فرستادہ ہوں
جو مجھے survive ہوتے ہوئے
دیکھنا چاہتی ہوں
فلموں میں مجھ جیسے لوگ
اختتام تک نہیں ٹک پاتے
اور نہ ہی حقیقی زندگی میں ایسا ہوتا ہے
لہٰذا میں تصور میں ہی اپنی فلمیں
بناتی ہوں

جن میں، میں اختتام تک باقی رہتی ہوں
حالانکہ میں خود اپنے تصور (fantasy)
میں بھی خوشی محسوس نہیں کرتی

لیکن میں مضبوط ہوں
میں کیمرہ تھامے ہوئے ہوں
جس کا فوکس میری اپنی ہی ذات کی جانب ہے
لہٰذا میں خود اپنی ہی نظروں کے جال میں
جکڑی ہوئی

یہ بھی ٹھیک ہے
اچھا لگتا ہے
جیسے یہ میرے اپنے ہی خون کا ذائقہ ہو
بہت عمدہ...
کاش
میں اپنے جسم سے ایسے ہی محبت کر سکتی
جیسے کہ تم کہتے ہو
کاش!
یہ سورج
زیرِ افق
ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایسے ہی ٹھہرا رہے

چاند مخنث ہے

چاند مخنث ہے... اب آج کے بعد
چاند مخنث ہوگا
جب تک تم اس حقیقت کا احترام نہ کرنے لگو
چاند کے بارے میں تمھیں کچھ لکھنے کی
کوئی ضرورت نہیں

جب تک تم چاند کے لیے
صحیح اسم ضمیر استعمال نہ کرنے لگو
تمھیں اس سے بات کرنے کی
کوئی ضرورت نہیں

جب تک دنیا کے لوگ چاند کے سامنے
سرنگوں نہ ہو جائیں
اور زمین کے گناہوں کے لیے
چاند سے معذرت خواہ نہ ہوں
تمھیں ان لوگوں کو چاند پر بھیجنے کی
کوئی ضرورت نہیں

چاند تمہارا انتظار کر رہی ہے
تمھیں نرمی کے ساتھ یہ سمجھاتے ہوئے
کہ ساری بیہودگی ختم ہو جانی چاہیے
سائنسدانوں کی تھیوری ہے
کہ چاند پہلے کبھی
زمین ہی کا حصہ 'تھی'
جو زمین سے کسی دوسرے سیارے کے
ٹکرا جانے کے بعد

زمین سے الگ ہوگئی...
حوا کو آدم کی پسلی سے پیدا کیا گیا
وغیرہ وغیرہ
کیا تم اپنے اندرون کی آواز کو
نہ سننے کی طاقت پر یقین رکھتے ہو؟
تمھارے اپنے اندرون کی آواز کو نہ سننے کی
تمھاری طاقت پر مجھے یقین ہے
لیکن یہ سب کچھ عین برعکس ہے
ہمیں اس موضوع پر بات کرنی چاہیے
کہ خون
کس طرح
زمین اور چاند کی درمیانی بیرونی خلا کے
حصوں کے مشابہ ہے
لیکن ہم اس کے بجائے
خون کشید کرنے میں مصروف ہیں
چاند کو اکثر بے جان اور مردہ کے طور پر
بیان کیا جاتا ہے
حالانکہ یہ زندہ ہے
اپنی تمام تر عمر میں
چاند نے کسی ایک مخصوص مدت کے لیے
مردہ یا بے جان رہنے کی خواہش کا
احساس نہیں کیا ہے
لیکن چاند
نہ ہی نازک ہے
اور نہ ہی کمزور

چاند اپنے دائرۂ اختیار میں موجود
واحد طریقہ اپناتے ہوئے
تم سے مسلسل دور ہوتی 'جا رہی ہے'
تم اس کے ساتھ جو سلوک کرو گے
اس کے احتمال اور اندیشے کے باوجود
چاند تم سے
کبھی روگرداں نہیں 'ہوتی'
چاند کی عمر
تمھارے احاطۂ ادراک میں موجود
تمام تر چیزوں سے زیادہ ہوگی
اپنے جیسے لوگوں سے انسیت کے بارے میں

ہمیں جینے دو

میں تجرید سے اوب چکی ہوں
لوگ یہ نہیں بتاتے کہ ان کے کہنے کا
مطلب کیا ہے
جب کہ دوسرے لوگ اس کہنے کی وجہ سے
مر جاتے ہیں
یہ دنیا کہاں سے آئی ہے؟
صفر سے....
غیر جاندار اور مردہ مخنث، ٹرانس وومین
جن پر تم
فیس بک پر کوئی مناسب سی تصویر
شیئر کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے
چند سیکنڈس کے لیے
ایک نظر ڈالتے ہو
یہ سب
کہیں نہ کہیں سے تو آیا ہے
ان کے جسم تمہارے لیے
ایسے پھول نہیں ہیں
کہ جن کے بارے میں
تم ایسے لوگوں سے سرگوشیاں کرو
جنھیں تم کبھی نہیں جانو گے
یہ سب ان الفاظ کا کیا دھرا ہے
ان ہاتھوں کا
بندوقوں
جسموں
بالوں
آدمیوں
عورتوں
قوانین
کا کیا دھرا
میں کب تک اپنے آپ کو
اس فریب میں مبتلا رکھوں
کہ میں جو کچھ کر رہی ہوں
وہ شاعری ہے
کب تک میں تم سے
گڑگڑا کر یہ درخواست نہ کروں کہ
ہمیں جینے دو!

غزل کے کچھ ہم جنسی اشعار

شاہ مبارک آبرو

[۱۶۸۳تا۱۷۳۳ء]

جب کہ ایسا ہو گندمی لڑکا
تب گنہ گار کیوں نہ ہو آدم

جو لونڈا چھوڑ کر رنڈی کو چاہے
تو وہ عاشق نہیں ہے بوالہوس ہے

ملنے کی حکمتیں سب آتی ہیں ہم کو اک اک
گو بوعلی ہو لونڈا کھاتا ہے فن ہمارا

لالے کی طرح چونکتے لونڈے کو جا لگوں
اُڑتے چڑے پھنسانے کی آتی ہے گوں مجھے

دہقان پسر نے کھیت رکھا ہے سبھوں کا مار
کھلیان کی مثال دلوں کا اٹم ہوا

صباحت بیچ گویا ماہ کنعانی ہے وہ لونڈا
ملاحت بیچ سر تاپا نمک دانی ہے وہ لونڈا
کسی سے پیار کی گرمی کیا چاہے تو آتش ہے

ملا چاہے تو کوئی رنگ ہو پانی ہے وہ لونڈا
مذاق شوق کوں دے ہے مٹھاس اس کی مزیداری
تمام عالم خوبان بیچ خوبانی ہے وہ لونڈا
گورائی دیکھ مکھڑے کی دہی کی جل گئی پیکن
نمک داری ستی گویا کہ بورائی ہے وہ لونڈا
بدن مخمل ستی اس کا صفا اور نرم رنگین تر
گویا سر تا قدم بانات سلطانی ہے وہ لونڈا
کری ہے عام ان نے نعمت دیدار کو اپنے
جو بھوکا ہو درس کا تسپہ مہمانی ہے وہ لونڈا
کسی اک ماہ رو کی جوت اپنی دیہہ کے آگے
نہیں لاتا ہے خاطر بیچ دہقانی ہے وہ لونڈا
کرے گا بے وفائی گرچہ عاشق باپ ہے اس کا
کہ انداز و ادا میں یوسف ثانی ہے وہ لونڈا
غلط دھرتے ہیں مل کے سارے اس کا ناؤں رمضانی
کیا ہے ذبح سب کو عید قربانی ہے وہ لونڈا
ہوئی محکم بنا اس ریختے کی اس کی مدح سوں
کہ معشوقی کے کارستان میں بانی ہے وہ لونڈا
لیا ہے آبرو کے تئیں ملا باتیں بنا جھوٹی
لگا لینے کے تئیں عاشق کے طوفانی ہے وہ لونڈا

قائم چاند پوری

[۱۷۲۲ تا ۱۷۹۳ء]

یاں تلک خوش ہوں امارد سے کہ اے رب کریم
کاش دے حور کے بدلے بھی تو غلمان مجھ کو

دخت زر کو تو دی طلاق پر اب
مغبچوں سے نکاح کیجیے گا

میں چشم مست وخط سبز خوباں جب سے دیکھا ہے
تعصب ہے نہ اب میکش سے نے انکار بھنگی سے

جو کترا خطّہ پشت لب کو تیں عالم ہوا راضی
بلے شیریں ہے ہر اک طبع میں حلوائے مقراضی

ہمدم نہ پوچھ مجھ سے کچھ اس مغبچے کا حسن
جلوے کو جس کے دختر زر دیکھ چھک گئی

ہو کیوں نہ آنسوؤں کو میرے لخت دل کا رچاؤ
آرے ہے ریجھ لڑکوں کو اکثر پتنگ سرخ

جہاں دل بند ہو ناصح وہی آوے خلل کرنے
رقیب ناولد ناجی گویا لڑکوں کا بابا ہے

میر تقی میر

[۱۷۲۳ تا ۱۸۱۰ء]

دلّی کے کج کلاہ لڑکوں نے
کام عشاق کا تمام کیا

کیا میر تو روتا ہے پامالیٔ دل ہی کو
ان لونڈوں نے تو دلّی سب سر پہ اٹھائی ہے

کیا لڑکے دلّی کے ہیں عیار اور نٹ کھٹ
دل لیں ہیں یوں کہ ہرگز ہوتی نہیں ہے آہٹ

لڑکے جہاں آباد کے یک شہر کرکے ناز
آجاتے ہیں بغل میں اشارہ جہاں کیا

کیا کیا نہ لوگ کھیلتے جاتے ہیں جان پر
اطفال شہر لائے ہیں آفت جہان پر

شہر کے شوخ سادہ رو لڑکے
ظلم کرتے ہیں کیا جوانوں پر

کیا پہناوا خوش آتا ہے ان لڑکے چسپاں پوشوں کا
مونڈھے چُسے ہیں چولی پھنسی ہے ٹیڑھی ٹیڑھی کلاہیں ہیں

گر ٹھرے مَلَک آ گے انھوں کے تو عجب کیا

پھرتے ہیں پرے دلّی کے لونڈے جو پری سے

کیا چہرے خدا نے دیے ان خوش پسروں کو
دینا تھا تنک رحم بھی بیداد گروں کو

بلائے جاں ہے وہ لڑکا پری زاد
اسی کا شور ہے پیر و جواں میں

لڑکے شوخ بہت ہیں لیکن ویسا میرؔ نہیں کوئی
دھوم قیامت کی سی ہے ہنگامہ اس کے اودھم کا

منھ اس کا دیکھ رہیے کہ رفتار ناز کو
سر تا قدم ہے لطف ہی اس خوش پسر کے بیچ

کیا قہر ہوا دل جو دیا لڑکوں کو میں نے
چرچا یہی ہے شہر کے اب پیر و جواں میں

اک جمع کے سر اوپر روز سیاہ لایا
پگڑی میں بال اپنے نکلا جو وہ گھرس کر

کیوں سر چڑھے ہے ناحق ہم بخت سیاہوں کے
مت بیچ میں پگڑی کے بالوں کو گھرس ظالم

یار کے بالوں کا بندھنا قہر ہے پگڑی کے ساتھ
ایک عالم دوستاں اس بیچ میں مارا گیا

میر کی عیاریاں معلوم لڑکوں کو نہیں
کرتے ہیں کیا کیا ادائیں ان کو سادہ سا سمجھ

میر کیا سادے ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب
اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

کیفیتیں عطار کے لونڈے میں بہت ہیں
اس نسخہ کی کوئی نہ رہی ہم کو دوا یاد

سجدہ کریں ہیں سن کر اوباش سارے اس کو
سید پسر وہ پیارا ہے گا امام بانکا

کیوں نہ اسے سید پسر دل کھینچے یہ ہوئے دراز
اصل زلفوں کی تیری گیسوائے پیغمبر سے ہے

کیا بلا مفتی کا لونڈا سر چڑھا ہے ان دنوں
آوے ہے گویا مجھ پر قاضی کا اعلام لے

وصل اس طبیب زادہ کا جی چاہتا رہا
آخر اس آرزو ہی میں بیمار ہوئے ہم

ایک نسخۂ عجیب ہے لڑکا طبیب کا
کچھ غم نہیں ہے اس کو جو بیمار ہو کوئی

ترک بچے سے عشق کیا تھا ریختے کیا کیا میں نے کہے

رفتہ رفتہ ہندوستان سے شعر میرا ایران گیا

اے گُل مغل بچہ وہ مہہ زا ہے اس کے آگے
کچھ بھی بلا لگے ہے منھ لال لال تیرا

اک اس مغل بچہ کو وعدہ وفا نہ کرنا
کچھ جا کہیں تو کرتا 'آرے بلےٗ' ہمیشہ

اس مغل زا سے نبھی ہر بات کی تکرار خوب
بدزبانی کی بھی اس نے تو کہا بسیار خوب

دل لشکر میں اک سپاہی زادہ نے ہم سے چھین لیا
ہم درویش طلب میں اس کے ڈیرے ڈیرے پھرتے ہیں

کیا اس آتش باز کے لونڈے کا اتنا شوق میر
بہہ چلی ہے دیکھ کر اس کو تمھاری رال پھر

میراس قاضی کے لونڈے کو لیے آخر موا
سب قضیہ اس کے جینے کا تھا بارے چک گیا

ہم تو مطرب پسر کے ماتے ہیں
گو رقیباں کچھ اور گاتے ہیں

کیا جانے قدر غنچۂ دل باغباں پسر
ہوتے گلاب ایسے کسو میرزا کے پاس

تُرش رو بہت ہے وہ زرگر پسر
پڑے ہیں کھٹائی میں مدت سے ہم

معمار کا وہ لڑکا پتھر ہے اس کی خاطر
کیوں خاک میں ملا تو اے میر دل شکستہ

کہا میں شوق میں طفلان تہہ بازار کے کیا کیا
سخن مشتاق ہیں اب شہر کے پیر و جوان میرے

جوانی میں نہ رسوائی ہوئی تا میر غم کھینچا
ہوئے اطفال تہہ بازار گاہک جی کے پیری میں

طفل تہہ بازار کا عاشق ہوں میں
دل فروشی کوئی مجھ سے سیکھ جائے

پھولوں سے اٹھ نگاہیں مکھڑے پہ اس کی ٹھہریں
وہ گل فروش کا جو آیا دکان کے اوپر

جان کے تو میں آپ بنا ہوں ان لڑکوں میں دیوانہ
عقل سے بھی بہرہ ہے مجھ کو اتنا میں نادان نہیں

کیا جانو تم قدر ہماری مہر وفا کی لڑکے ہو
لہو اپنا دیں ہیں تمھارے گرتے دیکھ پسینے کو

سمجھے نہ کہ بازیچۂ اطفال ہوئے

لڑکوں سے ملاقات ہی نادانی ہے

معقول اگر سمجھتے تو میر بھی نہ کرتے
لڑکوں سے عشق بازی ہنگام کہنہ سالی

میں خرد گم عشق میں اس لڑکے کے آخر ہوا
یہ ثمر لایا نہ دیکھا چاہنا نادان کا

دل لے کے لونڈے دلّی کے کب کا پچا گئے
اب ان سے کھائی پی ہوئی شے کیا وصول ہو

کہا بد وضع لوگوں نے جو دیکھا رات کو ملتے
ہوا صحبت میں ان لڑکوں کی ضائع روزگار اپنا

پیسوں پر ریجھتے ہیں یہ لڑکے
عشق سیمیں تناں کو زر ہے شرط

جب کچھ اپنے کنے رکھتے تب بھی صرف تھا لڑکوں کا
اب جو فقیر ہوئے پھرتے ہیں میر انھیں کی بدولت ہے

ہم نہیں لکھتے اس لیے اس کو شوخ بہت ہے وہ لڑکا
خط کو کاغذ بادی کر کے باد کا رخ بتلا دے گا

ناسازیٔ طبیعت کیا ہی جوان ہوئے پر
اوباش وہ ستم گر لڑکا ہی تھا لڑاکا

ساتھ کے پڑھنے والے سب فارغ التحصیل علم سے ہوئے
جہل سے مکتب کے لڑکوں میں ہم دل بہلاتے ہیں ہنوز

یار کی ان بھولی باتوں پر نہ جا اے ہم نشین
ایک فتنہ ہے وہ اس کو آہ مت لڑکا سمجھ

ہندو بچوں سے کیا معیشت ہو
یہ کبھو الگ دان دیتے ہیں

دل لے کے کیسے کیسے جھگڑے مچا دیے ہیں
بد وضع یاں کے لڑکے کیا خوش معاملے ہیں

میر کو دیکھو طفلان رہ بازار میں
دیکھو شاید ہو وہیں دل فروش

مرزا غالب

[۱۷۹۷تا۱۸۶۹ء]

اسداللہ خاں تمام ہوا
اے دریغا وہ رند شاہد باز

سبزۂ خط سے ترا کاکل سرکش نہ دبا
یہ زمرد بھی حریف دم افعی نہ ہوا

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرت حق سے یہی حوریں اگر واں گئیں

شیخ غلام علی ہمدانی مصحفی

[۱۷۴۸ تا ۱۸۲۴ء]

یوں جاتے ہوئے کر گیا پامال جو مجھ کو
ہاں تھا تو وہ لڑکا ہی پہ تصویر پری تھا

تبھی ہم تم پہ گل کھائے ہوئے تھے او میاں لڑکے
سبق تم جن دنوں مکتب میں پڑھتے تھے گلستاں کا

کم عمری میں جو دیکھے ہے حسن اس کا کہے ہے
یہ طفل غضب ہوئے گا دو چار برس میں

خط منڈوانے سے ترے چہرے کا نکلا اور ہی رنگ
دوں بھی بہتر تھا پر اب بہتر سے بہتر ہوگیا

نظر آتا ہے یہ لونڈا مجھے ہرجائی سا
دیکھ اسے ہر کوئی ہوجائے ہے سودائی سا

دل لے گیا تھا ہاتھ سے کل میرے جو لڑکا
ڈرتا ہوں کہ رسوا نہ کرے ہے وہ اک ابلیس

پاؤں بے طرح اس شوخ پسر کا نکلا
شام گھر آنے لگا اب وہ سحر کا نکلا
